پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات (2010ء کے بعد)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

مقبول احمد نسیم

پی ایچ ڈی (اُردو)

رجسٹریشن نمبر: NUML-S-20-35288

نگران مقالہ

ڈاکٹر عابد حسین سیال

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہ اُردو، نمل، اسلام آباد

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

2024ء

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات (2010ء کے بعد)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو   )

مقالہ نگار:

مقبول احمد نسیم

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲4ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مقالہ ہذا پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

عنوان مقالہ : پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات (2010ء کے بعد)

پیش کار: مقبول احمد نسیم

رجسٹریشن نمبر: NUML-S-20-35388

پروگرام: پی ایچ ڈی (اُردو)

شعبہ: اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر عابد حسین سیال: ____________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری): ____________________

ریکٹر

تاریخ: ____________

اقرار نامہ

میں، مقبول احمد نسیم حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا تحقیقی کام میرا ذاتی ہے۔ یہ مقالہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،سلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عابد حسین سیال کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میرا مقالہ کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا گیا ہے اور نہ آئندہ پیش ہو گا۔

مقبول احمد نسیم

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲4ء

فہرست ابواب

عنوان نمبر			صفحہ
مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم			III
			IV
اقرار نامہ			
Abstract			VIII
اظہار تشکر			X
باب اول:		تعارف اور بنیادی مباحث	1
الف	:		1
تمہید			1
			1
i		موضوع کا تعارف	2
			2
ii		بیان مسئلہ	3
iii		مقاصد تحقیق	4
iv		تحقیقی سوالات	4
			5
			5
v		نظری دائرہ کار	5

vi تحقیقی طریقہ کار

vii
مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

viii تحدید

ix پس منظری مطالعہ

x تحقیق کی اہمیت

ب : تحقیق کی
جہات اور عصر حاضر کے تقاضے

i افکار کے لحاظ سے

ii
طریق کار کے لحاظ سے

iii
اقسام کے لحاظ سے

ج : پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کی صورت حال: اجمالی جائزہ
25

حوالہ جات 36

بابِ دوم : پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات کا
تجزیہ: 38
افکار کے تناظر میں

الف : معاصر فکریات 38
i مذہب، مابعد الطبیعات، اخلاقیات و دیگر
ii سیاست، معیشت، معاشرت
iii نفسیات

ب : معاصر تنقیدی نظریات 59
i مابعد جدیدیت، مابعد نو آبادیات
ii تانیثیت، ماحولیات وغیرہ

حوالہ جات 105

بابِ سوم : پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ: 107
ادبی اصناف کے تناظر میں

الف: نثری اصناف 107
(i) افسانوی نثر:
☆ ناول، داستان، ڈراما، ناولٹ، افسانہ
(ii) غیر افسانوی نثر: 146
☆ آپ بیتی سفر نامہ، انشائیہ، شخصیت نگاری،
سوانح نگاری، خاکہ نگاری، رپوتاژ، تنقید

ب :
شعری اصناف 195
(i) غزل
(ii) نظم کی اصناف

☆ حمد نعت منقبت، قصیدہ، شہر آشوب

ج:

لسان ولسانیات 238

(i) لسانیات

☆ صوتیات، معنویات

(ii) قواعد

☆ صرف نحو

حوالہ جات

252

باب چہارم: پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ: 255
تحقیقی طریقہ کار کے تناظر میں

(1) روایتی طریقہ تحقیق

(ii) بین العلومی تحقیق

(iii) تقابلی تحقیق

حوالہ جات

308

باب پنجم : ماحصل 310

☆ نتائج 324

☆ سفارشات

کتابیات 326

Abstract

In terms of higher education in Pakistan, the number of universities has increased significantly. At the time of the establishment of Pakistan there were only two universities, in the present era the number of universities and degree granting institutions has increased significantly. The campuses of many of these universities are spread over vast areas of land and are also well equipped. We can call these material problems the hardware of these universities, which has its own importance, but along with the hardware, the standardization of the software is also important. A university's software is its faculty and its academic programs. Any university across the world is not only known for its campus or facilities but its academic quality is the reason for its reputation.

The primary purpose of universities is to create knowledge. The main difference between a university and a school is that the school emphasizes imparting knowledge, while universities are expected to devote all their energies to the creation and promotion of knowledge. The main source of knowledge creation is research, so there is a need to promote the culture of research in universities so that teachers and students work together in the process of knowledge creation. The main aim of my research Thesis is to review the trends of research, which will make it clear in which direction the tradition of Urdu research is going in Pakistani universities.

The Thesis focuses on the quality of research conducted by various universities. The importance of research was also emphasized along with the role of universities. It not only covers the problems faced by researchers, but also indicates the requirement to improve the quality of research according to international standards. It will help in finding out the facts that have been obtained by the joint efforts of the supervisor and the researchers. Its outcome will be beneficial not only for Urdu literature but also for social reforms.

Maqbool Ahmed Naseem

اظہار تشکر

اللہ رب العالمین نے انسانی فطرت میں تحقیق کا مادہ ازل سے پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ مادہ اگر نہ ہو تو انسانی شخصیت، ذہنیت، صحت اور روحانیت کا ارتقا رک جائے۔ جب ہم کہیں لوگوں کا اجتماع دیکھتے ہیں تو ہمارا تجسس بڑھ جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ اتنے سارے لوگ ایک ساتھ جمع کیوں ہیں؟۔ خیریت تو ہے؟۔ موسموں کی ٹھنڈک، گرمی کی تیزی اور شدت سے بچنے کے لیے محفوظ مکان کی تلاش، جسم کو ڈھانپنے کے لیے کپڑا، کھانا پکانے کے

لیے آگ اور جانوروں کے شکار کے طریقوں کے علاوہ دنیا کے تمام مذاہب اور علوم وفنون کی تخلیق و ترقی اسی جستجو اور تحقیق کے سہارے ہوئی ہے۔ تحقیق ایک فن ہی نہیں بلکہ ذہنی رویے اور طرز زیست کا نام ہے جو حقائق کی نئی دنیا منکشف کرتا ہے۔ اگر تحقیق کا مادہ نہ ہوتا تو آج بھی انسان پتھر کے دور میں زندگی گزارتا۔ تحقیق نے عقل انسانی پر نئے افق وا کیے اور نئی راہیں متعین کیں۔ ورنہ آج بھی سورج زمین کے گرد ہی گھوم رہا ہوتا۔ تحقیق کیا ہے؟ ایک منظم و مربوط تلاش، غیر منکشف حقائق کی، ایک انداز کار، جس کے ذریعے لوگ مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں کہ انسانی جہل و ناواقفیت کی سرحد کو پیچھے دھکیل دیں۔

ادب زندگی کا ترجمان ہے اس لیے ادب کو تحقیق سے االگ نہیں کیا جاسکتا۔ ادب اور خصوصاً اُردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو تحقیق، ادب کا لازمی جزو ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے حافظ محمود شیرانی، شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر رشید حسن خان وغیرہ نے تحقیق میں نام کمایا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی اُردو تحقیق میں گراں قدر خدمات سرانجام دی گئیں۔ پاکستان میں اُردو تحقیق کی روایت میں شخصیات کے ساتھ ساتھ متعدد اداروں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان اداروں میں انجمن ترقی اُردو پاکستان، جامعہ کراچی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور وغیرہ شامل ہیں۔

درج بالا پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہی مقالہ نگار نے " پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات (2010ء کے بعد) " جیسے اہم اور منفرد موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ میرا مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے،۔ پہلے باب کا عنوان "تعارف اور بنیادی مباحث" ہے۔ اس باب میں موضوع کا تعارف پیش کرنے کے بعد تحقیق کی جہات اور عصر حاضر کے تقاضے کے عنوان سے بحث کی جائے گی۔ اس کے علاوہ پہلے باب میں پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کی صورت حال: اجمالی جائزہ پر بھی بحث شامل ہے۔

مقالے کے باب دوم میں پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ " افکار کے تناظر میں "کیا جائے گا۔ ان افکار میں مذہب، مابعد الطبیعات، اخلاقیات، سیاست، معیشت، معاشرت، نفسیات، مابعد جدیدیت، مابعد نوآبادیات، تانیثیت اور ماحولیات وغیرہ شامل ہیں۔ "پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ: ادبی اصناف کے تناظر میں: مقالے کا تیسرا باب ہے۔ اس باب میں اُردو اصناف کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستانی جامعات میں تحقیقی رجحانات کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان ادبی اصناف میں نثر اور نظم دونوں اصناف شامل ہیں۔ باب چہارم میں "پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ: تحقیقی طریقہ کار

کے تناظر میں" کیا جائے گا۔ روایتی طریقہ تحقیق، بین العلومی تحقیق اور تقابلی تحقیق کے تحت مربوط و مبسوط کئے گئے مقالہ جات اس باب کا خاص موضوع ہیں۔ باب پنجم "ما حصل" پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مجموعی جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نتائج اور سفارشات بھی مرتب کی جائیں گی۔

"پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات (2010ء کے بعد)" جیسا منفرد اور بہترین موضوع تلاش کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت میرے شامل حال رہی۔ میری خوش بختی رہی ہے کہ مجھے ڈاکٹر عابد حسین سیال جیسے انتہائی ذہین و شفیق نگران کی معاونت حاصل رہی جنھوں نے قدم قدم پر میری بھرپور رہنمائی فرمائی۔ آپ نے مدبرانہ اور عالمانہ مشوروں سے مقالے کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو میرے لیے سہل بنایا اور اِس وسیع موضوع کو سمیٹنے اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے میں میری رہنمائی فرمائی۔ ان کے علاوہ شعبہ اُردو کے رفیق اساتذہ کرام ڈاکٹر فوزیہ اسلم: صدر شعبہ، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر عمبرین تبسم جان، ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر نازیہ یونس کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے تعلیمی میدان میں قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔

زیر تحقیق مقالے کی تکمیل میں میرے اہل خانہ کی دعاؤں اور محبتوں کا خاص عمل دخل ہے۔ جنھوں نے ہر مشکل وقت میں میری حوصلہ افزائی کی اور مقالے کی تیاری کے دوران کسی بھی مشکل کو میرے تعلیمی معاملات میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ میں اپنے تعلیمی اور تحقیقی کام کو اِن کی بدولت ہی پایہ تکمیل تک پہنچا سکی۔ میں رب العالمین کے حضور دعا گو ہوں کہ اس مقالہ کو میری کامیابی کا وسیلہ بنائے۔ (آمین)

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

اُردو زبان عصر حاضر کی جدید ترین اور زندہ زبان ہے ۔ کسی بھی قوم کی سربلندی میں اس کی قومی زبان ایک اہم کردارادا کرتی ہے۔ ہر ترقی یافتہ قوم کا وسیلہ اظہار اُس کی قومی زبان ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کی زبان اس معاشرے کی ثقافت اور تہذیب و تمدن کی عکاس ہوتی ہے۔ اس لیے قوموں کی برادری میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیں بھی اپنی قومی زبان کو اس قابل بنانا ہوگا کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں اسے اپنا سکیں ۔ اُردو زبان میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ خوبی اظہار، صرفی و نحوی تراکیب اور منطقی اسلوب کے لحاظ سے کسی بھی ترقی یافتہ زبان سے کم تر نہیں ہے۔ اسے جب اور جہاں بھی عملاً آزمایا گیا تو یہ ہر لحاظ سے معیار پر پوری اترتی ہے ۔

موضوع کا تعارف :

زیر نظر موضوع کے حوالے سے بات کی جائے تو پاکستانی جامعات میں اُردو زبان پر تحقیق کا آغاز قیام پاکستان سے پہلے ہو چکا تھا۔ اُس وقت موضوعات کی کمی نہ تھی البتہ محققین ،نگران مقالہ اور پی ۔ ایچ۔ڈی کرانے والی جامعات کی کمی تھی ۔ قیام پاکستان کے بعد جامعہ پنجاب کو پاکستان کی قدیم ترین یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہے ۔ اس جامعہ میں اُردو کی تدریس و تحقیق کا آغاز ۱۹۴۸ء میں ہوا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جامعہ کراچی میں بھی اُردو تدریس و تحقیق کا آغاز ہو گیا ۔ اسلام آباد میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے اپنے قیام کے فورا بعد ہی اُردو میں درس و تدریس کا آغاز کیا اور پی ایچ۔ ڈی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ اسی طرح پاکستان کی دیگر جامعات میں بھی یہ سلسلہ چل پڑا جس سے اُردو زبان میں تحقیق کے رجحانات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ۔

بیان مسئلہ:

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحان میں نمایاں اضافہ ہوا ہے ۔ جامعات کے شعبہ

اُردو کی کارکردگی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر یونیورسٹی اپنی استطاعت اور قابلیت کے مطابق تحقیق کے رجحان کو فروغ دے رہی ہے لیکن مختلف جامعات کے اُردو شعبہ جات میں رابطے کا فقدان نظر آتا ہے۔ کن موضوعات پر تحقیق ہو چکی ہے؟ کون سے عنوانات یا موضوعات زیر تحقیق ہیں؟ اور کون کون سے موضوعات تحقیق کے قابل ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے حوالے سے جوابات مطلوب ہیں ۔جامعات کے باہمی رابطے کے فقدان کی وجہ سے موضوعات اور تحقیق و تدوین میں تکرار نظر آتی ہے۔ بعض اوقات لا علمی اور کبھی مصلحت کے سبب ایک ہی موضوع پر مختلف محققین تحقیق کر رہے ہوتے ہیں ۔ یہ صورتحال اُردو زبان ، وقت، وسائل اور صلاحیتوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہے ۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق :

> "اُردو کے وسائل محدود ہیں ۔ یہ محدو دوسائل تکرار تحقیق میں یعنی تحصیل حاصل میں ضائع ہو رہے ہیں اور ضروری موضوعات کم التفاتی میں رکھے ہیں"۔(1)

اس صورت حال کے پیش نظر تحقیق کے رجحانات کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں تحقیق میں نئی جہتوں کی تلاش کی طرف سفر مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے جو کسی بھی طرح اُردو زبان وادب کے لیے نیک شگون نہیں۔

مقاصد تحقیق :

i۔ پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات کا پس منظر بیان کرنا۔

ii- پاکستانی جامعات میں ۲۰۱۰ء کے بعد اردو تحقیق کے رجحانات کا تحقیقی و مطالعاتی جائزہ

پیش کرنا۔

iii ۔ عصر حاضر میں نئی جہتوں اور تکنیکی طریقہ کار کو سامنے لاتے ہوئے اُردو تحقیق کے

رجحانات

کے حوالےسے جدید تقاضوں کے معیار کا جائزہ لینا۔

تحقیقی سوالات:

i۔ 2010ءکے بعد پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے فکری و منہاجی رجحانات کیا ہیں؟

ii۔ تحقیق کے معاصر منظرنامے کے تناظر میں اُردو تحقیق کن حوالوں سے پیچھے ہے؟

iii۔عصر حاضر میں دیگر علوم میں ہونے والی تحقیق کی روشنی میں افکار اور طریقہ کار کے

حوالے

سے اُردو تحقیق میں کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

نظری دائرہ کار:

علم و ادب کی دنیا میں ہم نے چونکہ تحقیق کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس لیے ہمارے ہاں تحقیق کی حالت تسلی بخش دنیا نہیں ہے۔ تحقیق کے لیے صبر، محنت لگن، توجہ، حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے، اُس سے ہم نظر چراتے ہیں ۔ تن آسانی تحقیق کی دشمن ہے مگرتن آسانی اس قوم کے خون میں سرا ہیت کر چکی ہے۔ اس وقت صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ ہمارے اہل تحقیق بھی داد تحقیق نہیں دیتے اور قیاسات سے کام چلاتے ہیں ۔ محقق بہت سی کتابوں کو بغیر پڑھے اُن پر تبصرہ کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سا ادبی ذخیرہ لاہور، اسلام آبا داور کراچی کے مرکزی کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ غریب اور لاچار محقق کی رسائی اس علمی خزانے تک ناممکن ہے ۔ جس کی وجہ سے معیاری تحقیقات اور تصنیفات سے ہمارا محقق اور ادیب قاصر ہے، جو ہمیں مغربی مصنفین کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ اس کام کی طرف حکومت کی توجہ کی ضرورت ہے ۔ ہمارے ہاں فن تحقیق ، اصول تحقیق کے بارے میں مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس پس منظر میں ہمارے ہاں جو کچھ ہورہا ہے اس کا معیار غیر تسلی بخش ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے اس مقالے میں اسی رجحان کا کھوج لگانا ہے کہ کہیں ہمارے ہاں پی ایچ ڈی کی ڈگری کا رجحان معاشی ضرورت کے مطابق تو نہیں؟ کیار جحان سماجی مقام و معاشی ضروریات کے لیے تو نہیں بڑھ رہا؟ ہمارے ہاں محقق اور نقاد کا تعلق بھی کوئی اچھا نہیں ۔ نقاد محقق کے بارے میں کہتے ہیں وہ کوڑھ مغز ، تخیل سے عاری، ادب، شاعری سے اُس کا رشتہ الفاظ شماری کا رشتہ ہے، وہ اختلاف نسخ کا ذخیرہ تو جمع کر لیتا ہے اُس سے آگے نہ اُس کا ذہن چلتا ہے اور نہ اس ذخیرے کی کوئی اہمیت ہے ۔ بر خلاف اس کے محقق یہ کہتے ہیں نقاد خود غلط اور ایک ایسا حیوان ناطق ہے جو بغیر علم و آگاہی کے ایسے فیصلے صادر کر دیتا ہے جو اس کی جہالت،عدم معلومات اور بے خبری پر مبنی ہوتے ہیں ۔نقادوں نے قیا سات اور مفروضات سے ایسے بے سر و پا اور بے بنیاد

نتائج اخذ کیے ہیں جس کی وجہ سے تحقیق میں بے تحاشہ غلطیاں درآئیں۔ زیر تحقیق مقالے میں ان دونوں زاویوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیقی رجحانات کو دیکھا گیاہے۔

تحقیقی طریقہ کار :

زیر نظر مقالے میں اُردو تحقیق کے رجحانات کو جاننے کے لیے پاکستانی وفاق اور وفاق کے زیرانتظام علاقوں اورتمام صوبوں و آزاد جموں وکشمیر میں کام کرنے والی جامعات کی فہرست بنائی گئی ہے جن میں پی ایچ ڈی سطح پر تحقیق کرائی جاتی ہے، ان جامعات کی تعداد تیس سے اوپر ہے۔ ۲۰۱۰ء کے بعد ان جامعات میں پی ایچ ڈی کے لکھے گئے مقالہ جات کو تین پہلوؤں میں تقسیم کیا گیاہے:

(i) افکار کے لحاظ سے

(ii) طریق کار کے لحاظ سے

(iii) اقسام کے لحاظ سے

ان مقالہ جات کو تقابلی طریقہ ہائے تحقیق سے تحقیق کے رجحانات کو دیکھا گیاہے ۔ جامعات میں لکھے گئے تحقیقی مقالات کو تحقیق کے بین العلومی اور جدید طریقوں سے موازنہ کر کے تحقیقی رجحانات کو دیکھا گیا۔ تحقیق کے ان رجحانات کی صحیح شناخت آئندہ کے ادیب کے لیے سودمند ثابت ہوگی ۔

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق :

مجوزہ موضوع پر کوئی واضح اور ٹھوس تحقیقی کام نہیں ملتا۔ رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "جامعات میں اردو تحقیق جو ۲۰۰۸ء میں اعلیٰ تعلیمی کمیشن (HEC) کے زیر انتظام شائع ہوئی مقالہ نگار کی نظر سے گزری ہے ۔ مذکورہ کتاب میں ۲۰۰۸ء تک دنیا کی مختلف جامعات میں پیش کیے جانے والے ایم ۔ اے ، ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کے مقالہ جات کے حوالے کے طور پر ایک فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پاکستانی جامعات میں ۲۰۱۰ء کے بعد اُردو تحقیق کے رجحانات پر تحقیقی مقالہ پیش کیا جائے اور اُردو تحقیق کے اہم پہلو اجاگر کیے جائیں۔

مذکورہ موضوع پر کچھ مضامین ڈاکٹر جمیل جالبی کے بھی ملتے ہیں۔ انہوں نے تحقیق پاکستانی جامعات میں تحقیقی رجحانات کو غیر تسلی بخش قرار دیا۔ اُن کے تحقیقی مضامین میں اِن رجحانات کے ذمہ دارا ساتذہ اور معاشی مسائل کا شکار محققین کا طبقہ ہے ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق تحقیق کے شعبے میں پیش آنے والی مشکلات اور حکومت وقت کی عدم دلچسپی اور تحقیق کے لیے فنڈز کی عدم دستیابی سے تحقیق کے رجحانات میں محض ڈگری کا حصول نظر آتا ہے۔ اساتذہ کی عدم دلچسپی محقق کے معاشی مسائل معیار تحقیق کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔

تحدید :

قائد اعظم محمد علی جناح نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا :

> "جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے وہ صرف اور صرف اُردو ہی ہو گی"۔(2)

اس فرمان کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستانی جامعات اُردو کی ترویج ،ترقی اور ارتقا کے لیے اپنی خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ زیر نظر مقالے میں پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے ذیل میں کیے گئے کاموں کو سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔

پس منظری مطالعہ:

ہر معاشرہ اپنی قومی زبان کو اہمیت دیتے ہوئے اس کے فروغ میں سہولیات پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے ۔ پاکستان کی قومی زبان چونکہ اُردو ہے اس لیے پاکستانی ادباء و مصنفین نے اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس پر تحقیق و جستجو کی اور اردو زبان و ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ مقالہ نگار نے" پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات :۲۰۱۰ء کے بعد " جیسا اچھوتا اور منفر د موضوع رفیع الدین ہاشمی کی کاوش "جامعات میں اُردو تحقیق" سے متاثر ہوکر لیا جو پاکستانی جامعات میں اردو تحقیق کے رجحانات کے حوالے سے بارش کی پہلی بوند ہے ۔

تحقیق کی اہمیت :

"پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات : ۲۰۱۰ ء کے بعد" ایک مسلمہ اہمیت کا

حامل موضوع ہے، جس کی اہمیت کے پیشِ نظر اُردو تحقیق کے رجحانات اور اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے بارے میں تحقیق و جستجو سے مختلف جہتوں کو سامنے میں لانے میں مدد ملے گی۔ اس سے پاکستانی جامعات کے اُردو شعبہ جات میں اُردو زبان کو مزید فروغ حاصل ہو گا اور طلباء و محققین میں اسے سیکھنے کا شوق اور رجحان پروان چڑھے گا جس سے اُردو کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ ہو گا اور اُردو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں اپنا الگ مقام بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔

تحقیق کی جہات اور عصر حاضر کے تقاضے:

حضرت آدم علیہ اسلام کی پیدائش کے وقت سے انسان میں تحقیق و تجسس کی خاصیت پائی جاتی ہے ۔سچ تو یہ ہے کے اسی خوبی کی وجہ سے حضرت آدمؑ کو جنت سے نکلنا پڑا۔ انسان اپنے ارد گرد دکھائی دینے والی اور محسوس کی جانے والی اشیا کے بارے میں مزید جاننے کا خواہاں رہتا ہے۔ اشیا کے متعلق معلوم کرنا یا جاننا اُسے ہمیشہ بے چین رکھتا ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ حقائق واسباب کو جاننے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر بیج سے ایک پودا کیسے نکلتا ہے؟ سورج کی تمازت سے فصلیں کیسے پکتی ہیں؟ مختلف رنگ کیسے وجود میں آتے ہیں؟ سورج اور چاند اپنی منازل کیسے بدلتے ہیں؟ حق اور باطل کیا ہیں؟ ایسے بہت سارے سوال ہر زمانے میں انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں اور انسان کی تحقیق و تلاش کی طرف اُکساتے ہیں۔ انسان جب محنت اور مستقل مزاجی کا دامن تھام کر چلتا ہے تو قدرت بھی اُس پر کامیابی کے دروازے کھول دیتی ہے۔

تحقیق کی تعریف:

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ح ق ق" ہے۔ اس کا معنی اصلیت معلوم کرنا، حق کو ثابت کرنا، حق کی طرف لوٹانا، دریافت کرنا، جانچ پڑتال، کھوج، چھان بین، سچائی صداقت کے ہیں۔ تحقیق کے لغوی معنی ہیں کسی شے کی "حقیقت "کا اثباب ہے(3)۔ تحقیق کا انگریزی میں مستعمل مترادف لفظ ریسرچ" Research" ہے، جو دو الفاظ کا مجموعہ ہے یعنی "ری" اور "سرچ"Re+search ہے، جس کے معنی دوبارہ تلاش کرنا کے ہیں۔ یہ لفظ " Search" دراصل لاطینی زبان سے فرانسیسی زبان میں اپنی شکل بدلتا ہوا انگریزی میں وارد ہوا ہے۔ لاطینی میں "Search "کی اصلی شکل "Circare" بہ معنی گھومنا پھرنا ہے۔ یہی لاطینی فرنچ میں "Chercher" کی صورت اختیار کر گیا اور انگریزوں نے اسے "Search" میں تبدیل کر لیا۔ فرنچ میں "ریسرچ" کا متبادل "Researcher" ہے۔ جس کے معنی ہیں پیچھے جا کر تلاش کرنا۔

انگریزی میں ریسرچ کے معنی ہیں دوبارہ تلاش کرنا، ڈھونڈ کر تلاش کرنا، علمی تحقیق کرنا، تفتیش، جستجو، انتہائی اور حقائق کی تلاش۔ اصطلاح میں تحقیق سے مراد جمع شدہ معلومات کو کسی کسوٹی یا معیار پر پرکھنا ہوتا ہے۔ تحقیق کے لغوی معنی کسی شے کی حقیقت کا ثبات ہے۔ یہ ایک ایسے طرزِ مطالعہ کا نام ہے جس میں موجود مواد کے صحیح یا غلط کو بعض مسلمات کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ (4)

تحقیق کے دوران پوری ذمہ داری اور جانفشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئی نئی چیزوں کو سامنے لانا ہی تحقیق کا اصل منشور ہے۔ تحقیق کے عمل میں موجود مواد کو تجزیے کے مختلف مراحل سے گزار کر تمام شکوک ختم کرنے کے بعد نکھری ہوئی اور خالص صورت میں سامنے لایا جاتا ہے۔

تحقیق کی مختلف تعریفیں:

تحقیق ایک نتیجے تک پہنچنے سے زیادہ ایک طریقے تک پہنچنے کا نام ہے۔ دائرہ تحقیق میں ایک مقدمہ کو نتیجہ میں بدلنے کے طریقے کی جس قدر اصلاح ہوتی جائے گی اس قدر تحقیق معتبر مانی جائے گی۔ البتہ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی تحقیق کا طریقہ صحیح نہ ہو اور نتیجہ بالکل صحیح ہو۔ لیکن اس ناقابل حل مسئلے کے باوجود بہر حال طریقے میں حذف و اضافہ اور اصلاح و تصحیح کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ تحقیق کے اصطلاحی مفہوم پر روشنی دالتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> "اردو اصطلاح میں تحقیق کے معنی سچ یا حقیقت کی دریافت ہے۔ انگریزی اصطلاح ریسرچ کے معنی ہیں کھوج، اور دوبارہ کھوج۔ تلاش کسی عام یا غیر اہم چیز کی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً زمین پر کوئی چھوٹا سکہ گر جائے تو اُسے ڈھونڈنا یا کسی کا مکان تلاش کرنا"۔ (5)

تحقیقی عمل کے لیے انسان ہر وقت جستجو میں رہتا ہے۔۔ اس اصطلاح کا زندگی کے سبھی شعبوں سے ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں اس کے بغیر کام ممکن نہیں۔ اصطلاحی مفہوم کے مطابق کسی امر کی شکل پوشیدہ یا مبہم ہو تو اُس کی اصلی شکل کو دریافت کرنا تحقیق کہلاتا ہے۔ انگلش ڈکشنری کے مطابق ریسرچ کے معنی ہیں:

ا۔ تلاش کرنا، یا باریک بینی سے مطالعہ کرنا

ب۔ دوبارہ جستجو کرنا اور بار بار تلاش کرنا۔

ج۔ حقائق متعین کرنا اور نئے نتائج تک پہنچنا۔ (6)

تحقیق اوہام اور دروغ گوئی دھند کو ہٹانے اور ان پر شک کرنے کا عمل ہے اور جب تک خود مروجہ "حقائق" پر شک نہ کیا جائے، ان کے اندر سے جو واقعتاً حق ہے وہ کبھی بر آمد نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلطانہ بخش اپنی کتاب "اُردو میں اصول تحقیق" میں لکھتی ہیں:

> "تحقیق کی ہر شعبہ علم میں اہمیت ہے، سائنس اور سماجی سائنس کی دشوار گزار راہیں اس کے بغیر طے نہیں ہو سکتیں"۔(7)

تحقیق ایک ایسا باریک اور محنت طلب کام ہے جس کے لیے ہر قسم کے تعصبات اور انسانی کمزوریوں سے بالاتر ہو کر کام کرنا پڑتا ہے۔ کسی موضوع پر پہلے سے کی گئی تحقیق کو مِن وعن بیان کر دینا یا اس کے متعلق دوسرے لوگوں کی آرا کا ذکر کر کے چند کتابوں کے حوالے دے دینا کسی صورت تحقیق نہیں کہلائی جا سکتی۔ ڈاکٹر عبد الحمید خان عباسی "اصول تحقیق" میں لکھتے ہیں۔

> "تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم و ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے"۔(8)

تحقیق اصل میں کسی بھی چیز کا وہ نیا پہلو ہے جو اب تک دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہا ہو، یا اُس پر پہلے کام نہ ہوا ہو۔ محض سنی سنائی باتوں کو آگے بیان کر دینا تحقیق کے زمرے میں نہیں آتا اور نہ ہی ایسے شخص کو ہم محقق کہہ سکتے ہیں۔ نیز تحقیق کے سلسلے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر کام کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس پر پہلے کام ہو چکا ہے، اس بات سے اس لئے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ضروری نہیں کہ جو کام ہوا ہے وہ اس موضوع کے ہر پہلو کا مکمل احاطہ کئے ہوئے ہو۔ انسانی سوچ اور اندازِ فکر میں پایا جانے والا اختلاف اس بات کو متقاضی ہے کہ کس بھی موضوع پر کام کر کے مزید تحقیق کے دروازے بند نہ کیے جائیں۔ عبد الستار ردلوی کے نزدیک:

> "تحقیق تاریخی آثار کی دریافت، سماجی زندگی کے عہد بہ عہد ارتقا کے مطالعے کا نام ہے"۔(9)

تحقیق انسانی زندگی میں اور انسانی ذہن کے ارتقا کے مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ تحقیق کا دائرہ کار وسیع ہے، اس کا مقصد انسان کی ذہنی زندگی، بود و باش، فکر و نظر، رہن سہن کے مختلف ادوار سے گزرنے کیے مستند ذرائع سے منظم طریقے سے تاریخ بیان کرنا ہے۔ انسانی زندگی کی مختلف پرتیں ہوتی ہیں۔ تاریخ کے عہد بہ عہد ارتقا میں انسان نے کیا کھویا اور کیا پایا، یہی تحقیق کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ زبان وادب بھی

تاریخی ارتقا کا ایک اہم پہلو ہے۔ انسان نے بولنا کب سیکھا، اس کی تہہ تک پہنچنے کی بھی کوششیں ہوئیں۔ وسیع تر سیاق میں زبانوں کے مختلف خاندانوں کا اور ان خاندانوں سے وابستہ زبانوں کے مطالعے بہت کامیاب طریقے سے پیش کیے گئے، زبانوں کی آوازوں اور ان آوازوں کے لیے علامتوں کا استعمال بھی لسانی تحقیق کا ایک اہم حصہ رہا ہے، لیکن یہ ساری تحقیقات بھی ابھی نا تمام ہیں اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ حتمی طور پر کسی طرح کا دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق کا یہ عمل نہ ختم ہونے والا عمل ہے۔ تحقیق کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر نجم الحسن لکھتے ہیں:

" تحقیق ہمیں کسی بھی شے کی حقیقت جاننے کی طرف مائل کرتی ہے یہی وہ حقیقت ہے جو سوال اٹھانے اور مدبرانہ سوچ کے ساتھ دلائل کے ذریعے سے ان کا جواب بھی تلاش کرنے پر اکساتی ہے"۔(10)

تحقیق سچائی کی تلاش کا نام ہے، یہ وہ سچائی ہے جس کی تلاش کرنے کے لیے محقق لگاتار کوشش کرتا ہے اور یہ سچائی محقق کی دسترس میں ہوتی ہے۔ تحقیق، سچائی اور صداقت کی تلاش ایک محتاط سر گرم جستجو ہے اور مسلسل کاوش کا نام ہے۔ تحقیق کا انداز وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نیا اور اچھوتا ہوتا ہے۔ اس میں جہاں ماضی کی روایت ہے وہیں حال اور آنے والے دور کا منظر نامہ بھی گردش کرتا ہوا نظر آتا ہے اس لیے تحقیق کی اہمیت مسلمہ ہے۔ تحقیق کو محض علمی و ادبی موضوعات تک محدود کرنے کی بجائے وسیع پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت ہے۔

دور جدید میں تحقیق:

سائنسی پیمانوں، ذہنی و عقلی زاویوں اور سماجی ذرائع کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دور جدید میں تحقیق کا نقطہ آغاز سترھویں صدی سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کو ہم سادہ الفاظ میں سائنسی و سماجی تحقیق کا نقطہ آغاز بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے تحقیق کے پیمانے اور زاویے بنائے گئے جن کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

(الف)۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں تحقیق کو فروغ دینے کے لیے بے شمار سائنسی تحقیقاتی ادارے اور پلیٹ فارم بنائے گئے۔ ان اداروں کا مقصد جدیدیت کو فروغ دینا تھا تا کہ انسان زمانہ قدیم کی روایت کی بجائے دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔

(ب)۔ سائنسی ترقی کے نتیجے میں انسانوں کی معاشرتی، سماجی اور اقتصادی اقدار بہت زیادہ متاثر ہوئیں۔ جس کے نتیجے میں سماجیات کے اہم مضامین مثلاً سیاسیات ، عمرانیات ، نفسیات ، تاریخ ، فلسفہ ، ہیت وغیرہ سامنے آئے۔

(ج)۔ جملہ سماجی علوم کے علاوہ لسانیات میں بھی تحقیق کا آغاز لگ بھگ اسی دور میں ہوا۔ سب سے زیادہ توجہ سماجی تحقیقاتی موضوعات پر دی گئی۔ انگریزی، اطالوی، فرانسیسی، عربی اور ہسپانوی زبانوں میں فنون لطیفہ کے نئے موضوعات اور اصناف کا ضافہ ہوا۔ اُردو زبان میں لسانی تحقیق کا آغاز فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہوا۔ اس سے پہلے باقاعدہ سائنسی خطوط پر تحقیق اردو زبان میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ فورٹ ولیم کالج ہی تھا جس کے ذریعے اردو لسانی تحقیق کو فروغ ملا۔

تحقیق کا مقصد:

تحقیقی کام کا مقصد سائنسی خطوط پر پہلے سے دیے ہوئے حالات وواقعات کو کریدتے ہوئے اس میں سے حقیقی پہلو تلاش کرنا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سوچ کو ثبات سے نفرت ہے انسانی جذبوں کو یکسانیت سے بےزاری ہوتی ہے انسانی فکر و تدبیر کو سکوت سے، یک رنگی سے دشمنی ہے انسانی فہم و فراست ہر گھڑی ، ہر آن بہتر سے بہتر اور پھر بہترین کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہتی ہے اعلیٰ سے اعلیٰ تر اور اعلیٰ ترین کے حصول کے لئے انسانی محنت سرگرم عمل رہتی ہے۔ غور کریں تو ویسے بھی انسانی حیات کے تمام تر مدارج اسی تحقیق کی بدولت ہی ارتقا اور پھر بام عروج پر نظر آتے ہیں۔ انسان اور زمانے کی تمام تر ترقی، سربلندی و سرفرازی صرف اور صرف تحقیق، جستجو اور بہتر سے بہترین کی تلاش کے باعث ہے۔ اگر انسان کے اندر بہترین کی تلاش کا جذبہ اور اعلیٰ تر کی جستجو کے لئے کاوش کرنا شامل نہ ہوتا تو وہ شاید ابھی تک اسی پتھر اور غار کے عہد میں جی رہا ہوتا۔ ابھی تک ویسے ہی درختوں پر رہائشیں رکھے ہوئے ہوتا۔ پتوں سے اپنا جسم چھپانے کی کوشش میں ہوتا یا پھر فطری لباس میں ہی ملبوس ہوتا اور ویسے ہی پتھر لے کر خوراک کی تلاش میں جنگلی جانوروں کے پیچھے بھاگ رہا ہوتا، اگر قدرت انسانی فطرت میں بہتر سے بہترین کی جانب بڑھنے کا مادہ نہ رکھتی تو ابھی تک انسان وہیں ہوتا جہاں پہلے تھا۔ تحقیق کی اہمیت کو ڈاکٹر گیان چند نے یوں بیان کیا ہے:

"جو حقائق ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں دراصل اُن کو تلاش کرنے کا
نام تحقیق ہے در حقیقت یہ حقائق عجائب زمانہ میں دھندلے ہو جاتے ہیں اور
تحقیق کے ذریعے سے ہی اُن کو صاف کیا جاتا ہے"۔(11)

تحقیق محض تلاش اور تفتیش یا تدوین اور تالیف کا نام نہیں۔ تحقیق کے لیے کوئی مواد تلاش کر کے لکھ دینا ہی کافی نہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ تحقیق کو جدید اصطلاحی مفہوم کی روشنی میں دیکھا جائے، تاکہ ادبی تحقیق بھی دنیائے تحقیق میں اپنا مقام پیدا کر سکے۔ تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ زبان وادب کے میدان میں ہونے والی عملی فتوحات میں ایسا اضافہ کیا جائے جو عالمی سطح پر قابل قبول ہو تحقیق کے نتائج کو اگر دہرایا جائے تو اس سے حقائق بر آمد ہوں اور بعد میں ان حقائق کو کسی نظریے یا فلسفے کی شکل دی جائے۔ گیان چند اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جہاں تک اردو کی ادبی تحقیق کا تعلق ہے اس کا بھی یہی مقصد ہے کہ جن
مصنفین، جن ادوار، جن علاقوں، جن کتابوں اور متفرق تخلیقات کے بارے میں
کم معلوم ہے ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ ان کے بارے
میں اب تک جو کچھ معلوم ہے اس کی جانچ پڑتال کر کے اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح
کر دی جائے تاکہ غلط مواد کی بنا پر غلط فیصلے صادر نہ کر دیے جائیں"۔(12)

تحقیق تکنیکی حوالے سے "باز پرس" یا معلومات کی کھلے دل و دماغ کے ساتھ یعنی غیر جانبداری سے حقائق معلوم کرنے کے باقاعدہ طریق کار اور تفتیش کا نام ہے۔ تحقیق ایک عالمانہ تفتیش ہے جو ایک تخلیق کار معاشرے کے لئے انجام دیتا ہے۔ تحقیق کا سائنسی، منظم، مشاہداتی، قابل توثیق اور قابل قبول ہونا ضروری ہے۔ تحقیق تکنیک بھی ہے، فن بھی، پیشہ بھی اور لگن بھی۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے تحقیق کے تین مقاصد بیان کئے ہیں:

1۔ تحقیق کا پہلا مقصد ایک مخصوص نظریہ کی نشو نما اور اس کو ایک ارتقائی شکل فراہم کرنا ہے۔ اس نظریے کا مقصد نئے خیالات کو وضع کرنا ہے جو مقاصد زندگی کو سمجھنے مین معاون ثابت ہوں۔

2۔ تحقیق کا دوسرا بنیادی مقصد کسی بھی موضوع، مضمون یا خیال کے حوالے سے نظر آنے والے حقائق کو ایک جگہ اکٹھا کر کے اُن کا سائنسی پیمانوں پر تجزیہ کرنا چاہیے۔

3۔ تحقیق کا تیسرا مقصد اُن فوری اور عملی مسائل سے تعلق وضع کرنا ہے جو محقق کو سمجھنے یا حل کرنے میں مدد فراہم کر سکتے ہیں"۔(3 1)

تحقیق کی اہمیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ زندگی میں جس قدر وسعت آتی گئی اس کے شعبہ ہائے تحقیق میں اضافہ ہوتا گیا ہے اور اب تو یہ صورت ہے کہ ان کا شمار کرنا ممکن نہیں، مثال کے طور پر طب، سائنس، انجینئرنگ، فلکیات، حیوانات، معاشرت، تعلقات، لسانیات، زراعت، سیاحت، تعلیم ادب وغیرہ وغیرہ۔ درج بالا مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تحقیق کا بنیادی مقصد ان حقائق کی تلاش ہے جن کی بنیاد پر لسانیات و ادب میں ٹھوس نظریات یا فلسفہ کی بنیاد رکھی جا سکے کیونکہ کسی بھی مہذب معاشرہ میں نظریات اور فلسفہ بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

اسلام میں تحقیق:

مذہب اسلام میں تحقیق کی بہت اہمیت ہے۔ اسلام تفکر، تدبر اور سوچ کا درس دیتا ہے۔ اس کے لئے "تفقہہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر تحقیق کا مذہب ہے۔ یعنی اسلام انسان کے مذہب اختیار کرنے کیلئے تحقیق پر مبنی استدلال پر زور دیتا ہے۔ اسلام تو اس بات میں بھی تحقیق کی دعوت دیتا ہے کہ دین قبول کرنے میں کوئی جبر نہیں۔ پہلے اس کی تحقیق کرو کہ یہ صراط مستقیم کی طرف ہے یا نہیں۔ قرآن مجید کی سورہ الحجرات میں ارشاد ہے۔

> "اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کہیں کسی قوم کو تم نادانی میں کوئی نقصان نہ پہنچا دو کہ پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے"۔(14)

اس آیت میں واضح طور پر کسی امر کو جاننے کے لیے خوب تحقیق کر لینے کا حکم ہے۔ صرف معلومات اکٹھی کر لینے کا نام تحقیق نہیں بلکہ مکمل پرکھ، جانچ پڑتال اور شواہد کو اکٹھا کر کے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد تحقیق کا مقام آتا ہے۔ گویا تحقیق کے ذریعے تلاش حقیقت کو ضروری قرار دیا گیا تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے اور نقصانات سے ان کے وقوع ہونے سے قبل ہی بچا جا سکے۔ اگر تحقیق کا اہتمام نہ کیا جائے اور صرف لوگوں کی زبانی باتوں پر یقین کر لیا جائے تو تحقیق کا سارے کا سارا کام ٹھپ ہو جاتا ہے۔ اسلام جو دینِ فطرت ہے اس میں من گھڑت قصے اور باتیں شامل ہونے سے لوگ دور ہوتے جائیں گے اور جو لوگ تحقیق نہیں کریں گے ان کے دین سے دور ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہے گا، اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

> "آدمی کے جھوٹا ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ جو کچھ سنے، روایت کر دے"۔(15)

قرآن مجید اور حدیث رسول دونوں نے تحقیق کرنے کی ہدایت فرمائی ہے جس کی وجہ سے مسلمان ہر دور میں حفاظت و تدوینِ حدیث کے سلسلہ میں حد درجہ محتاط رہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے آپ کو ایک متحد قوم کی صورت ڈھالنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی واعظین حضرات سے اس کی سند کے بارے تحقیق کرنے کی جسارت کرنا ہوگی۔ اس جسارت سے ہماری خرافات سے جان چھوٹ جائے گی اور دن اسلام کی اصل شکل ہمارے سامنے آجائے گی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے طرزِ عمل سے تحقیقی عمل کا آغاز کیا۔ مولانا محمد فہیم عثمانی کے مطابق:

> "آپ نے تحقیق حدیث کے لیے اصول شہادت کی بنیاد قائم فرمائی۔ آپ نے اپنے طرز عمل سے اس بات کو ایک اصول کے طور پر پیش کیا کہ ہر وہ بات جو رسول ﷺ کی طرف منسوب کر دی جائے محض منسوب ہو جانے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہو جاتی بلکہ چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے بعد یقین حاصل کرنا ضروری ہے کہ رسول ﷺ کی طرف اس بات کو منسوب کرنے میں کسی غلط بیانی یا سہو کا دخل نہیں ہے"۔(16)

قرآن مجید اور احادیث رسول دونوں نے تحقیق کرنے کی ہدایت فرمائی جس کے پیشِ نظر مسلمان ہر دور میں حفاظت و تدوین حدیث کے عمل میں نہ صرف محتاط رہے بلکہ جو کچھ سنا پہلے مکمل طور پر اس کی تحقیق کی۔ جب تک مسلمانوں کا تحقیق کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رہا تو وہ اقوامِ عالم کی قیادت کرتے رہے اور پوری دنیا ان سے علوم سیکھنے کیلئے ان کی جامعات میں آتی رہی۔ افسوس کی بات ہے کہ اس میدان میں مسلمانوں کا وہ حصہ نہیں رہا جو ایک ایسی قوم کا ہونا چاہیے تھا جس نے ورثہ میں علمی تحقیق کا ایک بیش بہا خزانہ پایا تھا۔ مغرب نے یہ میدان مار لیا اور اب ہمارے اساتذہ اور طلباء اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کیلئے مغرب اور امریکہ کا رخ کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ وہ ہستیاں ہیں جن کے سر تحقیق کے اصول کا سہرا ہے۔ انہیں حضور ﷺ کی ذات پاک سے انتہائی عقیدت و محبت اور والہانہ وابستگی کے ساتھ ساتھ آپ کی بے حجاب حیات طیبہ کے معمولات سے بخوبی واقفیت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان ہستیوں نے آپ کی احادیث مبارکہ کو قبول کرنے اور روایت کرنے کے عمل میں انتہائی محتاط رویوں کا مظاہرہ کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو قبول روایت کے سلسلے میں محتاط رویہ اختیار کرنے میں اولیت حاصل ہے۔ مولانا فہیم عثمانی لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں ایک خاتون نے آکر اپنے پوتے کے چھوڑے ہوئے ترکے میں سے اپنے حصے کی میراث کا مطالبہ کیا۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ قرآن تو اس سلسلے میں خاموش تھا ہی۔ نبی کریم ﷺ کا کوئی ارشاد بھی حضرت ابو بکر کو اس بارے میں معلوم نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا۔ حضرت مغیرہ کھڑے ہوئے اور فرمایا! میں نے سنا ہے رسول ﷺ دادی کو چھٹا حصہ دلواتے تھے۔ حضرت ابو بکر نے یہ سن کر فرمایا! کیا تمہارے علاوہ بھی کوئی اس پر شاہد ہے۔ اس پر محمد بن مسلم نے شہادت دی۔ اُن کی شہادت پر حضرت ابو بکر نے اس خاتون کو چھٹا حصہ دلوادیا"۔(17)

اللہ رب العالمین نے انسان کو حالات و واقعات کی چھان بین کرنے کی بنیادی صلاحیت عطا کی ہے۔ انسانی زندگی کے ارتقاء کے ساتھ ہی انسان نے اپنے گردو پیش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور جیسے جیسے انسان نے اپنے تخلیقی عمل کو تیز کیا اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انسان کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا چلا گیا۔ اس نے تحقیق کی بنیاد پر سائنس میں اتنی ترقی کی ہے کہ کرہ ارض پر انقلاب برپا کر دیا۔ اتنی ترقی ہوئی کہ انسان کے خوابوں کی تعمیر مل گئی اور ایجادات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے انسانی زندگی کو آسان بنا دیا۔ تحقیق کی بدولت انسان نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ آج زندگی میں جس قدر وسعت ہے وہ تحقیق کی بدولت ہی ہے۔

اُردو ادب میں تحقیق:

شعرائے اردو کے تذکرے اردو کی تحقیقی روایت میں بنیاد گزار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تذکروں کا آغاز اٹھارہویں صد میں ہوتا ہے جب میر تقی میر نے "نکات الشعرا" کے نام سے شعرا کا تعارف پیش کیا۔

ابتدائی نقوش تذکروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ "گردیزی" کا "تذکرہ ریختہ گویاں"، قائم چاند پوری کا "مخزن نکات"، بھی نمایاں ہیں۔ گارساں دتاسی کا "تذکرہ تاریخ ادب" بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس تذکرے میں "گارساں دتاسی" نے اردو کی ابتداء، اس کی ساخت اور اس کے رسم الخط کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ فرمان فتح پوری کے مطابق :

"گارسین نے متعدد تذکروں اور تاریخ ادب اردو کے کئی دوسرے مآخذ کا سراغ لگالیا تھا۔ بقول مولوی عبد الحق گارسین نے اپنے اس خطبے میں کچھ اضافہ

کر کے اسے "ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف " کے نام سے الگ کتابی صورت میں شائع کیا تھا"۔(18)

سراج الدین علی خان آرزو کی "نوادر الالفاظ " کو اُردو کی ابتدائی لغت کہا جاسکتا ہے جو کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سامنے آئی۔ خان آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی "غرائب اللغات "کی درستی کی۔ سودااور غالب کے یہاں بھی تحقیق اپنی ابتدائی اور مبہم صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ غالب کے خطوط، تقریضوں اور دیباچوں میں زبان و فن کے جو نکات بیان کئے گئے ہیں اور محاورات کے ضمن میں جو اختلافی بحث طلب مسائل اٹھائے گئے ہیں وہ اُردو تحقیق نگاری میں ابتدائی شواہد فراہم کرتے ہیں۔اُردو میں ادبی تحقیق کا آغاز دور سرسید سے ہوتا ہے۔ حالی، شبلی، آرزو، اور سرسید کے ہاں تصیح متن اور مقالات میں تحقیقی شعور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ سرسید احمد خان مغربی آداب تحقیق سے واقف ہو چکے تھے جس کا بین ثبوت "آئین اکبری "ہے۔ آئین اکبری کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں بہت فرق ہے۔ دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر شکل میں تحقیق کے طریقہ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرائع معلومات، ماخذ اور اشاریہ کے التزام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ محسن الملک اور حالی وغیرہ نے سرسید کی نئ محققانہ "اپروچ" کو تسلیم کیا اور اسے تقویت بھی پہنچائی۔ چراغ علی کے "العلوم الحمدیہ والاسلام " مقالہ کا شمار اُردو تحقیق کے ذیل میں کیا جانا چاہیے۔ آزاد نے اردو تحقیق کے دامن کو وسعت دی اور " دربار اکبری، سخن دان فارس اورآب حیات " لکھ کر اپنے ذوقِ تحقیق کی سیرابی کا اہتمام کیا۔ فارسی اور بعض دوسری زبانوں میں لسانیاتی سطح پر جو مشترک عناصر تھے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آب حیات میں پچاس سے زائد کتابوں کے حوالے شامل کیے گئے ہیں۔ حالی نے کئ سوانح حیات لکھی ہیں، وہ سوانح کی ترتیبِ واقعات و حقائق کی تلاش و جستجو اور صحت بیان پر توجہ دیتے ہیں اور باضابطہ مآخذ کی نشاندہی کرتے ہیں ۔ شبلی کے یہاں استقرائی تحقیق کی بعض صورتیں نمایاں ہوتی نظر آتی ہیں۔ شبلی نے فارسی، عربی اور تاریخ کے مآخذ سے معلومات فراہم کیں۔ المامون، الفاروق، علم الکلام اور فارسی ادبیات کی کتاب شعر العجم میں انھوں نے مختلف عربی و فارسی شعرا وادبا، تذکرہ نگاروں اور انگریزی مورخین سے استفادہ کیا ہے۔اُردو میں تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر سلطانہ بخش لکھتی ہیں :

"اردو ادب کی تاریخ میں ادبی تحقیق کی روایت کے مبہم آثار اٹھارہویں صدی میں ملتے ہیں۔اُردو کے اس ارتقائی دور ہی میں دوسری اصناف ادب کی طرح تاریخ و تحقیق کے تجربے کا آغاز ہو گیا تھا"۔ (19)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تمام اصنافِ ادب معاشی اور سماجی ارتقا کے حوالے سے جانچی اور پرکھی جانے لگیں۔ ادب اور زندگی، اجتماعت اور افادیت، حقیقت و واقعیت کے اصول ادبی دنیا میں تسلیم کیے جانے لگے۔ اس دور میں تحقیق کی روایت کو امتیاز علی خاں عرشی، شیخ چاند، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبز واری اور ڈاکٹر وحید قریشی نے آگے بڑھایا۔ انفرادی کام کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں میں اُردو میں تحقیقی کام شروع کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جانے لگیں۔ اُردو کے آغاز کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں میں پیر حسام الدین راشدی، عین الحق فرید کوٹی، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر، پنڈت کیفی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، پروفیسر شبیر علی کاظمی، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر محمد صابر، ڈاکٹر عباد اللہ کیانی، سہیل بخاری، سید مصطفی علی بریلوی، افسر امروہوی اور ڈاکٹر سلطانہ بخش وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں جبکہ نسیم امروہوی اور وارث علی سرہندی نے لغت کے حوالے سے کام کیا۔ مسلم ضیائی نے غالبیات کے حوالے سے کام کیا۔ ان کا ایک بڑا کام غالب کے منسوخ دیوان کی اشاعت ہے۔

مولوی عبدالحق نے "چمنستان شعرا، مخزن نکات از قائم، تذکرہ ریختہ گویاں، گلشن راز از گردیزی، مخزن شعرا از فائق، تذکرہ ہندی از مصحفی، عقد ثریا از مصحفی، ریاض الفصحا از مصحفی، نکات الشعرا از میر، گل عجائب از اسد علی خاں تمنا کے علاوہ نصرتی کی گلشن عشق، میر اثر کی خواب و خیال" کو مرتب کیا۔ دواوین کی ترتیب میں عبدالحی کا دیوان، انتخاب کلام میر دیوان اثر اہم ہیں۔ ملاوجہی کی مشہور تصنیف سب رس، قطب مشتری اور معراج العاشقین کی دریافت اور ان پر عالمانہ مقدمے لکھے۔ ان تصانیف کے نسخے دریافت کر کے اصل متن مرتب کیا۔ مولوی عبدالحق نے تحقیق کو خشک نہیں بننے دیا بلکہ انھوں نے ادبی تحقیق کو حوالے اور حواشی کی مدد سے آگے بڑھا کر شگفتہ اور شاداب بنادیا۔ مولوی عبدالحق نے وضاحتی فہرستیں بھی شائع کیں اور ادب کے قدیم ذخائر کو منظر عام پر لانے اور تحقیقی ادب کو نئے اور تازہ ماخذ فراہم کرنے میں انھوں نے خصوصی دلچسپی لی۔

مولوی عبدالحق ایک ایسے محقق ہیں جو تحقیق کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ وہ خام مواد کے لیے تنقید کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور نشو نما کے حوالے سے نہایت گرانقدر ادبی و تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں۔ انھوں نے اُردو تحقیق کے ابتدائی نقوش اور خدوخال کو ابھارنے کے ساتھ ساتھ اس کو صحیح سمت بھی عطا کی۔ ان تحقیقاتی اور لسانی خدمات پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"زبان کی ساخت و پیدائش، سوسائٹی اور زبان کے تعلق، زبان کی حیثیت، زبان اور ہمارا تہذیبی و ثقافتی سرمایا، زبان، قومی کردار اور اسی قسم کے بڑے مفید اور اہم موضوعات پر مولوی صاحب نے قلم اٹھایا ہے زبان کے متعلق عموماً اور اردو زبان کے متعلق خصوصاً ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے۔ اردو کی پیدائش اور اس کے ارتقا اس کے ماخذ و مبدا اس کے اصول و قواعد اس کے عروج و زوال کے اسباب، اس کے مزاج کی ساخت اور خصوصیات سے کماحقہ واقفیت کے لیے "خطبات عبد الحق" کا مطالعہ ضروری ہے"۔(20)

اُردو تحقیق میں ایک معتبر نام حافظ محمود شیرانی کا ہے انھوں نے جدید مغربی تحقیقی اصولوں کو اپنا کر اردو میں تحقیق کی بنیاد مضبوط کی۔ انھوں نے تحقیق میں حوالوں، مختلف ذرائع اور ماخذات سے حاصل ہونے والی معلومات کے لیے چھان بین اور جرح و تعدیل کی ایک مستند اور قابل اعتبار روایت قائم کی۔ وہ تنقید کرتے وقت تحقیق کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اس تحقیقی عمل سے اپنے نتائج اخذ کرتے ہیں، ابن کنول کے مطابق:

"شیرانی بنیادی طور استخراجی محقق ہیں جس کے بہترین نمونے تنقید شعر العجم میں ملتے ہیں۔ انھوں نے شعر العجم کا جائزہ تحقیقی و تنقیدی تناظر میں کیا ہے"۔(21)

نصیر الدین ہاشمی کا نام بھی اردو تحقیق میں اہمیت کا حامل ہے ان کی کتابوں میں " دکن میں اردو، سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری، مدراس میں اُردو، دکنی قدیم اردو" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قلمی کتابوں کی وضاحتیں وفہرستیں بھی مرتب کی ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کا طریقہ کار سائنٹفک اُصولوں پر مبنی ہے انھوں نے فائز دہلوی کا دیوان مرتب کیا، متفرقات غالب تصنیف کی۔ اردو کا شاہی اسٹیج، اودھ کا عوامی اسٹیج جیسی تحقیقی کتب لکھیں اور انیس کے کلام کے متن کی تصحیح بھی کی ہے۔ قاضی عبد الودود کا مضمون "مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق "کے عنوان سے، پٹنہ میں شائع ہوا جو تحقیق کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔ "شاہ کمال علی دیواروی عظیم آبادی" کے عنوان سے طویل تحقیقی لکھا۔ مضمون تذکرہ شعرا مصنفہ ابن طوفان، دیوان جوش، قاطع برہان جیسی کتابیں ترتیب دیں۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے "عیارستان" اور اشتر وسوزان" بھی تحقیقی اہمیت رکھتے ہیں۔

امتیاز علی خان عرشی نے غالب کے حوالے سے تحقیق پیش کی ہے۔ پروفیسر عبد القادر سروری کا تعلق دکن سے ہے۔ اپنی تحقیقی کتاب "جدید شاعری" میں انھوں نے بیانیہ، غنائی، ڈرامائی، اخلاقی، ہجویہ اور مدحیہ

وغیرہ اقسام کیشاعری کاذکر کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی اور واضح نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کا متن ترتیب دیا۔ کلیات سراج، شاہ صدرالدین کی "مراۃالاسرار" کی تدوین واشاعت بھی کی۔ پروفیسر حامد حسن کی معروف کتاب "داستان زبان اردو" ہے انھیں اردو ادب کے مؤرخ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ شیخ محمد اکرم ماہر غالبیات کی طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان کی کتب "غالب نامہ، آب کوثر، موج کوثر اور رود کوثر" سے ان کی تحقیق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سید محمد نے "ارباب نثر اردو" کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں پہلی بار انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری خدمات کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے ترتیب متن میں خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار"، دیوان عبداللہ قطب شاہ، محمد علی عاجز کی مثنوی "ملکہ مصر" اور مثنویات میر جیسے کام انجام دیے۔ نوب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی کا نام بھی تحقیق کے حوالے سے اہم ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا فن تحریر اختصار سے عبارت ہے۔ وہ تحقیق کے خارزار سے گلاب چن لاتے ہیں۔ زندگی کے عام معاملات ہوں یا تحقیق، تنقید و ادارات کے بحر بے کراں، تاریخ ادب اُردو کا وسیع میدان ہو یا مثنوی کدم راؤ پدم راو کی تالیف کی سنگلاخ چٹانیں، مصنف ایک بہادر جرنیل کی طرح پوری استقامت سے پیش قدمی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی بیک وقت نامور محقق، ادبی مؤرخ، ماہر لسانیات و لغت نویس ہیں۔ وہ واقعات کی کڑیاں جوڑنا اور تحقیق کرنا جانتے ہیں۔ عبدالقادر سروری نے عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے کام کیا۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں اردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست، اردو کی ادبی تاریخ، زبان اور علم زبان کے علاوہ مختلف کتابوں کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ سید وقار عظیم نے امانت کی "اندر سبھا"، شرر کی "فردوس بریں" اور آغاحشر کاشمیری کے منتخب ڈرامے مرتب کر کے مبسوط مقدموں کے ساتھ شائع کیے اور دیوان مومن کا انتخاب بھی ترتیب دیا ہے۔

لسانی تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر حسین خان، ڈاکٹر محی الدین قادری زدر، سید سلمان ندوی، احتشام حسین، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، شوکت سبزواری، عین الحق فرید کوٹی، خلیل صدیقی، اقتدار حسین خان، الہیٰ بخش اختر اعوان، رشید ندوی، ڈاکٹر سہیل، عبدالمجید سندھی، نصیر حسین خیال، فارغ بخاری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قدیم دکنی متون کی تلاش اور اس کی تدوین کے حوالے سے ڈاکٹر مولوی عبدلحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سید محمد شمس قادری، ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر مسعود حسین خان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر

زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، اکبر الدین صدیقی، سخاوت مرزا، ثمینہ شوکت، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، آمنہ خاتون اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ تحقیق حقائق کی جستجو اور بازیافت کا نام ہے یہ علم وفن کے ہر شعبے کیلئے اشد ضروری ہے۔ یہ محض آثار قدیمہ کی تلاش کا کام نہیں بلکہ اس سے تخلیقی منظر نامے پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ بقول مظہر محمود شیرانی:

"سائنسی تحقیق کا انحصار تجربہ پر ہے اس لیے اس کا رخ مستقبل کی طرف ہوتا ہے جبکہ ادبی اور تاریخی تحقیق کو ماضی سے سروکار ہے۔ تخلیقی منظر نامے کا تعلق حال سے ہے ادبی تحقیق اس پر براہ راست اثرانداز نہ بھی ہو تب بھی تخلیق کی راہیں متعین کرنے میں تنقید کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ادھر تحقیق، تنقید کو حقائق کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ یوں بالواسطہ طور پر ادبی تحقیق، تخلیقی منظر نامے پر کسی حد تک اثرانداز ہوتی ہے۔(22)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اکرام چغتائی، خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر اسلام فرخی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی وغیرہ کا نام اہم محققین میں شامل ہے۔ سرفراز علی رضوی اور افسر امروہوی نے مخطوطات انجمن ترقی اردو کی فہرست مرتب کی۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی سائنسدان ہونے کے باوجود ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال پر تحقیقی کام کیا ہے اور اقبالیات کے حوالے سے کئی قابل ذکر تحقیقات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی کی تحقیقی کاوشوں کے حوالے سے ڈاکٹر صدیقی شبلی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر سعید بنیادی طور پر ایک سائنسدان ہیں اس لیے ان کی تحقیق میں بھی سائنٹفک انداز پایا جاتا ہے۔ وہ تسلیم شدہ باتوں کو بلا سوچے سمجھے قبول نہیں کرتے"۔(23)

قیام پاکستان کے بعد جہاں ابواللیث صدیقی نے لغات اور الفاظ کے حوالے سے کام کیا اور ایک مقالہ "چند قدیم لغات" لکھا، وہاں لغات ہی کے سلسلے میں سخاوت مرزا نے "تحقیقات الفاظ ہندی غرائب اللغات" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ غرائب اللغات مولفہ عبدالواسع ہانسوی کے الفاظ کی تحقیق پر خان آرزو نے وقیع کام کیا تھا جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقدمے اور تصحیح کے ساتھ مرتب کیا۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل مختلف جامعات کے ساتھ منسلک رہے۔ انھوں نے اردو تحقیق کو وسعت دینے اور اس کی ترقی میں اہم کردار کیا ہے۔ وہ حوالہ جات اور مکمل ماخذات کے ساتھ تحقیقی مقالات پیش

کرنے کے فن سے آگاہ ہیں۔ تحقیق کے میدان میں ان کی کتاب "اردو تحقیق: صورت حال اور تقاضے" اہمیت کی حامل ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام اردو ادب اور تحقیق میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو ان کے تحقیقی کام "اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" کو ادبی انعام سے بھی سرفراز کیا گیا۔ان کی تصانیف میں "اردو کی بہترین مثنویاں، اردو املا قواعد" اہم ہیں۔

اردو تحقیق کی یہ خوش نصیبی ہے کہ بہت سے لوگوں نے نجی اور انفرادی طور پر بھی تحقیق میں قابل قدر کاوشیں انجام دی گئی ہیں۔ مولوی عبد الحق، عندلیب شادانی، سید عبداللہ، مولوی محمد شفیع، شوکت سبزواری ،اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، ابو اللیث صدیقی، سخاوت مرزا، قیام پاکستانی سے قبل بھی تحقیق سے تعلق کے حامل تھے۔انھوں نے اپنی عالمانہ اور محققانہ کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعد ازاں تحقیق میں جن افراد نے نمایاں کام کیا ان میں کلب علی خاں فائق ، اسمٰعیل پانی پتی اور خلیل الرحمٰن داؤدی ، ڈاکٹر غلام حسین ذو لفقار، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ڈاکٹر نجم الاسلام، غلام رسول مہر، اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محمد ریاض کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو میں تحقیق کے حوالے سے کام کی ابھی بہت زیادہ گنجائش موجود ہے۔ادب کے کئی گوشے ابھی تشنۂ تحقیق ہیں۔ بہت سی باتوں کی ابھی وضاحت ہونا باقی ہے۔ کئی اسرار ابھی سامنے آنے ہیں اور کئی بھیدوں سے پردہ اٹھانا ہے۔

بیسوں صدی کے نصف سے لے کر آخری عشروں میں مختلف حوالوں سے تحقیق کرنے والوں میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ، محمود حسین ، عبد الواحد سندھی ، آصف جیلنی ، مسلم ضیائی ، سید وقار عظیم ، مختار زمن ، مسعود احمد برکاتی ، ریاض صدیقی ، عبد القادر سروری ، سید شبیر کاظمی ، عبد الماجد دریا آبادی ، شفقت رضوی ، پروفیسر شریف کنجاہی ، فارغ بخاری ، ڈاکٹر میمن عبد المجید سندھی ، کامل القادری ، ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری ، سید سبط حسن ، حنیف فوق ، سحر انصاری اور ڈاکٹر عطش درانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے تحقیق کے حوالے سے مختلف کام کیے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ادبی تحقیق کے بنیادی اصول کے حوالے سے لکھا اور اردو میں تنقید کے ارتقا کے حوالے سے اپنی تحقیق پیش کی۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے میر حسن کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی "خانہ میر حسن" کے بارے میں بھی تحقیقی معلومات پیش کی ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالب کے ایک غیر مطبوعہ خط کے حوالے سے تحقیق کی ہے جو انھیں انگلستان کے کتب خانے سے ملا۔ نثار احمد فاروقی نے غالب اور غالبیات کے ضمن میں گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ غالب کے معترف بھی ہیں اور نقاد و محقق بھی۔ پروفیسر اختر انصاری، حسن خاج سید جوادی، مودود احمد صابری ، شمیم حنفی ، خورشید

قائم خانی، احمد رئیس، امیر حسین علی امام اور محمد علی صدیقی نے بھی تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر عباس کا مضمون "اردو کا پہلا سفر نامہ" ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں سید احمد شہید کی سوانح عمری اور یوسف حسین کمبل پوش کے سفر نامہ "عجائبات فرنگ" کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے "شیکسپیئر کے اردو ترجمے" کے عنوان سے شیکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

اقسام تحقیق:

تحقیق کے بنیادی طور پر دو میدان ہیں، جو تعلیمی اور نجی شعبے پر محیط ہیں۔ تعلیمی میدان میں ہونے والی تحقیق اساتذہ اور طالب علموں کے تال میل سے ہوتی ہے اور ان کی مشترکہ کوششوں سے کسی مفروضے یا متن کی جانچ پڑتال ہوتی ہے جس سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ یہی عمل سائنسی تحقیق میں بھی ہوتا ہے اور ادبی تحقیق میں بھی۔ یہ تحقیق نظریاتی یا خالص کہلاتی ہے۔ دوسرا میدان نجی شعبے میں اشیا کی ترقی، وسعت اور پھیلاؤ کے لیے اختیار کی جانے والی تحقیق کا ہے۔ فرض کریں کوئی کارخانہ دار اپنی اشیا کی فروخت کے خرید کنندگان کو جانچنا چاہتا ہے، تو وہ اس کے لیے ایک تحقیقی عمل شروع کرے گا۔ وہ جاننا چاہے گا، کہ اُس کی مصنوعات آبادی کے کتنے حصے میں فروخت ہو سکتی ہیں اور اس کے کیا مثبت اور منفی نتائج بر آمد ہوں گے؟ ان نتائج کے لیے سرمایہ خرچ کر کے باقاعدہ تحقیق کروائے گا۔ یہ تحقیق اطلاقی کہلاتی ہے۔ مغربی اور مشرقی محققین نے اپنے اپنے انداز سے ان کی وضاحت کی ہے۔ یہاں مقبول نظریات اور وضاحتوں کو پیش کیا جائے گا

۔

خالص تحقیق:

اس قسم کی تحقیق کا بنیادی مقصد معلومات کی حدوں کو وسیع کرنا ہوتا ہے۔ استفہامیوں کا طویل سلسلہ ہوتا ہے اور موضوع سے متعلق گمشدہ کڑیوں کو تلاش کیا جاتا ہے۔ ان کڑیوں کی نقاب کشائی کے عمل سے ایک نئی دنیا کا اظہار ہوتا جاتا ہے اور کام کرنے والا اپنے مدعا تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ نظریاتی یا خالص تحقیق کا بنیادی مقصد ہیئتوں اور ڈھانچوں پر محیط ہوتا ہے۔ وہ بنیادی نظریات عطا کرتی ہے۔ منابع و مصادر تشکیل دیتی ہے۔ تصورات اور آئیڈیالوجی قائم کرتی ہے۔ علوم کی جانچ پرکھ اور ان کے اثرات کا دائرہ کار بیان کرتی ہے۔

اطلاقی تحقیق:

اطلاقی تحقیق کا مقصد نتائج کی روشنی میں خالص تحقیق کو پرکھنا ہے۔ یہاں صرف معلومات کی حصولیابی ہی منزل نہیں، بلکہ نتائج کو عملی شکل میں دیکھنا مقصود ہے۔ لہذا مسئلے کو سامنے رکھ کر اسے حل کرنے لیے اصول وضوابط کی حدود میں رہ کر ضروری اقدامات کیے جاتے ہیں۔ گویا خالص تحقیق کا طالب علم مسائل کی نوعیت کا جائزہ لیتا ہے۔"کیوں اور کیوں کر" تک اس کی تحقیق کی دنیا محدود ہوتی ہے۔ لیکن اطلاقی تحقیق سے وابستہ افراد مسائل کو حل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ تحقیق کے ان دنون طریقوں میں فرق کے باوجود کی دنیا ایک ہے۔ ڈاکٹر احسان اللہ کے مطابق:

> " جب تعلیمی محقق تعلم کے اصولوں کو انضباتی اور تجرباتی طریقوں کے ذریعے تنقیدی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ تعلم کی سائنس کے لیے بنیادی تحقیق میں مشغول ہوگا۔ مگر جب تعلم کے اصولوں کی جانچ پڑتال کمرہ جماعت کی تدریس کو بہتر بنانے کے لیے کرتا ہے، تو یہ اس کی اطلاقی یا عملی تحقیق کہلائے گی"۔(24)

تحقیق کے یہی دو میدان یا دو شناختیں نہیں ہیں، ان کے علاوہ بھی متعدد اقسام موجود ہیں۔ خصوصاً سائنسی تحقیق میں تو کئی نظریے اور کئی ایک تحقیقی اصول اور اعمال ہو چکے ہیں۔ نظری و اطلاقی تحقیق کی کئی قسمیں موجود ہیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں:

1۔ مسائل کا حل پیش کرنے والی تحقیق
2۔ نظریہ ساز تحقیق
3۔ متحرک عملی تحقیق
4۔ نظریوں کی پڑتال کرنے والی تحقیق
5۔ تجرباتی تحقیق
6۔ تاریخی تحقیق
7۔ فلسفیانہ تحقیق
8۔ سماجی تحقیق
9۔ تخلیقی تحقیق
10۔ سماجی سائنسی تحقیق

11۔ سروے تحقیق

12۔ میدانی تحقیق

13۔ لیبارٹری تحقیق

14۔ بیانیہ تحقیق

ان تحقیقات کے میدان اور کام ان کے ناموں سے واضح ہیں۔ بعض خالص تحقیقیں ہیں اور کچھ اطلاقی ماہرین نے آسانی کے لیے ان تمام کو پانچ بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے، جو یہ ہیں:

1۔ تاریخی تحقیق

2۔ بیانیہ تحقیق

3۔ تجرباتی تحقیق

4۔ موضوعاتی تحقیق

ان تمام کے دائرہ کار میں مختلف ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات مقاصد ایک جیسے ہوتے ہیں اور کہیں نتائج بھی۔ البتہ نظری تحقیقات فوری افادہ کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ ان پر بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ جب کہ عملی یا اطلاقی تحقیقیں فوری نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ مثبت یا منفی دونوں نتائج جلد بر آمد ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کی مختصر اًوضاحت پیش کی جاتی ہے۔

تاریخی تحقیق:

ادبی و علمی تحقیق پر اسی طریقہ تحقیق کا اطلاق ہوتا ہے۔ تحقیق کسی فن پارے کی ہوتی ہے اور کوئی بھی فن پارہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ تحقیق کے عمل میں سنی سنائی باتوں کی نا اہمیت ہوتی ہے اور نا حیثیت بلکہ تحریری صورت میں موجود مواد یا متون کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ انھی متون کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا اور پھر قاری تک پوری صحت کے ساتھ پہنچانا دراصل ایک محقق کا فرض ہے۔ ڈیوڈ۔ جے۔ فاکس نے اپنی کتاب "تعلیم میں تحقیقی عمل" میں تاریخی تحقیق کے حوالے سے یوں رائے ظاہر کی ہے:

> "اس میں تاریخی دستاویزات، آثار قدیمہ اور ماضی کی برگزیدہ شخصیات، کارناموں اور فلسفوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ کار وہی ہے، جو عام سائنسی طریقے کے ہیں، یعنی ا۔ مسئلہ یا موضوع کی وضاحت اور مفروضہ کا تعین ۲۔ مواد کا حصول مع طریقہ کار ۳۔ نتائج اخذ کرنا اور مفروضے کی تردید اور

مقبولیت ۴۔ نتائج مرتب کرنا"اس طریقہ تحقیق میں تجزیے کے لیے مواد تیار نہیں کیا جاتا، بلکہ مواد سے پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ جس کی تلاش کے لیے دو قسم کے ماخذ استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ ابتدائی ماخذ: دستاویزات، مخطوطات یا اصلی شواہد، واقعہ دوسرے متعلقات۔ ثانوی ماخذ: سرکاری اطلاعات، ذاتی بیانات، قصے کہانیاں، تصویری مجموعے، اور مطبوعات وغیرہ۔ اس طریقِ تحقیق میں حقائق کا تنقیدی جائزہ داخلی اور خارجی شواہد کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ یہ طریق خالص تحقیق کے دائرہ عمل میں آتا ہے"۔(25)

تحقیق سے مراد سچائی کو تلاش کرنا حق تک پہنچنا، شک کو یقین میں بدلنا، نئے حقائق کو تلاش کرنا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے انسان کے ذخیرہ علم میں اضافہ ہوتا ہے ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں مسائل کا حل مل جاتا ہے انسانی مسائل کے حل کی راہنمائی ملتی ہے ضرورت زندگی کو تکمیل ملتی ہے۔ تحقیق کی بنیاد مطالعہ اور مشاہدہ پر ہوتی ہے۔ تحقیق کسی خیال اور معلومات کو من وعن قبول نہیں کرتی بلکہ وہ خود انہیں دریافت کرتی ہے۔ تحقیق ادبی میدان میں ادیب شاعر، افسانہ نگار، نقاد کے کارناموں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ادیب اور ادب کی قدو قیمت میں اضافہ اور استحکام کا باعث بھی تحقیق بنتی ہے۔

بیانی تحقیق:

اس طریقہ تحقیق میں حقائق اور واقعات کو بعنیہ اس طرح واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے جس کہ وہ اپنی اصلی حالت میں رونما ہو رہے ہیں۔ اس قسم کی تحقیق سے حاصل شدہ مواد نئے اور اچھوتے پروگراموں کی نشاندہی کے لیے مفید اور کار آمد ہوتا ہے۔ اس تحقیق میں حقائق جمع کرنے کے لیے متعلقہ اعداد و شمار کی زبان استعمال کی جاتی ہے اور نتائج اخذ کرنے کے لیے جدول کی تیاری ضروری ہوتی ہے تاکہ نتائج کی روشنی میں مفروضہ کو رد یا قبول کیا جائے۔ اس طریقہ کار کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ حقائق جمع کرنے اور تجزیے کے لیے سروے کی مختلف قسمیں استعمال کی جاتی ہیں، جن میں :

1: Cross Sectional survey

2: Longitudinal Survey

3: Approxtimatin Longitudinal Survey

4: Parral Samples

5: Contextional Studies

شامل ہیں۔ تجزیے کی ان قسموں کے علاوہ Case Study کے ذریعے بھی حقائق کی تلاش کی جاتی ہے۔ نیز تقابلی جائزے بھی بیانیہ تحقیق کی بنیادی سرگرمیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان ذرائع سے حاصل کردہ معلومات، تجرباتی تحقیق کے لیے بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

تجرباتی تحقیق:

سائنسی تجزیے میں حالات وواقعات میں اختیاری طور پر عملاً ایسی تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں جن کے ذریعے واقعات یا حالات کی علتوں یا واقع ہونے کا پتہ چل جائے۔ اس کے بعد جن نئ چیزوں کا مشاہدہ ہوتا ہے ان کی تشریح کی جاتی ہے اور اس کے اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ نیز تجزیے کے پیچیدہ ترین طریقوں سے تحقیق کی منزل طے ہوتی ہے۔ تحقیق کے ضمن میں جن جن حقائق کا مشاہدہ مطلوب ہوتا ہے، ان کا قابل اعتماد ہونا ضروری ہے۔ بقول ڈاکٹر احسان اللہ خان:

> " تاریخی حقائق پر آسانی سے اعتماد کیا جاسکتا ہے ایسے جوڑ توڑ کرنے کا باقاعدہ طریقہ کار ہوتا ہے، جس سے سائنسی تجزیے کا پیش از وقت منصوبہ تیار کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اقدام کا باضابطہ طریقے سے اطلاق کیا جاتا ہے، جو بالکل معروضی ہوتے ہیں"۔(26)

اَدبی یاموضوعاتی تحقیق:

تحقیق کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے اگر تحقیق کا عمل نہ ہو تو کبھی بھی حقیقت تک نہیں پہنچا جاسکتا، سائنس اور ٹیکنالوجی میں آج انسان جس جگہ موجود ہے وہ سب تحقیق کی وجہ سے ہی ہے۔ انسان کی سرشت میں جو کھوج لگانے کا مادہ موجود ہے اسی کی وجہ سے وہ موجودہ حالت تک پہنچا ہے کہ آج امریکہ میں بیٹھ کر جاپان کے بارے میں ہر طرح کی معلومات حاصل کر سکتا ہے ۔ ہواؤں میں اڑ رہا ہے اور حقیقتاً انسان نے ستاروں پر کمنڈ ڈال لی ہے۔ ادب میں بھی جتنی ترقی ہوئی ہے وہ سب کی سب تحقیق کی وجہ سے ہے۔ آج کے دور کے قاری کو ملا وجہی اور امیر خسرو کی شاعری اور نثر تک رسائی ہے تو تحقیق کی بدولت ہی ہے اسی طرح قدیم دور کے مخطوطات اور متون کو دریافت کیا گیا اور ان کو محفوظ کیا گیا ہے تو وہ تحقیق کی وجہ سے ہی ہوا ہے ۔اس لیے تحقیق کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اور کسی بھی فن میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کی صورتحال: اجمالی جائزہ:

جامعات اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے آخری ادارہ ہوتی ہیں جس کے بعد رسمی تعلیم و تدریس ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جگہ یا ادارہ جہاں اعلیٰ تعلیم کی سہولت حاصل ہو، تحقیق کی جاتی ہو اور اس تحقیق کے بعد ڈگریاں تفویض کی جاتی ہوں، جامعہ، دانش گاہ یا یونیورسٹی کہلائی جاتی ہے۔ "یونی ورسٹی" کا ایک اور مفہوم "میکسم گورکی" کی آپ بیتی میں نظر آتا ہے۔ آپ بیتی میں وہ "میری یونی ورسٹیاں" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس باب کے تحت اُس نے اپنی زندگی کے اُن دنوں کے بارے میں لکھا ہے جب وہ روٹی اور روزگار وغیرہ کے سلسلے میں سرگرداں تھا۔ اسے ایک ہوٹل میں بیرے کی نوکری ملی جس سے اس کی زندگی کا پہیہ رواں دواں ہوا۔ گورکی کے مطابق وہ دن جب وہ اور اس کے دیگر دوست روسی انقلاب کے نتیجے میں ایک آزاد مملکت کا خواب سجاتے تھے، بہت حسین تھے۔ وہ اپنے دوستوں کی باتیں سن کر ان پر غور و فکر کرتا۔ اسی غور و فکر کی وجہ سے ایک بیرے کی زندگی بدلی اور وہ انقلاب پسند تحریک کا سرگرم رکن بن گیا۔ یہی نوجوان لینن کے قریبی ساتھیوں میں شمار کیا جانے لگا اور دنیا کے بڑے اعزاز "نوبل انعام" کا حقدار ٹھہرا۔ اپنی ہوٹل میں گزری زندگی کو اُس نے "میری یونیورسٹی" کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے یہاں سے جو علم حاصل کیا اسی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے اپنی آنے والی زندگی کا خاکہ "ڈھانچہ" تشکیل دیا اور پھر دنیا میں کامیاب بھی ٹھہرا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ "یونیو رسٹی" کے اصل معنی و مقصد کو تو گورکی نے ہی سمجھا۔ مگر آج کے دور میں ہم نئے تصورات سے غافل نہیں رہ سکتے اور ڈگریوں، اسناد کی افادیت و اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جامعات میں مختلف طرز کے امتحانات ہوتے رہتے ہیں، جن میں رسمی اور غیر رسمی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح اداروں میں بھی مختلف نوعیت کے مقابلہ جاتی امتحانات ہوتے ہیں جو زیادہ تر یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل محققین کی معاشرے، سماج یا سوسائٹی کے لئے خدمات حاصل کرنے کوشش ہے۔ جامعات میں تحقیق کی افادیت پر نمایاں علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ عام قاری بھی اپنی ناقدانہ رائے پیش کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ موجودہ تناظرات میں اعلیٰ تعلیم خاص طور پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کی افادیت فی زمانہ کم معیار کی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ڈگری کے حصول اور معاشی فوائد کے لئے محققین کی کثیر تعداد تحقیق پر زیادہ توجہ نہیں دیتی۔ اسی لئے بعض اوقات ان محققین کی تحقیقی کاوشوں پر تنقیدی تاثرات بھی سامنے آتے ہیں اور ان کے کم معیارات پر بات کی جاتی ہے۔

درج بالا حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں ہونے والے مد و جزر یا تعمیر و تشکیل کے جدید عہد میں داخلے کے لیے جو افرادی قوت، ذہن اور سوچ ضروری ہے، ان کی فراہمی کے لیے بنیادی و اساسی کارخانہ "یونی ورسٹیاں" ہی ہیں۔ جامعات سے فارغ التحصیل محققین سے ہی علم و ادب کے میدان کا نظام چل رہا ہے۔ جامعات کے تحقیقی معیار کے حوالے سے جو بھی اختلافات ہوں ، یہ بھی حقیقیت ہے کہ جامعات میں "تازہ لہو" باہم پہنچا کر ہی تحقیق اور معیار کے نئے منظر نامے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ وہ ناقدین یا دانش ور جو جامعات کے تحقیقی و تنقیدی کاموں سے نا امید ہیں، وہ بھی ان اداروں کو تحقیق اور معیاری تحقیق کے حوالے سے مفید مشوروں سے بہرہ مندی کریں اور انھیں نوشتہ دیوار سے ہم آہنگ ہونے کے لئے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔

بر صغیر میں جنگ آزادی کے بعد انگریزی تعلیم کی ضرورت کے مطابق تعلیمی ادارے وجود میں آئے مگر ان اداروں کی توسیع کا کام سست رفتار سے ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف مخصوص لوگ ہی اعلیٰ تعلیم سے فیض یاب ہو سکے۔ قیام پاکستان کے بعد اس تعلیمی سلسلے کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے کی سعی شروع ہوئی مگر اب بھی اس ملک کی کثیر آبادی اپنا نام بھی نہیں لکھ پاتی حالانکہ حرف شناسی اور کسی لفظ کو ضبط تحریر میں لانے کے مراحل بہت بعد میں آتے ہیں۔ مملکت خداداد میں متعدد پرائیویٹ یونی ورسٹیوں اور تکنیکی کالجوں کے باوجود تعلیمی ضرورتوں کے اعتبار سے اداروں کی تعداد بہت حد تک کم ہے۔ تحقیقی اداروں کی کمی سے نقصانات کے بارے میں پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر خصوصی تجزیے کیے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں خاص طور پر جامعات کی استعداد کار بڑھانے میں مصروف عمل صوبائی اور مرکزی حکومتیں عوام کو خواندہ،" حرف شناس" اور تعلیم یافتہ بنانے کے لیے اپنی وسائل استعمال کر رہی ہیں۔ ان تمام وسائل اور سہولیات کے باوجود مغربی یا ترقی یافتہ ممالک سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے میدان میں پاکستانی جامعات بہت پیچھے ہیں۔

ہندوپاک کی تاریخ کے تحقیقی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس خطے کی مختلف جامعات کے شعبہ اُردو صد سالہ معیاد پوری کر چکے ہیں اور کچھ جامعات میں پچاس برس سے زائد ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں 1947ء کے بعد کئی کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اُردو کا شعبہ قائم کیا گیا۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ مختلف تعلیمی اداروں میں پہلے سے قائم شعبہ اُردو کو قومی زبانی کی تنگ نظری کی وجہ سے محدود یا بند کرنے کی کوشش ہوئی۔ ان مشکل حالات کے باوجود جامعات کے شعبہ اُردو نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی تعلیمی و تحقیقی

سر گرمیوں کی بدولت تحقیقی میدان میں مصروف عمل ہیں۔پاکستانی جامعات کے محققین اور اساتذہ کی تعداد کا اندازہ کیا جائے تو یہ لازمی طور پر سینکڑوں میں ہو گی۔ان میں سے ایک غالب تعداد اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ ان محققین کی ایک کثیر تعداد تعلیم و تحقیق کے میدان میں مصروف عمل ہے۔ان تحقیقی سر گرمیوں کی وجہ سے اُردو تحقیق کا درخت پھل پھول رہا ہے اور لسانیات کے شعبے میں اپنی دھاک بٹھا رہا ہے۔اساتذہ اور طلبہ کی تحقیقی کاوشیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی ہیں۔کئی ماہرین لسانیات اور مصنفین کی کتب بھی شائع ہو کر قارئین کے ذوق کی تسکین کر رہی ہیں۔اُردو کی مختلف جہات کے حوالے سے جامعات میں ورکشاپیں، مذاکرے اور سیمینار منعقد ہو رہے ہیں جن سے اُردو تحقیق کی روایت پروان چڑھ رہی ہے۔

درج بالا سطور اس بات کا اشارہ ہیں کہ جامعات میں اُردو تحقیق جاری ہے۔ جامعات میں تحقیق کی روایت کے حوالے سے شعبہ اُردو کے اساتذہ اور محققین کی طویل فہرست ہے۔اس فہرست میں رشید احمد صدیقی، ، ڈاکٹر رشید حسن خان نور الحسن ہاشمی ،عندلیب شادانی، ، سید احتشام حسین، آلِ احمد سرور، اختر اورینوی، سید اعجاز حسین، سید عبد اللہ، خواجہ احمد فاروقی، وحید قریشی اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی وغیرہ جیسے ماہرین موجود ہیں جن کی بدولت جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحان میں اضافہ ہوا۔ان ماہرین کی تحقیقی سر گرمیوں نے برصغیر کے علاوہ مغربی ممالک کی متعدد جامعات میں بھی اُردو تحقیق کے منظر نامے کو وسعت عطا کی جس سے اُردو کی تعلیم، تدریس اور تحقیق کے نئے در وا ہوئے۔

جامعات میں اُردو تحقیق کی روایت میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اُردو کے محققین اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد معاشرے کے دیگر شعبوں میں بھی خدمات سر انجام دیتی رہی ہے۔ یہ حضرات اُردو اور دیگر زبانوں یا مضامین کے ماہرین سے ہم آہنگی بنا کر اپنے تحقیقی کاموں کو نمایاں بنانے میں سر گرم رہے۔اس قبیل کے افراد نے شعبہ اُردو کو اُردو زبان کے ابتدائی ماہرین لسانیات، دانش وروں ، تخلیق کاروں اور اُردو ادب کی تحریکوں سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا جس وجہ سے جامعات اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔انہی کی تخلیقی و تحقیقی کاوشوں کی بدولت تقسیمِ ہند کی وجہ سے پیش آنے والے مشکل حالات میں ادبی جہات کو سمیٹے رکھا جس سے نئے ادب کے رنگ ڈھنگ میں بھی تبدیلی نظر آئی۔اُردو ادب کی اسی نسل نے جامعات میں مختلف ادبی تحاریک کا آغاز کیا جس سے اُردو زبان، تخلیقات، تحقیقات اور تصنیفات کے ساتھ ساتھ اُن

کی خوبیاں اور خامیاں قارئین کے سامنے آئیں۔ تنقیدی ادب کا آغاز ہوا ، جس میں صاحبان دانش نے بھرپور حصہ لیااور اُردوزبان وادب کو ترقی وارتقا کی نئی منازل سے آشنائی ہوئی۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد جامعات میں اُردو تحقیق کا رجحان تبدیل ہوا۔اس کی بنیادی وجہ محققین میں اعلیٰ ملازمت کی خواہش تھی۔ تخلیق اور تحقیق کی طرف رغبت نہ ہونے کے برابر تھی۔یہ وہ دور تھا جب حکومتی سطح پر ملازمین کے مشاہرے بڑھائے گئے۔اس پس منظر میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اساتذہ کے طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔یہ ہی وہ زمانہ ہے جب شعبہ اُردو میں مزید ترقی اور وسعت کے امکانات سامنے آئے۔ تقسیمِ بنگال کی وجہ سے اُردوزبان وادب کو نئے موضوعات میسر آئے اور پاکستانی ادب ایک نئے دور میں داخل ہوا۔اسی تناظر میں جامعات میں بھی تحقیق کے رجحانات میں فرق دیکھنے کو ملا۔اس عرصے میں جامعات میں تنظیمی طور پر تبدیلیاں بھی نظر آئیں۔ان تنظیمی تبدیلیوں میں جامعات میں اساتذہ کی تقرری کا طریقہ کار بھی شامل تھا۔سفارشی اور کم صلاحیت کے حامل اساتذہ کی تقرری سے جامعات میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تحقیق کا شعبہ بھی بری طرح متاثر ہوا۔جب تدریس و تحقیق سے بے بہرہ حضرات منتخب ہوں اور اُن کی ترجیعات میں تحقیق سے زیادہ معاشی فوائد کا حصول ہوتو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تحقیق کا معیار کیسا ہو گا؟۔یہ بات روزروشن کی طرح واضح ہے کہ جب بھی تعلیمی و تحقیقی لحاظ سے کمزور استاد کا تقرر ہوا تو یہ نسل کُشی کے مترادف ہے۔ایسے اساتذہ کی فہرست طویل ہے جن کا تقرر ملک کے ممتاز تعلیمی اداروں کے لیے کیا گیا مگر وہ "چاند میں بدنما داغ" ثابت ہوئے۔وہ جب ایک بار لیکچرار یا اسسٹنٹ پروفیسر بنادیے گئے تو پھر کل کو یہ ہی صدر شعبہ یا رئیس کلیہ (ڈین) منتخب ہوں گے جس سے اُردو تحقیق کا معیار زوال پذیر ہونے کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔کیونکہ جب جامعات میں اساتذہ کے تقرر میں مصلحت کوشی ، اقربا پروری، خوشامد اور چاپلوسی وغیرہ کو ملحوظ رکھا جائے گا تو یہ معاملات تحقیق پر بھی اثرانداز ہوں گے۔

مملکت پاکستان کے مختلف حصوں میں جب اُردو کے ترقیاتی ادارے قائم ہونا شروع ہوئے تو یہ اُردو کے اساتذہ کے لیے مستقل ترقی کا ذریعہ بن گئے ۔کیونکہ اُردو کے اساتذہ کے پاس اقتدار کی رسّی بھی ہاتھ آگئی ۔کراچی اور لاہور سمیت پاکستان کے بڑے شہروں تک یہ ہی سلسلہ نظر آیا۔ اِن اداروں کی مجلسِ عاملہ ، صدر، نائب صدر یا سکریٹری تک کے عہدے بعض اوقات اُردو کے اساتذہ کو مل گئے۔اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اساتذہ کے ان اقدامات کی وجہ سے اُردو تحقیق کو آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔اس کی

بنیادی وجہ یہ ہی ہے کہ ان شخصیات نے اپنے "اقتدار" کو اپنی ذاتی تشہیر، ترقی، اپنے حلقہ احباب کی پزیرائی اور ملکی و بین الاقوامی سطح پر خود کو "نمایاں" کرنے میں استعمال کیا۔

اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے صوبائی و مرکزی حکومتیں اور اعلیٰ تعلیمی کمیشن اپنے وسائل استعمال کر رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن جامعات میں تحقیق پر کروڑوں روپے خرچ کر رہا ہے۔ پاکستان جغرافیائی اور آبادی کے لحاظ سے بڑا ملک ہے۔ رقبے اور آبادی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رقم ناکافی ہے مگر اُردو زبان کی ترقی، ترویج اور تحقیق کے لیے اگر مناسب طور پر استعمال میں لائی جائے تو بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے تعاون سے پاکستانی جامعات اُردو تحقیق کے حوالے سے مصروف عمل ہیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی مقالہ جات تحریر کیے جا رہے ہیں۔ جامعات کے محققین مختلف موضوعات پر مقالے مربوط و مبسوط کر رہے ہیں۔ جس سے یقینی طور پر جامعات میں اُردو تحقیق کی روایت مزید مضبوط ہو رہی ہے۔ اعلیٰ تعلیمی کمیشن ایم فل اور پی ایچ ڈی کے محققین کو اہلیت کی بنیاد پر تعلیمی وظائف (اسکالرشپ) بھی مہیا کر رہا ہے جس سے کتابوں کی خریداری، پروجیکٹس، آرٹیکل، جامعات کی فیس وغیرہ جیسے بنیادی مسائل کم ہو جاتے ہیں اور اسکالر یکسوئی کے ساتھ اپنی تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے۔ پاکستانی جامعات کا ایک گوشوارہ مرتب کیا جائے تو ایسے اساتذہ اور محققین کی ایک کثیر تعداد ملے گی جنہوں نے اُردو تحقیق کی روایت کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کئی جامعات میں اسکالر اپنے استاد سے بڑھ کر نظر آئے گا۔ اساتذہ یا نگران مقالہ نے بھی ایسے محققین کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

اس کامیابی کے پیچھے اساتذہ کے کردار اور عمل میں مثالی اوصاف شامل رہے ہیں جس کا عام سا فارمولا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مطالعہ، درس اور تصنیف و تالیف کی تثلیث میں خود کو ایسے توازن سے سنبھال کر رکھا جائے جس سے اساتذہ اپنے کاموں کو بہ احسن و خوبی انجام دے سکیں۔ ان اساتذہ نے اپنے ذاتی کاموں سے الگ اسی انداز کے لائق شاگرد بھی پیدا کیے جنھوں نے خود پڑھا، بہتر طریقے سے پڑھایا اور اچھا خاصا لکھا جس سے دوسرے لوگ فیض یاب ہوئے۔ اس نسل میں صفِ اساتذہ اور حلقۂ شاگرداں میں شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، محقق، نغمہ نگار، منظر نامہ نگار سے لے کر انتظامیہ کے بڑے بڑے عہدے دار بھی پیدا ہوئے۔ اُردو "کمرہ جماعت" سے نکل کر ان جگہوں تک بھی پہنچی جہاں آسانی سے اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آزادی کے بعد کئی عشروں کے صبر آزما سماجی اور سیاسی ماحول میں اُردو کی بقا کی یہ بہترین جنگ تھی جو ان معزز اساتذہ اور ان کے شاگردوں نے جیتی۔ اُس دور کے اردو اساتذہ اسٹاف روم یا دفتر میں بند نہیں ہوئے تھے بلکہ

اُن کے کام کی خوشبو باہر بھی پھیل رہی تھی اور دوسرے مضامین کے اساتذہ اور طلبا بھی اردو کے اساتذہ کے کاموں کو جانتے اور سمجھتے تھے۔ انھیں سائیکل پر سوار یا پیدل گزرتے ہوئے کسی گلی، بازار یا رکشے پر چلتے ہوئے کوئی رشید احمد صدیقی، اختر اورینوی یا سید احتشام حسین کے طور پر پہچان لیتا تھا۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ یہ اپنی یونی ورسٹی، اپنے صوبے اور ملک کا نمائندہ شخص ہے۔ یہ اپنی زبان اور اپنے شعبے سے بڑھ کر پہچانا جاتا ہے۔ اس میں صرف ان اساتذہ کی شہرت شامل نہیں تھی بلکہ اس سے ہماری زبان اور اس کے پڑھنے والوں کا وقار بھی بلند ہوتا تھا۔

انگریزی میں مواقع حاصل ہونے کے باوجود آلِ احمد سرور اُردو شعبے کا حصہ بنتے ہیں اور کلیم الدین احمد نے باضابطہ طور پر شعبۂ اردو میں آکر تنقید کا پرچہ پڑھایا۔ اُردو کے ادیب و شاعر دوسرے مضامین اور دوسرے شعبہ جات میں جہاں جہاں نظر آتے تھے، اس عہد کے اساتذہ انھیں شعبۂ اردو سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جوڑ کر اپنے طلبا کو فیض یاب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔ قاضی عبدالودود بیرسٹر تھے مگر پٹنہ یونی ورسٹی نے انھیں پی ایچ۔ ڈی۔ کی نگرانی کے لیے منتخب کیا تھا۔ کئی دوسری یونی ورسٹیوں نے بھی انھیں اردو کے تحقیقی مقالوں کا ممتحن بنایا۔ کلیم الدین احمد بھلے انگریزی کے پروفیسر تھے مگر ان کی نگرانی میں باضابطہ طور پر اردو کے تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ وہ قومی سطح پر تحقیقی مقالوں کے ممتحن ہوتے تھے۔ گیان چند جین کے تحقیقی مقالے کو انھوں نے نامنظور کیا تھا اور ان کے تفصیلی مشوروں کے بعد گیان چند جین نے اپنا مقالہ دوبارہ لکھا۔ شمیم حنفی کے ڈی لٹ مقالے کے ممتحنین میں سے کوئی بھی عام معنوں میں اردو کا آدمی نہیں تھا۔

گذشتہ کچھ عرصے میں شعبۂ اردو کے اساتذہ اور فارغ التحصیل محققین کی کارکردگی میں واضح طور پر ہمہ جہت گراوٹ نظر آتی ہے۔ جو نااہل اساتذہ تھے، وہ پڑھا نہیں سکتے تھے۔ جو پڑھا سکتے تھے، انھوں نے دوسری ذمہ داریوں کو اولیت دی۔ اساتذہ جوں جوں مستقل اور سینئر ہوتے گئے، انھوں نے کمرہ جماعت کی تدریس سے خود کو بہ تدریج الگ کر لینے میں اپنی بڑائی سمجھی۔ چند یونی ورسٹیوں اور کچھ فرض شناس اساتذہ کو الگ کر لیں تو کراچی سے لے کر لاہور اور لاہور سے لے کر پشاور تک حالات دگرگوں ہیں۔ کمزور اساتذہ نے طلبا کو نہیں پڑھایا تو بے شک کوئی بجلی نہیں گری کوئی خاص نقصان بھی نہیں ہوا مگر جو باصلاحیت تھے اور علم و فن کے باریک نکتے اپنے شاگردوں کو بتا اور سکھا سکتے تھے، ان کی گریز خوئی نے ہماری نئی نسل کو علمی اعتبار سے بے حد کمزور اور بے مایہ بنا دیا۔

چند جامعات نے متن پڑھانے کا کچھ رواج رکھا ہے ورنہ تنقیدی مطالعہ اور عمومی سوال وجواب کے پیرائے میں تدریس کو وہاں تک پہنچادیا گیا ہے کہ آج مشکل سے دس فی صد ایم۔اے یا ایم۔فل کے طالب علم ایسے ملیں گے جنھیں آپ 'دیوانِ غالب' یا 'کلیاتِ اقبال' دے دیں اور ان سے یہ توقع کریں کہ وہ اشعار کی قرات درست طریقے سے کرلیں اور ان کے معنی اور مفاہیم پر آپ سے گفتگو کریں۔ عروض وبلاغت کے موضوعات پر ابتدائی غور وفکر کرنے والی نسل بھی ہمارے شعبہ جات میں نہیں ہے۔ اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان طلبا کے اساتذہ میں کتنے ہیں جو مشکل شعری متون بالخصوص صرف ونحو، قصائد، مثنوی اور مراثی وغیرہ کے متون کی تدریس باضابطہ طور پر کرسکتے ہیں۔ عروضی تجزیہ تو اب خواب کی بات ہے۔ لسانیات اور قدیم ادب کی تدریس بھی گمنام جزیرے کے سفر کی طرح سے ہمارے یہاں شعبہ جات میں کارِ محال ہے۔ ہمعصر ادب کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ ایسے میں ہم جن کی تربیت کرکے معاشرے کے سامنے ایم۔اے۔، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں دے کر بھیج رہے ہیں، ان سے یہ کیسے توقع کریں کہ وہ نئ تعلیمی دنیا بنائیں گے اور ہماری زبان کا عَلم سربلند کریں گے۔ جو کام ان کے اساتذہ نہیں کرپاتے ہیں تو اتنا بھاری پتھر غیر تربیت یافتہ طالب علموں پر کیوں ڈالیں۔

آج شعبہ ہائے اُردو پر کئی طرح کے حملے ہورہے ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے سے ایسی خبریں آتی ہیں کہ اساتذہ کے انتخابات اور تقرری کے مرحلے میں ذاتی اور مالی منفعت اور اقرباپروری کی خاطر اُن کی بہترین صلاحیتوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں یا چہ مگوئیاں درست نہیں ہوسکتیں اور کئی جگہوں پر حالات بہت بہتر ہیں مگر بغیر دھویں کے آگ ہوتی ہے کیا؟۔ ایچ ای سی سے لے کر متعدد تقرراتی ادارے اور یونی ورسٹیاں روز نئے اور سخت قوانین بنانے کی کوششیں کرتی ہیں مگر بعض مافیا اپنے لیے راستہ بنالیتا ہے۔ کہیں ماہرین کے نام اور کہیں کس کا نام انتخاب میں آئے گا وغیرہ، اس کی فہرست پہلے سے ہی سوشل میڈیا میں شائع ہوجاتی ہے۔ یہ کسی ایک کا ذاتی نقصان نہیں بلکہ شعبۂ اُردو کا اجتماعی اور ہمارا قومی نقصان ہے، کیوں کہ خراب تقرری سے ایسے لوگ کہاں سے آئیں گے جو ہمارے درس کا بوجھ اٹھا سکیں اور نئ نسل کی اچھی تربیت کرکے انھیں شاہراہِ حیات پر کامیابی کے پرچم لہرانے کے لیے بھیج سکیں۔

پاکستانی جامعات کے شعبہ اُردو ایک ایسے جزیرے کی طرح ہیں جن کا کسی دوسرے شعبے سے بہ مشکل رسمی یا غیر رسمی تعلق ہے۔ علمی رابطے کے معاملے میں تو اسے صفر ہی کہا جائے گا۔ اب بین العلومی شعبہ جاتی تحقیق کا دور ہے۔ تقابلی مطالعات کے لیے دنیا بھر میں گنجائشیں پیدا ہورہی ہیں مگر شعبۂ اُردو سکڑتا جارہا

ہے۔ جب اس کے پاس کلاسیکی ادب پڑھانے والے اور دل لگا کر شاعری کے رموز و نکات بتانے والے اساتذہ نہیں، لسانیات کی تعلیم کا کوئی سلسلہ قائم نہیں ہو رہا ہے تو نئے مضامین کی طرف کون نظر اٹھائے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ افسانہ، ناول اور چند نقادوں کے بارے میں بچوں کو آشنا کرانے کے بعد شعبۂ اُردو نے یہ سمجھ لیا کہ اس کی تدریس کے ابواب مکمل ہو گئے اور وہ اپنے طلبا کو فارغ التحصیل ہونے کا سرٹیفیکیٹ عطا کر سکتا ہے۔ اس تربیت اور اس معیار سے اس زمانے میں تو بھیک بھی نہیں مل سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شعبۂ اُردو اپنے فارغ التحصیل محققین کو کیا سڑکوں پر بھٹکنے کے لیے، ریل کی پٹریوں پر آکر خود کشی کر لینے کے لیے یا دریا میں ڈوب کر مر جانے کے لیے ڈگریاں بانٹ رہا ہے۔ اگر ہاں تو ارباب اختیار کو اس کے سد باب کی کوششیں کرنی چاہییں۔

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے اجمالی جائزے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ شعبہ ہائے اُردو نقلی تعلیمی مراکز بن کر رہ گئے ہیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہے کہ باہر کی دنیا میں اُردو پڑھ کر جو بچے جائیں گے، انھیں ان ڈگریوں کے ساتھ ساتھ اور کیسی مہارتوں کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لیے کوئی باضابطہ تیاری نہیں ہے۔ آنے والے وقت میں ہماری زبان کے فرزندان کو مزید کون سی مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا، کیا ان کا ہمارے شعبے کے اساتذہ کو اندازہ ہے؟ اگر ہے تو اس کے لیے انھوں نے اپنے نصاب میں کون سی تبدیلیاں کیں؟ انھوں نے اپنے طریقۂ تدریس میں کن نئے وسائل کا استعمال کیا۔ اجتماعی طور پر شعبوں نے اگر درست کام نہیں کیا تو کون سے ایسے اساتذہ تھے جنھوں نے اپنی انفرادی کوششوں سے اپنے شعبے کے طلبا کو نئے دور کے کامیاب اور ہنر مند لوگوں میں شامل کر کے اس لائق بنایا کہ وہ اپنی زبان کا آئندہ زندگی میں ماتم نہ کریں اور مظلوم کی طرح سے سکڑے سمٹے لوگوں میں رہنے کے لیے مجبور نہ ہوں۔ کیا اُردو کے طلبا نئی دنیا کے چمکتے اور روشن ستارے نہیں ہو سکتے تھے؟ جو ہوئے وہ اپنی انفرادی کوششوں سے ہوئے۔

پاکستانی جامعات میں اردو درس و تدریس کے ماحول کو بدلنے اور اس سے بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے سنجیدہ کوششوں کی اشد ضرورت ہے۔ ہر جامعہ کی ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد ہے۔ مصنوعی ترقیاتی فضا صرف اردو میں نہیں تمام مضامین اور ساری جامعات میں قائم ہے۔ اساتذہ تو ایک منزل پار کر چکے ہیں، افسوس اس کا ہے کہ طلبا اور ریسرچ اسکالر بھی اسی کشتی میں سوار ہیں۔ بھلے انھیں سمجھ میں نہ آتا ہو مگر حقیقت تو یہی ہے کہ یہ ناؤ پہلے سے ہی ڈوبی ہوئی ہے۔ حقیقت کی دنیا مشکل اور مختلف تقاضوں کی طلب گار ہے۔ اساتذہ کو اگر یہ یاد رہے کہ تعلیم و تدریس اور تربیت کا انھیں وہی کام کرنا ہے جنھیں الگ الگ وقتوں میں

پیغمبروں، اولیاے عظام اور صوفیائے کرام نے کیا تو بے شک صورتِ حال بدل سکتی ہے۔ جامعات اور اساتذہ کو سب سے پہلے اپنے نصابِ تعلیم کو عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دوسری زبانوں، دوسرے علوم اور مختلف ملازمتوں کے پیش نظر کورس اس انداز سے تیار کیے جائیں کہ انھیں پڑھ اور سیکھ کر جو ہمارے شعبہ اُردو سے نکلے گا، وہ اپنی زبان کے حوالے سے ہر امتحان میں کامیاب و کامران ہو گا۔ وہ جیسی ملازمت چاہتا ہے اور دنیا میں رزق کے جن نئے ذرائع کی طرف قدم بڑھانا چاہتا ہے، ادھر منزل اسے آواز دے۔

جامعات میں تحقیق کے اجمالی جائزے میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ایک یونی ورسٹی کے سکالرز دوسری یونی ورسٹی کے ایسے ہی شعبے کے طلباء یا اساتذہ سے دور رہتے ہیں۔ جب اپنے مخصوص دائروں سے طلبا باہر نکلیں گے تو انھیں پتا چلے گا کہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ تبادلۂ خیال اور باہمی مقابلے سے طالب علموں کی صلاحتیں نکھریں گی اور آگے بڑھیں گے۔ ان کے لیے یہ عذر بھی کم ہو گا کہ اگر کسی موضوع کا ماہر ان کی یونی ورسٹی میں نہیں تھا تو اس کا نعم البدل دوسری یونی ورسٹی یا اس شہر میں کوئی دوسرا ہو سکتا تھا۔ پاکستانی جامعات کے ہر شعبۂ اُردو میں ایسے لائق طلبا موجود ہیں جن میں علم کی پیاس ہے اور اپنی زبان کے بہتر ذرائع کو استعمال کرنے اور خود کو مستقبل کا ایک ہونہار استاد بنانے کا بے پایاں شوق ہے۔ اب ان کا یہ فرض ہے کہ اس شوق کو پروان چڑھانے اور پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے حائل رکاوٹوں کو دور کریں، سرحدیں توڑیں اور کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے اتر جائیں۔ اقبال کا سبق ہمارے شاہینوں کو ہمیشہ یاد رہنا چاہیے:

نہیں ہے تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر (27)

مذکورہ مسائل کے باوجود مختلف جامعات اُردو تحقیق کی روایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ وہ جامعات جن میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اُردو پروگرام ہیں، اُن میں بطور خاص تحقیق کا رجحان نمایاں ہے۔ اِن جامعات کے اساتذہ کی تحقیقی کاوشیں مختلف تحقیقی رسائل و جرائد کی زینت بھی بن رہی ہیں۔ مختلف جامعات سے تعلق رکھنے والے تحقیق میں مصروف اساتذہ میں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انوار احمد ، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر عقیلہ بشیر، ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر یوسف خشک، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر عامر سہیل ، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری، ڈاکٹر اشرف کمال، ڈاکٹر عابد

سیال،ڈاکٹر شیر علی،ڈاکٹر وسیم انجم ،ڈاکٹر کامران کاظمی ،ڈاکٹر مجاہد عباس،ڈاکٹر منور ہاشمی،ڈاکٹر سید عون ساجد،ڈاکٹر محمد نوید،ڈاکٹر نثار ترابی،ڈاکٹر طاہر نواز ،ڈاکٹر غلام فرید ،ڈاکٹر محمد ایوب صابر اور ڈاکٹر ضیاء الحسن وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد نے زیادہ عرصہ اندرون اور بیرون ملک مختلف یونیورسٹیوں میں ادبی تحقیق کو پروان چڑھایا۔"اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" ان کا خاص تحقیقی کام ہے۔ڈاکٹر ظفر اقبال جامعہ کراچی میں تحقیق اور تدریس ادب میں مصروف رہے۔وہ وفاقی اردو یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ بھی رہے۔ڈاکٹر یوسف خشک نے "اُردو سندھی کے ادبی روابط" کے حوالے سے تحقیقی کام کیا۔سندھ یونیورسٹی جامشورو سے منسلک ڈاکٹر جاوید اقبال نے "مکتوبات امیر مینائی" کا تحقیق مطالعہ پیش کیا۔سندھ یونیورسٹی سے مرزا سلیم بیگ نے بھی تحقیقی مضامین لکھے۔ڈاکٹر قاضی عابد نے اردو افسانے کا اساطیر کی روشنی میں تحقیقی جائزہ لیا۔ڈاکٹر راشد حمید مقتدرہ قومی زبان حالیہ ادارہ فروغ قومی زبان میں بطور ڈی جی کام کر رہے ہیں۔انھوں نے اقبال کے حوالے سے تحقیقی کام کیا ہے۔پروفیسر فتح محمد ملک، تجمل شاہ اور سید سردار احمد پیرزادہ نے اُردو پنجاب میں،سندھ میں،اباسین میں،کشمیر میں،کے حوالے سے 5 جلدیں مرتب کیں۔ڈاکٹر محمد آصف اعوان نے اقبال کے خطبات کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ڈاکٹر ارشد اویسی نے مختلف قانون ساز اسمبلیوں میں اردو کے حوالے سے تحقیق کا ڈول ڈالا۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے پاکستانی ادب کے حوالے سے کتاب شائع کی۔خواتین محققین میں ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر تنظیم الفردوس،ڈاکٹر سعدیہ طاہر،ڈاکٹر فردوس انور قاضی،ڈاکٹر صوفیہ خشک،ڈاکٹر روبینہ رفیق، ڈاکٹر عظمیٰ فرمان،ڈاکٹر فہمیدہ تبسم،ڈاکٹر زینت افشاں،ڈاکٹر عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر طاہرہ اقبال،ڈاکٹر فرحت جبین ورک ،ڈاکٹر ناہید قمر اورڈاکٹر صدف نقوی، جیسی خواتین نے بھی تحقیق کے خارزار میں قدم رکھا۔بیرون ملک اردو محققین کے حوالے سے بھی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔جن میں ڈاکٹر اے بی اشرف،ڈاکٹر خلیل طوقار، ڈاکٹر جلال سویدن،ڈاکٹر آرزو،ڈاکٹر سلیم ملک،ڈاکٹر محمد کیومرثی،ڈاکٹر علی بیات کے علاوہ بے شمار نام شامل ہیں۔

ساقط المعیار کاموں کے انبار میں معیادی تحقیقی کاموں کی تعداد کم ضرور ہوتی ہے لیکن قابل قدر ضرور ہے۔ پاکستانی جامعات میں تحقیق کی راہ میں بڑی مشکلات ہیں ۔مسائل کی زیادتی اور وسائل کی کمی ہے ان بے شمار کوتاہیوں،نارسائیوں اور خامیوں کے باوجود جامعات نے ادبی تحقیق کی روایت کو پروان چڑھایا ۔ اگر جامعات کی تحقیقات میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ جامعات نے کچھ کام نہیں

کیا۔ آج جامعات میں اردو زبان وادب کے مختلف اور متنوع موضوعات پر جس رفتار سے کام ہو رہا ہے اس سے ایک بہتر روشن مستقبل کے امکانات موجود ہیں۔

حوالہ جات

1۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2012ء، ص:76
2۔ محمد برہان الحق، قائد اعظم اور اردو زبان، کالم۔ مطبوعہ: پریس فار پیس فاؤنڈیشن، لندن، 31 دسمبر: 2022ء
3۔ مالک رام، اردو میں تحقیق: مجموعہ مقالات، رہبر تحقیق، اُردو سوسائٹی، لکھنؤ، 1972ء، ص:55
4۔ عبدالستار، ڈاکٹر، تحقیق و تنقید، مشمولہ: ادبی و لسانی تحقیق، بمبئی یونیورسٹی، 1984ء، ص:177
5۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، ص:11
6۔ اے ایس بھٹی، GEM DECTIONARY، اظہر پبلشرز، لاہور، 2016ء ص:360
7۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اُردو میں اصول تحقیق، اُردو اکیڈمی، لاہور، 2012ء، ص:8
8۔ عبدالحمید خان عباسی، ڈاکٹر، اصول تحقیق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2012ء، ص:77
9۔ عبدالستار دہلوی، ادبی لسانی تحقیق: اصول طریق کار، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی، 2016ء، ص:8
10۔ نجم الحسن، ڈاکٹر، تحقیق کے روایتی اسلوب، مرتبہ: اعجاز الٰہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986، ص:147
11۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، ص:17
12۔ گیان چند، تحقیق کا فن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص:23
13۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اُردو میں اصول تحقیق، ص:9
14۔ القرآن الکریم، تاج کمپنی لمٹڈ، لاہور، پارہ:26، آیت نمبر:6
15۔ مسلم بن حجاج، امام، صحیح مسلم، خالد احسان پبلشرز، لاہور، 2012ء، حدیث نمبر:156
16۔ فہیم عثمانی، مولانا، حفاظت و حجیت حدیث، دارالکتب، لاہور، 1979ء، ص:237
17۔ ایضاً، ص:238
18۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1998ء، ص:47

19۔ سلطانہ بخش،ڈاکٹر،اُردو میں اصول تحقیق،ص:192

20۔ فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،ادبیات و شخصیات،پروگریسو بکس،لاہور،1993ء،ص:14

21۔ ابن کنول، تحقیق و تدوین، کتابی دنیا، دہلی،2006،ص:276

22۔ خالد ندیم، پروفیسر، مظہر محمود شیرانی کی باتیں، ادبی ایڈیشن:روزنامہ نوائے وقت،اسلام آباد، اکتوبر،2003ء

23۔ صدیق شبلی،ڈاکٹر،اقبال یورپ میں:ایک مطالعہ، مشمولہ:افکار، کراچی،1987ء،ص:25

24۔ احسان اللہ،ڈاکٹر، تعلیمی تحقیق اور اس کے اصول و مبادی، میاں چیمبر،لاہور1991ء،ص:78

25۔ سلطانہ بخش،ڈاکٹر،اُردو میں اصول تحقیق،ص:9

26۔ احسان اللہ،ڈاکٹر، تعلیمی تحقیق اور اس کے اصول و مبادی،ص:92

27۔ علامہ اقبال،ڈاکٹر،کلیات اقبال:بال جبریل، مکتبہ جمال،لاہور،2005ء،ص:737

باب دوم:

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ

(افکار کے تناظر میں)

کسی بھی قوم کی ترقی کا راز اس کی بہتر تعلیمی شرح میں ہے اور بہتر تعلیمی شرح کا حصول اس کی اپنی مادری اور قومی زبان ہی میں ممکن ہوتا ہے ۔پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے۔اُردو زبان میں تعلیم و تدریس کے ذریعے سے معاشرے میں نہ صرف یکجہتی کو فروغ دیا جاسکتا ہے بلکہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں بھی اپنی جگہ بنائی جاسکتی ہے۔اُردو زبان کی ترقی کے لیے انفرادی و اجتماعی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔اُردو کے فروغ میں شخصیات کے ساتھ ساتھ مختلف ایسے ادارے بھی قائم ہیں جو اپنی قومی زبان کے فروغ میں ہمہ وقت مصروف عمل ہیں۔ان اداروں میں پاکستانی جامعات بھی شامل ہیں جنہوں نے اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔پاکستان میں اس وقت جامعات کی تعداد اب دو سو پچاس کے قریب ہے ،ان میں سرکاری اور نجی جامعات دونوں شامل ہیں۔پاکستان کی کئی جامعات میں اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ان شعبوں میں اساتذہ، طلبا و محققین اُردو کے فروغ میں مصروف عمل ہیں۔ایم فل اور پی ایچ ڈی کے پروگراموں میں طلبا مختلف موضوعات پر تحقیق کر رہے ہیں جو اُردو کے ذخیرے میں اضافے کا باعث ہے۔زیر نظر مقالے کے موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے ذیل میں پاکستانی جامعات کے پی ایچ ڈی اُردو سطح کے 2010ء کے بعد تحریر کئے گئے مقالہ جات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ افکار کے تناظر میں پیش کیا جاتا ہے۔ان افکار میں معاصر فکریات اور معاصر تنقیدی نظریات وغیرہ شامل ہیں۔

معاصر فکریات:

معاصر ادبی فکریات میں مذہب،مابعد الطبیعات،اخلاقیات،سیاست،معیشت،معاشرت اور نفسیات وغیرہ شامل ہیں۔ان معاصر ادبی افکار میں مذہب کو اولیت حاصل ہے۔مختلف مقامات اور ادوار میں مذہب پر غور وفکر بھی کیا گیا اور ذہنی ارتقاو دنیاوی ضروریات کے لحاظ سے اختلافات بھی پیدا ہوتے رہے لیکن خدا کو خدا اور انسانوں کو انسان سمجھنے کی صلاحیت کم و بیش ہر جگہ موجود رہی۔مذہب کو اثر انگیز بنانے کے لئے مختلف طریقے اپنائے گئے، جن میں سب سے زیادہ کار آمد طریقہ اظہار خیال کے لئے الفاظ و زبان کا استعمال تھا۔زبان وبیان کے وجود میں آتے ہی مذہب کی ترویج و تبلیغ میں نمایاں اضافہ ہوا۔مذہب کی ترویج کے لیے زبان

وبیان نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ زبان وبیان، وعظ و نصیحت یا تبلیغ کسی زبان یا بولی کی صورت میں پیش کیے جاتے تھے جو ادب کے بنیادی لوازمات میں شامل ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب ہر دور میں مذہب کی خدمت کرتا رہا ہے۔ ادب نے مذہب کی تعریف و تشریح، اس کے قوانین کی اشاعت وغیرہ کو شاعرانہ اور نثری دونوں انداز میں رنگین اور دلچسپ طریقے سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان مذہبی افکار کو پاکستانی جامعات نے تحقیق و تنقید کی نظر سے دیکھا اور جامعات کے محققین نے ان پر اپنے تحقیقی و تنقیدی مقالات تحریر کیے۔ ان مقالات سے بھی مذہبی افکار کے فروغ میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ ذیل میں 2010ء کے بعد پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے تناظر میں مذہبی موضوعات پر لکھے گئے پی ایچ ڈی مقالہ جات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو تراجم قرآن کے اسالیب منتخب اور نمائندہ تراجم کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ"

مقالہ نگار: روبینہ سرور

نگران مقالہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، 2014، یونیورسٹی آف کراچی۔

درج بالا مقالہ ایک علمی موضوع ہے۔ اس مقالے کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے مقالہ نگار نے کتب، جرائد، اخبارات، لائبریروں اور انٹرنیٹ وغیرہ سے مدد لی۔ مقالہ نگار کے مطابق قرآن دینی و دنیاوی تعلیمات کا مفصل مجموعہ ہے، اس کی خوبی ہے کہ یہ انسانوں کو تفکر، تدبر اور تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے۔ دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں تراجم قرآن ہو چکے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں شاہ ولی اللہ کے دور میں فتح الرحمن کے فارسی ترجمہ قرآن نے ترجمے کی روایت قائم کی جو تاحال جاری ہے۔ ان تراجم نے اس خطے کے مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس مقالے میں اسی روایت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کے تراجم کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اس تحقیقی مقالے میں منتخب قرانی تراجم کا تحقیقی و تجزیاتی جائزہ ملتا ہے۔ مقالہ نگار نے پہلے باب میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے تراجم کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ باب دوم میں اُن کے ہم عصر مراد سنبھلی، حکیم محمد شریف اور نواب قطب دہلوی کے تراجم کو پیش کیا۔ مقالے کے تیسرے باب میں اردو ادب کی معروف شخصیات سید احمد خان اور مولوی نذیر احمد کے تراجم و تفسیر پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ شامل ہے۔ سر سید احمد خان کے دور کے بارے میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"سید احمد خان کے تصنیفی دور میں ترجمہ و تفسیر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نذیر احمد نے دہلی کی ٹکسالی زبان اور ناولوں کی محاوراتی زبان کو ترجمہ میں استعمال کر کے تشریح کے نئے زاویے بھی متعارف کروائے"۔(1)

باب چہارم میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف تک اہم تراجم کا جائزہ شامل ہے۔اس باب میں جن علما کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں مولانا عبد الحق حقانی، مولانا حیرت دہلوی، مولانا فتح محمد جالندھری، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحسن، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا عبد الماجد دریابادی وغیرہ شامل ہیں۔ مقالے میں اُن علما و صوفیا کو بھی شامل کیا گیا ہے جنھوں نے قیام پاکستان کے بعد تفسیر قرآن میں نمایاں کام کیا۔ ان حضرات میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا امین اصلاحی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع وغیرہ نمایاں ہیں۔

موضوع مقالہ: "انیسویں صدی کے علمائے اہلسنت کی ادبی خدمات"

مقالہ نگار: شذرہ

نگران مقالہ: ڈاکٹر تنظیم الفردوس 2013ء، جامعہ کراچی، کراچی

مذکورہ مقالے میں مقالہ نگار نے انیسویں صدی عیسوی کے اہل سنت کے مختلف مکاتب فکر کے علمائے دین کی اردو خدمات کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد اردو ادب میں ان کی اہمیت و مرتبے کا تعین کیا ہے۔ اس مقالے کے سات ابواب بنائے گئے ہیں۔ باب اول کے نمایاں موضوعات میں اہل سنت کے لغوی و اصطلاحی معنی، قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں لفظ سنت کا استعمال، سنت کے شرعی و اصطلاحی معنی، اہل سنت کی اصطلاح کے استعمال کا آغاز، اہل اسلام میں فرقہ بندی اور اہل سنت میں گروہ بندی کا آغاز، اہل سنت میں فقہی تعبیر و تشریح میں اختلافات اور فقہ حنفی میں مختلف مکاتب فکر کا وجود پذیر ہونا وغیرہ شامل ہیں۔ مقالہ نگار نے اس باب میں اہل سنت کے تین اہم مکاتب فکر کا تعارف کراتے ہوئے ان کے بنیادی عقائد کو بھی بیان کیا ہے۔ تحقیقی مقالے کا باب دوم انیسوی صدی کے ہندوستان کی سیاسی، تعلیمی، معاشی اور مذہبی صورتحال کا احاطہ کرتا ہے جبکہ باب سوم میں ۱۸۰۱ء سے ۱۸۵۷ء تک منتخب علمائے اہل سنت کی اردو خدمات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم بریلوی مکتبہ فکر کے علمائے کرام کی اردو خدمات کا احاطہ کرتا ہے جبکہ باب پنجم علمائے اہل حدیث کی اردو خدمات پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں دیوبند علما کی اردو خدمات کا تجزیہ شامل کیا گیا ہے۔ مقالے کا ساتواں باب "ماحصل" پر مشتمل ہے۔ اس میں حاصلات پر بحث کر کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

موضوع مقالہ: "ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر: سقوط دلی تا سقوط ڈھاکہ "

مقالہ نگار: محمد طاہر قریشی

نگران مقالہ: ڈاکٹر تنظیم الفردوس، 2013ء، جامعہ کراچی، کراچی

خدائے بزرگ و برتر نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو انسانیت کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیا۔ آپ ﷺ نے ہر قسم کی باطل عصبیتوں کا خاتمہ کر کے صرف کلمے کی بنیاد پر ایک عالم گیر ملت کی تشکیل و تجسیم کی جس میں کسی بھی قسم کی عصبیت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ملی شاعری ملت اسلامیہ اور اس کے معاملات سے عبارت ہے، اس لیے منطقی طور پر ملی شاعری کا محور و منبع بھی صرف آپ ﷺ ہی کی ذات گرامی ہو سکتی ہے۔ اردو کے ملی شعرا اس حقیقت سے باخبر ہیں، اسی لیے ان کی شاعری کا اساسی عنصر بلاواسطہ اور بالواسطہ سرور کائنات ﷺ کا حوالہ مبارک ہے جسے انھوں نے جابجا اور مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملی شاعری میں نعتیہ عناصر کی موجودگی ایک ناگزیر عنصر ہے۔ مذکورہ بالا مقالہ ملی شاعری میں ان ہی نعتیہ عناصر کی تلاش و جستجو پر محیط ہے۔ مقالہ نگار نے اس مقالہ کو تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ملت، امت اور قوم کی تعریف اور تصریحات پر بنی ہے۔ ملی شاعری کیا ہے؟ اس کی وضاحت کی گئی ہے اور اس کے آغاز کے بارے میں بعض حقائق دریافت کیے گئے ہیں۔ اسی ضمن میں وطن اور قومی شاعری کے مباحث بھی آگئے ہیں۔ دوسرے باب میں نعت اور نعتیہ عناصر کی توضیحات کی گئی ہیں اور لفظ "نعت" کے اصطلاحی معنوں میں اولین استعمال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل کی ملی شاعری میں نعتیہ موضوعات کو تلاش کیا گیا ہے۔ دکنی دور سے لے کر اٹھارویں صدی کی تحریک جہاد تک کے دوران لکھی گئی منظومات کا احاطہ بھی اسی باب کا حصہ ہے۔ باب چہارم میں جنگ آزادی کے ملی شاعری پر اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مجاہدین کی ابتدائی کامیابیاں ہوں یا سقوط دلی کا سانحہ، ملی شاعری میں نعتیہ عناصر کس کس پیرائے میں آئے ہیں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں باب کا تعلق ملی شاعری کے دور جدید سے ہے جس کا آغاز الطاف حسین حالی سے ہوتا ہے جنھوں نے مسلمانان ہند کے منفرد اور علیحدہ ملی تشخص کا باآواز بلند اعلان کیا۔ "مسدس مد و جزر اسلام" جیسی لازوال اور دیگر منظومات میں ہادی عالم ﷺ کے ابدی پیغام کو حالی نے جس فنی مہارت اور شعری نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شبلی، اکبر الٰہ آبادی، ڈپٹی نذیر احمد اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعرا کی نظموں میں بھی نعتیہ عناصر تلاش کیے گئے ہیں۔ چھٹے باب میں بیسویں صدی

کے ابتدائی برسوں کے دوران کی گئی ملی شاعری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔اس دور کے حوالے سے مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

> "اس دور میں برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کو متعدد ایسے مسائل اور معاملات سے گزرنا پڑا جن کے اثرات دور رس اور ہمہ گیر تھے۔ مثلاً بنگال کی تقسیم، تنسیخ، مسلم لیگ کا قیام، مسجد کانپور کا حادثہ، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، شدھی اور سنگھٹن کے ہنگامے، قادیانیت کا فتنہ، نہرو رپورٹ، قائداعظم کے چودہ نکات اور علامہ اقبال کا خطبہ الہٰ آباد وغیرہ کا تعلق تو براہ راست ہندوستان کی دھرتی سے تھا"۔(2)

ان کے علاوہ بعض ایسے معاملات بھی تھے جن میں مسلمانان ہند نے محض اپنی ملی عصبیت کی خاطر نہایت زور و شور سے حصہ لیا تھا۔ حالانکہ زمینی لحاظ سے ان مسائل و معاملات کا منبع بیرون ہند کی ملت اسلامیہ سے تھا۔ مثلاً اٹلی کا طرابلس پر حملہ، بلقان کے خلاف ترکی کی جنگ، تحریک اتحاد اسلامی، انجمن خدام کعبہ، تحریک ریشمی رومال، تحریک ہجرت اور تحریک خلافت وغیرہ۔ اس ہیجانی دور میں مولانا ظفر علی خان، محمد علی جوہر، زاہدہ خاتون شروانیہ (ز-خ-ش۔)، میر غلام بھیک نیرنگ، شاد عظیم آبادی، عبدالمجید سالک، افق کاظمی امروہوی، خوشی محمد ناظر، سیماب اکبر آبادی اور چند دوسرے بزرگوں نے ملت کی ترجمانی کرتے وقت صاحب ملت ﷺ کے ذکر مبارک کو کس متنوع انداز میں پیش کیا ہے،اس مقالے میں اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں مقالہ نگار نے اُردو کے سب سے اہم ملی شاعر علامہ اقبال کی اُن ملی خدمات کو جو انھوں نے بذریعہ شعر و سخن انجام دیں، موضوع گفتگو بنایا ہے۔ خصوصاً اقبال نے حوالہ رسول کریم ﷺ کو عاشقانہ سرمستی اور فلسفیانہ استدلال دونوں کے ساتھ جس طرح آمیز کر کے پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مقالہ نگار نے مذکورہ باب میں اس بات کا بھی جائزہ لیا ہے کہ باوجود اس کے کہ اُن کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر تعداد کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہیں، آخر کیا وجہ ہے کہ ان کا شمار نعت کے معروف شعرا میں بھی کیا جاتا ہے ؟۔ آٹھواں باب تحریک پاکستان کے آخری آٹھ دس برسوں میں حصول آزادی کی جدوجہد کی روداد ہے۔ مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ ارضی کے حصول میں سخن وروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" اور "پاکستان کا مطلب کیا-لاالہ الااللہ" جیسے نعرے ایسے ہی فکرِ رسا اور اپنے ملی تشخص

پر کامل یقین رکھنے والے شعرا کی بدولت وجود میں آئے جنھوں نے مختصر اور آسان زبان میں پاک وہند کے طول و عرض میں بسنے والے مسلمانوں کو ملت کا مفہوم صرف سمجھایا ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں اتار بھی دیا۔

اس مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ہنگامہ سے معرض وجود میں آنے والی ملی شاعری کا انداز فطری طور پر رجزیہ ہے۔ تحریک اور جوش و جذبے سے بھرپور ملی نغموں، ترانوں اور منظومات میں اپنے منفرد ملی تشخص کا ایک بار پھر بیانگ دہل اعلان ہوا اور اس کے لیے شعرا نے قدم قدم پر فاتح بدر و حنین ﷺ کا سہارا لیا ہے۔ اس دور کی شاعری میں نعتیہ عناصر کی بہتات اور تنوع کا مطالعہ دسویں باب میں کیا گیا ہے۔

مقالہ نگار نے گیارھواں باب "سانحہ بیت المقدس" کے لیے مخصوص کیا ہے۔ قبلہ اول کے قبضہ اغیار میں جانے اور بعد میں مسجد اقصیٰ میں آگ لگنے کے سانحے نے ملی شاعروں کو آتش زیر پا کر دیا تھا۔ یہ اشتعال ان کی شاعری میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کیفیات کے تحت ہونے والی ملی شاعری میں شاعروں کا روئے سخن بار ہا اور بجا طور پر مقتدائے انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب رہا۔ اس باب میں ملی شاعری کا جائزہ اسی تناظر میں لیا گیا ہے۔ سقوط مشرقی پاکستان سے پہلے ہی شعرائے کرام آئندہ پیش آنے والے المیے پر وقتاً فوقتاً اپنی تشویش کا اظہار بھی کرتے رہے تھے اور مستقبل کے بارے میں ارباب اختیار کو متنبہ بھی کر رہے تھے۔ نیز پاک بھارت جنگ ۱۹۷۱ء کے دوران بھی شاعر اپنے جذبہ ملی کے ہاتھوں مجبور ہو کر محاذ سخن پر ڈٹے رہے اور سقوط کے بعد بھی اپنے غم و غصے کا بزبانِ شعر اظہار کرتے رہے۔ بارھویں باب میں ایسی ہی ملی شاعری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جس میں ملی شعرا کی تشویش و انتباہ اور نالہ و فریاد سے لبریز شاعری میں تذکرہ محبوب خدا ﷺ سے کس قدر اعتنا کیا گیا ہے۔ آخری باب میں "ماحصل" کے عنوان سے پورے مقالے سے حاصل شدہ نتائج کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "اردو مرثیہ شناسی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "

مقالہ نگار: سیدہ مصباح رضوی

نگران مقالہ: ڈاکٹر سید مرتضیٰ زیدی، 2012ء، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی مرثیہ گوئی کا آغاز ہو گیا تھا جو کہ آج تک اردو شاعری میں ایک صنف سخن کر طور پر موجود ہے۔ مرثیے کا عمومی موضوع واقعہ کربلا ہے۔ اس کی ہیت اور اجزائے ترکیبی ہمیشہ

سے تغیرات کا شکار رہے ہیں۔ قدیم شاعری میں شعرا کو اختیار حاصل تھا کہ وہ مفرد، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند غرض جس صورت میں چاہتے مرثیہ کہتے ۔ جب مرثیہ دکن اور دہلی سے ہوتا ہوا لکھنو میں میر ضمیر کے عہد تک پہنچا تو اس کی ہیت اور اصول وضوابط مقرر کر دیئے گئے۔ جوش ملیح آبادی اور ان کے ہم عصر شعرانے مرثیے کے داخلی اور خارجی عناصر کو توڑ پھوڑ کر اس کی نئی صورت پیش کی جس کو جدید مرثیہ کے نام سے پکارا گیا۔ مجموعی طور پر مرثیہ میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد سے مختلف صورت اختیار کر گیا۔ قدیم دور ہو یا جدید، مرثیہ نگاری ہر دور میں نمایاں صنف سخن کے طور پر موجود رہی۔ محققین اور ناقدین نے دیگر اصناف ادب کی طرح صنف مرثیہ کو تنقید اور تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس موضوع پر کئی کتابیں، مضامین، رسائل اور تحقیقی و تنقیدی مقالے سامنے آئے۔ مذکورہ بالا مقالہ نگار نے اپنے تحقیقی مقالے میں اردو مرثیے اور مرثیہ نگاروں پر لکھی جانے والی مطبوعہ کتب کا تجزیہ کیا ہے۔ اردو تذکروں سے لے کر آج تک سینکڑوں ایسی تنقیدی اور تحقیقی کتب سامنے آچکی ہیں جس میں مرثیہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں ان تمام شائع شدہ کتب کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا براہ راست موضوع مرثیہ یا مرثیہ نگار ہیں۔ ان کتابوں میں مرثیے کی تاریخ اور مرثیہ نگاروں کے بارے میں لکھی گئی کتابیں بھی شامل ہیں اور ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جن میں مرثیے کے موضوع پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

یہ مقالہ چھ بنیادی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں صنف مرثیہ کو موضوع بنا کر جو تحقیقی اور تنقیدی کتب وغیرہ سامنے آئی ہیں اُن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں قدیم مرثیہ نگاروں سے لے کر مرزا دبیر تک کے تمام مرثیہ نگاروں پر مرثیہ شناسوں نے جو کچھ لکھا، اس کا جائزہ شامل کیا گیا ہے۔ میر انیس اردو مرثیے کے صف اول کے شاعر ہیں۔ ان کے مرثیے ادبی محاسن سے بھی مالا مال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ شناسوں کا رجحان میر انیس کی مرثیہ نگاری کی طرف نمایاں رہا۔ باب سوم میں میر انیس کے حوالے سے ہونے والے کام کا احاطہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ میر انیس اردو مرثیے کے بے تاج بادشاہ تھے مگر اردو مرثیے کو میر انیس کے بعد بھی ایسے باکمال شعرا میسر آئے جنھوں نے اپنے فکر و فن کی مدد سے مرثیے کی وسعتوں میں اضافہ کیا اور اس کو اپنے دور کی دوسری اصناف کے مقابلے میں قائم و دائم اور مقبول بنائے رکھا۔ باب چہارم میں میر انیس کے عہد کے مرثیہ نگاروں سے لے کر جوش سے پہلے تک کے ان تمام مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن پر مرثیہ شناسوں نے تنقیدی اور تحقیقی کام کیا ہے۔ اس باب میں شعرا کی زمانی ترتیب کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ جدید مرثیہ نگاری کا رجحان بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے نظر آنے لگا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ رجحان اتنی

تقویت حاصل کر گیا کہ اس دور کے مرثیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد اس سے متاثر نظر آئی۔ مرثیہ شناسوں نے اس دور کو "جدید مرثیہ نگاری" کے نام سے موسوم کیا۔ باب پنجم میں اس دور کے تمام شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جن کو مرثیہ شناسوں نے ان کے کام کی وجہ سے اہمیت دی اور اپنی تنقید و تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں جدید مرثیے کے موضوع پر مباحث کو شامل کرنے کے علاوہ ایسے مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے موضوع پر کم از کم ایک مکمل کتاب ضرور موجود ہے۔ دوسرے حصے میں جدید مرثیے کے دیگر شعرا کا ذکر زمانی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ مقالے کا آخری باب گذشتہ ابواب کے مجموعی جائزے پر مبنی ہے جس کے مطالعہ کے بعد اردو مرثیہ شناسوں کی تنقیدی و تحقیقی کاوشوں کے معیار اور مقدار کا تعین کیا گیا ہے۔

موضوعِ مقالہ: " خیبر پختونخوا میں اردو مرثیے کی روایت۔1947 ء تا2016ء: نمائندہ شعرا کی روشنی میں "

مقالہ نگار: شیر بالی شاہ،2017ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر بادشاہ منیر، پشاور یونیورسٹی، پشاور

صوبہ خیبر پختون خوا اُردو زبان و ادب کی خدمت میں دیگر بڑے مراکز لکھنو، دہلی، کراچی اور لاہور سے کسی طور پیچھے نہیں رہا۔ یہاں مختلف ادوار میں قد آور شخصیات نے مختلف اصناف میں نام کمایا جن میں قاسم علی خان آفریدی، بیدل پشاوری، میر ولی اللہ ایبٹ آبادی، جگر کاظمی، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، احمد فراز، غلام محمد قاصر، پروفیسر طٰہٰ خان اور مقبول عامر وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ صوبہ خیبر پختون خوا میں ناول، افسانہ، طنز و مزاح، نعت، غزل، نظم، گیت ایسی اصناف ہیں جن پر تحقیقی کام جاری ہے۔ اس خطے میں مرثیہ نگاری کی روایت بھی موجود رہی ہے۔ مقالہ نگار نے "خیبر پختون خوا میں اردو مرثیہ کی روایت" کے موضوع پر پی ایچ۔ڈی کا تحقیقی مقالہ اسی روایت کے پس منظر میں تحریر کیا ہے۔

یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں مرثیہ کی تعریف، ہیت، موضوع، بحور، اُردو مرثیے کی ابتدا تا ریخ، اُردو مرثیے کا پاکستانی دور، صوبہ خیبر پختون خوا میں اُردو شعری ادب کی عمومی بحث، مرثیہ نگاری کی ابتدا اور پھر قاسم علی خان آفریدی سے لے کر فارغ بخاری تک کربلائی و شخصی مرثیہ نگار شعرا کا تعارف اور ان کے رثائی کلام پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ باب دوم 1947ء سے 1980ء تک چونتیس سالہ عرصے پر محیط ہے جس میں علی الترتیب سات شعراء" مرزا محمود سرحدی، احمد فراز، شوکت واسطی، قتیل

شفائی، جلیل حشمی، غلام محمد قاصر اور مشتاق مولائی کے اکتیس (۳۱) شعری مجموعوں میں موجود کربلائی اور شخصی رثائی کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔باب سوم ۱۹۸۱ءسے ۱۹۹۰ءکے دس سالہ عرصہ پر محیط ہے جس میں علی الترتیب دس شعراء "سعید احمد اختر، جعفر علی جعفری، خاطر غزنوی، خاور احمد ، محسن احسان، طاہر کلاچوی، طارق ہاشمی، فطرت قریشی، محبت خان بنگش اور مقبول عامر" کے اُنیس شعری مجموعوں میں موجود کربلائی اور شخصی رثائی کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔باب چہارم میں صوبہ خیبر پختون خوا میں اُردو مرثیے کا تیسر دور ۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۱ءپر مشتمل ہے۔اس باب میں علی الترتیب دس شعرا" احمد فواد، محسن عمرانی، ابراہیم فانی، امجد بہزاد، ابرار سالک، نذیر اشک ، تاج سعید ، غفار بابر ، شہاب صفدر اور جمشید نایاب کے اٹھارہ شعری مجموعوں میں شامل کربلائی اور شخصی رثائی کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔مقالے کا باب پنجم ۲۰۰۲ء۔۲۰۱۶ء کے عرصے پر مشتمل ہے۔مرثیے کے اس پندرہ سالہ دور میں علی الترتیب تیرہ شعرا" ظاہر شیرازی، سلطان مجاہد، یوسف رجا چشتی، نذیر تبسم ، شجاعت علی راہی، محمد طٰہٰ خان، اسلم فیضی، عبد اللہ یزدانی، فقیرا خان فقری ،انور بابر، قیصر نجفی، ارشاد شاکر اعوان اور سبز علی شہزاد کے انیس شعری مجموعوں میں موجود کربلائی اور شخصی رثائی کلام کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔باب ششم حاصل تحقیق پر مشتمل ہے۔اس میں سابقہ پانچوں ابواب کی تفصیلات کے اجمال کو جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان ابواب میں شعرا کی زمانی ترتیب، ان کے پہلے شعری مجموعے کے سن اشاعت کے اعتبار سے طے کی گئی ہے اور جہاں ایک ہی سال میں ایک سے زائدہ مجموعے سامنے آئے ہیں تو پھر ان مخصوص شاعروں کو ان کے ناموں کی الف بائی ترتیب کے اعتبار سے شامل فہرست کیا گیا ہے۔

اس مقالہ میں کربلائی مراثی کا جائزہ لیتے وقت سلام،نوحہ اور دیگر شعری اصناف (جن میں واقعہ کربلا کو موضوع بنایا گیا ہے) کا جائزہ لیا گیا ہے۔جب کہ شخصی مراثی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی ذیلی اقسام ذاتی اور شخصی کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔مقالہ میں ہر دور کے مرثیہ گو شعرا کا پہلے سوانحی کوائف اور اس کے بعد ان شعرا کے تخلیق کردہ مراثی کا فنی و فکری تجزیہ کیا گیا ہے۔مقالہ نگار نے اس مقالہ میں خیبر پختون خوا میں اُردو مرثیے کی روایت کا جائزہ لیتے ہوئے صرف مرد شعرا کے مطبوعہ مراثی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے جبکہ شاعرات کے مراثی کو شامل نہیں کیا گیا۔اس مقالے میں خیبر پختون خوا کے اُردو مرثیے کے صرف نمائندہ اور اہم شاعروں کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔اس مقالہ میں چالیس شعرا کے ستاسی شعری مجموعوں

میں موجود رثائی کلام کا تفصیلی تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں ہر شاعر کی انفرادیت کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

موضوعِ مقالہ: "اُردو غزل میں غیر اسلامی تصورات کا نفوذ"

مقالہ نگار: غلام فاروق، 2021ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر محمد احسان الحق، سرحد یونیورسٹی، پشاور

اردو ادب میں بعض شعرا نے شعرا نے اپنے اشعار میں عقائد اسلام اور شعائر اسلام کی توہین کی، حلال کو حرام جانا اور حرام اشیا کی لطف لے لے کر تعریف و توصیف کی اور یوں بحیثیت مجموعی اسلام کی تعلیمات کا مذاق اُڑایا۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے غزل گو شعرا کے اشعار میں موجود ایسے تصورات زیر بحث لائے ہیں جو ایمانیات اور بنیادی اسلامی تصورات سے متصادم تھے یعنی یہ موضوع در حقیقت ایک بین العلومی (اردو غزل اور اسلامیات) پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگار اس مقالہ کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

> "اس کی موضوعاتی تحدید یہ ہے کہ کسی بھی زمانے کا غزل گو شاعر اگر اپنے اشعار میں غیر اسلامی افکار پیش کر چکا ہو تو ان کے ایسے اشعار کی نشان دہی کی جائے گی اور اسلامی نقطہ نظر سے ان پر تنقید کی جائے گی"۔(3)

بعض شعرا یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ادب اور شاعری پر اسلام کے شرعی قوانین لاگو نہیں کیے جا سکتے اس لیے شعائر اسلام کا مذاق اُڑانے کے باوجود بھی شعرا مجرم نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔ حالانکہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں ہدایات فراہم کرتا ہے لہذا ادب اور منظوم کلام کو بھی شریعت کی پابندی سے آزاد نہیں قرار دیا جاسکتا۔ در حقیقت شعرا اپنے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں لہذا جس معاشرے میں شعرا زندگی بسر کرتے ہیں، اس میں رائج عقائد اور تصورات کا اثر شعرا کے دل و دماغ پر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ان افکار و تصورات کو شعرا اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں لہذا ان کے اشعار میں جو غیر اسلامی تصورات پائے جاتے ہیں وہ دراصل متعلقہ معاشرے کا عکس ہوتا ہے۔ مثلاً ہندو معاشرے میں رہنے والے مسلمان شعرا نے لاشعوری طور پر بعض ایسے افکار اپنائے جو ہندو مت کا حصہ تھے۔ اس طرح حکمران طبقے نے بھی بعض حرام اشیا مثلاً شراب کے فوائد کے بیان کو ضروری سمجھا۔ لہذا شعرا نے متاثر ہو کر حکمرانوں کی خواہشات کی پاسداری کی۔ ان حکمرانوں کے زیر اثر نام نہاد مولویوں نے بھی اصل حقائق کو سامنے لانے کی سعی نہیں کی بلکہ مصلحتوں سے کام لیا۔ مذہبی تقریبات میں ان مولویوں کی موجودگی میں شعرا نے ہر قسم کے رطب و یابس

کو اپنے اشعار میں بیان کر کے ایک لحاظ سے مولویوں سے اجازت نامہ حاصل کیا اور یوں شعرا کو خرافات بیان کرنے کا حوصلہ ملا۔ بعض غیر مذہب والوں بالخصوص یہودیوں نے مختلف قسم کی سازشوں سے مسلمانوں میں اعتقادی انحطاط پیدا کیا، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں باطل فرقے پیدا ہوئے اور ان فرقوں نے دین سے بے خبر شعرا کی ہمت افزائی کر کے اپنے باطل نظریات ان کے ذریعے پھیلائے۔ اسی طرح جو شعرا ترقی پسند نظریے سے متاثر ہوئے تو وہ بھی ان نظریات کے پھیلانے کو اپنے فرائض کا حصہ جاننے لگے اور نتیجتاً اسلامی عقائد اور اخلاقیات کے خلاف پرچار کرنے لگے۔ پس معلوم ہوا کہ مذکورہ انحطاط کا اصل منبع وہ معاشرہ تھا جس کے اندر یہ خرابیاں موجود تھیں اور شعرا بھی اس کا حصہ تھے۔

ان سب اسباب کے علاوہ ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ اسلام کا جزوی پیغام بعض ممالک تک بہت تیزی کے ساتھ پھیلا۔ ان ممالک میں بعض ابتدائی مسلمان پوری طرح اسلام کی تعلیمات سے بہرہ مند نہ ہو سکے اور ایمان کی تفصیلات یعنی قرآن پاک کے معنی و مفہوم اور احادیث کی تشریح کو اس حد تک حاصل نہ کر سکے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی صحبت میں صحابہ کرام حاصل کر چکے تھے، لہٰذا اسلام لانے کے باوجود جلد ہی بعض مسلمان اعتقادی اور عملی خرابیوں میں مبتلا ہونا شروع ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ تھی کہ مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی تعلیمات راسخ کرانے کے بعد خلافت کا دائرہ وسیع کرنا مناسب ہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ کہیں تعداد زیادہ کرنے کی خواہش کی وجہ سے معیار میں کمی واقع نہ ہو جائے۔ اس طرح ان ممالک کے حکمرانوں نے جب مسلمان خلفا کی زندگی گزارنے کا سادہ انداز دیکھا تو وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہو گئے کہ کہیں ان کی عیاشیوں کے دروازے ان پر بھی بند نہ ہو جائیں لہٰذا انہوں نے مسلمان حکمرانوں سے لڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ نتیجتاً خلفائے اسلام کی توانائی ان کی سرکوبی کے لیے صرف ہونے لگی۔

مذکورہ تاریخ کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل میں غیر اسلامی باتیں شامل ہونا صرف شعرا کی غلطیوں کا نتیجہ نہیں بلکہ دراصل معاشرے میں کئی مسائل موجود تھے جو شعرا کو متاثر کرنے کا سبب بنے۔ مقالہ نگار نے اس مقالے میں اُن غیر اسلامی تصورات کی نشان دہی کی جو اُردو کے غزل گو شعرا نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر غزل میں پیش کیے ہیں۔ مقالہ نگار نے ان غیر اسلامی تصورات کی تردید کے لیے قرآن و حدیث کی ہدایات پیش کی ہیں۔ اس حوالے سے یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ بعض اوقات کسی شعر کا ایک مفہوم جائز معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے لیکن جو مفہوم اور تعبیر اس مقالے میں لیا گیا ہے وہ بھی ایک ممکنہ

مفہوم ہے لہذا اس مقالے میں صرف غیر اسلامی مفہوم پر بحث کی گئی ہے اور ظاہر ہے جائز مفہوم کے لیے اُس شعر کی حیثیت جائز ہی رہے گی۔ چونکہ ایمانیات کی حیثیت مقدم ہے اس لیے ایمانیات کو نقصان دینے والے مشکوک امور سے بھی بچنا ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں مشتبہ چیزوں سے بھی بچنے کا حکم آیا ہے۔ البتہ بعض امور جو رسم ورواج کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں موجود ہیں ان کو زیر بحث نہیں لایا گیا ہے کیونکہ ان کا ایمانیات سے کم از کم تصادم نہیں اور نہ ان کے بارے میں قرآن و حدیث میں واضح ممانعت آئی ہے جیسے مہندی اور بارات وغیرہ۔ جو غیر اسلامی تصورات کے حامل اشعار اس مقالے میں نقل کیے گئے ہیں دراصل وہ تمام غزل گو شعرا کی تمام غزلوں سے ماخوذ نہیں بلکہ صرف نمونے کے اشعار بیان کیے گئے ہیں اور ساتھ ساتھ اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کا فرق بھی بیان کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو دونوں تصورات کے مابین فرق معلوم ہو سکے۔

مقالہ نگار نے مقالے کے باب اول میں اسلام کا تعارف پیش کیا ہے تاکہ قاری اسلام کے نیادی عقائد سے باخبر ہو کر اشعار میں موجود غیر اسلامی تصورات کی نشاندہی اور ان پر اسلامی نقطہ نظر سے کی گئی تنقید پر سمجھ سکے۔ لفظ "اسلام" کے معنی اور مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے اور اسلام کے بنیادی عقائد وضاحت کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ یعنی اللہ پر ایمان، ملائک پر ایمان، کتب سماوی پر ایمان، انبیا پر ایمان، یوم آخر پر ایمان اور تقدیر پر ایمان۔ آخر میں شعر و شاعری کی حیثیت بیان کی گئی ہے اور غزل کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اللہ تعالیٰ پر غزل گو شعرا کے ایمان کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ جس میں غزل گو شعرا کے اللہ تعالیٰ کے متعلق خیالات و تصورات کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں خانہ کعبہ کے بارے میں شعرا کے خیالات پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرا باب بنیادی طور پر دو موضوعات سے متعلق ہے یعنی ملائک اور کتب سماوی و سنت نبوی کی تعلیمات سے شعرا کے انحراف کا بیان۔ اس باب میں ملائک کے بارے میں شعرا کے خیالات اور اس کی شرعی حیثیت پر بحث موجود ہے جب کہ قرآن وحدیث سے روگردانی کی صورت میں شعرا کے بعض نامناسب خیالات بھی اس باب میں مذکور ہیں۔ ان میں قسم لغیر اللہ، تعویذ اور جادو، اصنام، غم و حزن، خمریات، واردات محبت کے جزوئیات اور فحش گوئی کے علاوہ تصوف کے بعض عجیب نظریات شامل ہیں۔ چوتھے باب میں انبیا کرامؑ کے بارے میں شعرا کے غیر مناسب انداز کا ذکر ہے۔ اس باب میں انبیا کی تعلیمات سے انحراف کے نتیجے میں بعض شعرا کے مذہب و اخلاق سے معاندت اور عشق و یاس اور ناامیدی کے تصورات پر تنقید شامل ہیں۔

پانچویں باب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ جس طرح کتاب و سنت اور انبیا کی تعلیمات سے روگردانی کی وجہ سے شعرا کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا پڑا، اسی طرح عقیدہ آخرت سے متعلق ایمان کمزور ہونے کی جہ سے شعرا کو کئی برائیوں میں مبتلا ہونا پڑا۔ اس باب میں حیات بعد الممات اور جنت و دوزخ کے متعلق شعرا کے بعض تصورات کا غیر اسلامی ہونا واضح کیا گیا ہے۔ باب ششم یعنی آخری باب "حاصل تحقیق" ہے جو محاکمہ، حاصلات اور سفارشات پر مشتمل ہے۔

موضوع مقالہ: "آزاد کشمیر میں اُردو حمدیہ و نعتیہ شاعری"

مقالہ نگار: محمد یوسف، 2020ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر الطاف یوسفزئی، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

خطہ کشمیر اپنے طلسماتی فطری حسن کے باعث جنت ارضی کہلاتا ہے۔ اس کی ایک قدیم تاریخی اور تہذیبی حیثیت ہے۔ زاہد و عابد لوگوں کے لیے گوشہ عافیت اور علم و حکمت کا مرکز یہ سرزمین آج محکوم و مجبور اور منقسم ہے۔ خطہ کشمیر میں بڑی قد آور اور نامور شخصیات نے جنم لیا جن کے کام پر بڑے بڑے مشاہیر اور نابغہ روزگار ہستیوں نے سخن ورانہ فضلیت کا برملا اعتراف کیا۔ حمد و نعت کے باب میں متعدد شعرا نے اپنا خون جگر صرف کر کے عقیدت و محبت کے باب میں اپنے خلوص اور فنی مہارت کے جاوداں نقوش ثبت کیے ہیں۔ آزاد کشمیر کے اردو حمد و نعت گو شعرا نے زبان و بیان کی قوت، تخیل کی بلند پروازی، جذبات و واقعات اور واردات قلبی کی پیکر تراشی سے اصناف حمد و نعت کی آبیاری میں جس طرح خون جگر صرف کیا فکری اور فنی محاسن دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ آزاد کشمیر کے بیشتر شعرا نے کل وقتی شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی حمد و نعت گوئی کے فن کو کتنا پر ثروت کیا ہے۔" آزاد کشمیر میں اردو حمدیہ و نعتیہ شاعری: تحقیقی تنقیدی مطالعہ" اردو ادب میں گراں قدر اور خوب صورت اضافہ ثابت ہے ۔ تحقیق ایک ہنر ہے۔ موضوع کے انتخاب اور منظوری کے بعد اس سے متعلق مواد کا حصول دوسرا اہم اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مقالہ نگار لکھتے ہیں :

> "راقم کو اس کام کی تکمیل کے سلسلے میں انتہائی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ آزاد کشمیر کا علاقہ دشوار گزار، برف پوش چوٹیوں اور ڈھلوانوں پر مشتمل ہے۔ پھر سیز فائر لائن کے علاقے اکثر فائرنگ کی زد میں رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں 8 اکتوبر 2005ء کے زلزلہ نے انسانی جانوں سمیت یہاں کے علمی و ادبی خزانے کو

بھی تہہ خاک کر دیا۔ ان حالات میں تحقیقی کام کے لیے بنیادی ماخذوں تک رسائی
کوئی آسان کام نہ تھا"۔(4)

" آزاد کشمیر میں اردو حمدیہ و نعتیہ شاعری: تحقیقی تنقیدی مطالعہ " کو مقالہ نگار نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں آزاد کشمیر کے ادبی پس منظر پر بحث کی گئی ہے۔ جس میں کشمیر کے جغرافیہ، ثقافت، تہذیب، تاریخ، اور ادب کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر میں اردو ادب خاص طور پر آزاد ادکشمیر میں اردو زبان کا آغاز و ارتقا، ترویج و ترقی، حمد نعت کے آغاز و ارتقا اور ترقی کے عوامل پر بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں ممتاز و نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے ذہن و اثرات اور ان کی تخلیقی کاوشوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مختلف اصناف سخن نثر و نظم، ناول، افسانہ، ڈرامہ، سوانح نگاری کے ساتھ ساتھ حمدیہ و نعتیہ شاعری پر خصوصی بحث کی گئی ہے۔ باب دوم میں اردو حمد و نعت کی تعریف و روایت کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر میں اردو حمد و نعت کی روایت پر بحث کرتے ہوئے ممتاز اور صاحب کتاب حمد و نعت گو شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں نمونے کے طور پر حمدیہ و نعتیہ اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔ باب سوم میں آزاد کشمیر کی حمدیہ شاعری میں پائے جانے والے موضوعات اور فکری تنوع کو زیرِ بحث لایا ہے۔ آزاد کشمیر کی حمدیہ شاعری کے اہم موضوعات میں تصور خدا اور عقیدہ توحید، رب العالمین، اسمائے باری تعالیٰ کا بیان، الرحمٰن الرحیم الرزاق، العلیم، الحکیم، الغفور، الکریم، القادر، الھادی، صراطِ مستقیم، مناجات، فضل و کرم اور عطا خداوندی، حامی و ناصر اور حقیقی مشکل کشا اللہ تعالی، حقیقی حاکم اور ابدی حیثیت کا مالک، خدا کی نشانیوں کا ذکر، مالک یوم الدین، اطاعت خداوندی اور شکر الہی، انسان کی حقیقی کامیابی، عشق الٰہی اور عاجزی و انکساری جیسے موضوعات برتے گئے ہیں۔

باب چہارم میں آزاد کشمیر میں اردو نعتیہ شاعری کے موضوعات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان موضوعات میں سراپائے رسول ﷺ، معجزات نبی ﷺ، رحمت العالمین، صاحب خلق عظیم، خاتم النبیین ﷺ، وجہ تخلیق کائنات، ساقی کوثر، سید الانبیا، امام المرسلین، عظمت مقام شان مصطفی ﷺ، صادق و امین، عفو در گزر اور جود و سخا، عشق رسول ﷺ، کرب فراق حرم، تمنائے زیارت، شفاعت رسول، وسیلہ بخشش، فضل و عطا ، احسانات نبی ﷺ، اظہار عاجزی و انکساری، ، اصحاب رسول ﷺ، محبت و عقیدت، مدحت رسول ﷺ، اطاعت رسول ﷺ، غلامی رسول ﷺ اور نذرانہ درود و سلام پر بحث کی گئی ہے۔

باب پنجم آزاد کشمیر میں اردو حمدیہ اور نعتیہ شاعری کے فنی موضوعات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں تخلیقی تنوع، تشبیہات میں عقیدت کے پھول، استعاراتی پیکر تراشی، صنعت تلمیح کے قرینے، صنعت تضاد، صنعت لف ونشر، صنعت مراعاۃ النظیر، صنعت تکرار، صنعت سیاقۃ الاعداد، صنعت ترصیع، صنعت ترافق، صنعت جمع، صنعت حذف، صنعت تضمین، صنعت اشتقاق، صنعت ذو قافیتین، صنعت استفہام، سہل ممتنع، صنعت اقتباس، تنسیق الصفات، محاورات و روز مرہ، مختلف زبانوں میں محبت کے نذرانے، قوافی اور ردائف کی خوش آہنگی اور تراکیب کا استعمال جیسے فنی موضوعات کو برتا گیاہے۔ باب ششم "حاصل تحقیق" میں پوری تحقیق کا ایک اکائی کے طور پر مجموعی جائزہ پیش کیا گیاہے تاکہ قارئین اس تحقیقی کاوش سے مستفید ہوتے ہوئے اس پر اپنی ناقدانہ آرا بھی مرتب کر سکیں اور آزاد کشمیر میں حمد و نعت گو شعرا کے فکر و فن اور اسلوب سے آگاہ ہو سکیں۔

موضوع مقالہ: "اردو غزل میں متعلقات ارکان اسلام"

مقالہ نگار: عقیلہ ناز، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نذر عابد، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

"اردو غزل میں متعلقاتِ ارکانِ اسلام" بظاہر یہ ایک مختصر موضوع نظر آتا ہے لیکن اگر اردو غزل کے کئی صدیوں پر محیط سفر کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اردو غزل کی ابتدا سے دور حاضر تک ارکان اسلام و متعلقات کا مطالعہ اپنے علامتی، تہذیبی و ثقافتی اور تمدنی و سیاسی تلازمات کے حوالے سے خاص مفہوم رکھتاہے جو ہزاروں شعروں کی تخلیق کا سبب بنا۔ ارکانِ اسلام سے وابستہ ایسے ہزاروں اشعار اردو غزل میں ملتے ہیں جن کا استعمال تخلیقی فنکاری کا مظہر ہے اور جن کا مطالعہ اردو تنقیدات میں نہ صرف منفرد بلکہ اپنی وسعت میں بامعنی اور اہم موضوع ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صوفیائے کرام کے ملفوظات سے لے کر دور حاضر تک کے منتخب غزل گو شعرا شامل ہیں۔ مقالہ نگار نے صرف ان نمائندہ شعرا کا انتخاب کیا گیاہے جن کے غزلیہ کلام میں ارکانِ اسلام اور اس کے متعلقات کا برتاوا واضح طور پر ملتاہے۔

مقالے کے پہلے باب میں اَدب اور مذہب کے تخلیقی روابط کو مدنظر رکھتے ہوئے عالمی ادب سے حوالے دیے گئے ہیں۔ ارکانِ اسلام کی اصطلاحات و متعلقات کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جائزہ لیا گیاہے۔ اردو غزل کا ایک اجمالی خاکہ اور اردو ادب میں موضوع سے متعلقہ روزمرہ و محاورات کے لغوی و تلازماتی

مفہوم کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ دوسرا باب اردوئے قدیم کی غزل میں ارکانِ اسلام سے وابستہ عناصر کے استعمال سے متعلق ہے جن میں اردو شاعری کے اوّلین نمونے، صوفیائے کرام کی جکریاں، دوہے، چکی نامے اور پند نامے شامل ہیں۔ ان میں ارکانِ اسلام کے علامتی اظہار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جنوبی ہند کی غزلیہ شاعری میں قلی قطب شاہ سے لے کر ولی دکنی کے دور تک کی غزل کا موضوع کے حوالے سے مطالعہ شامل ہے۔ باب سوم میں شمالی ہند کی اردو غزل میں صوفیائے کرام کی غزل، سودا و میر کا عہد اور دیگر اہم شعرا کے غزلیہ کلام میں متعلقہ موضوع کے تلازمات و علامات کا ذکر ہے۔ اردو غزل کے لکھنوی دبستان کا مطالعہ بھی زیر جائزہ لفظیات کی روشنی میں اس باب کا ایک اہم حصہ ہے۔ باب چہارم جنگِ آزادی کے اثرات اور اس کے نتیجے میں جنم والی شاعری سے متعلق ہے۔ انگریز کی آمد اور اس کے نتیجے میں مغربی اثرات کا اردو غزل میں نفوذ، شعرا کے مزاحمتی و سیاسی رجحانات کی نشان دہی متعلقاتِ ارکانِ اسلام کی روشنی میں کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے اس دور کو "عصر جدید" کا نام دیا ہے۔ اس دور کی غزل میں حالی، اکبر، داغ اور اقبال جیسے اہم شعرا کا خصوصی مطالعہ ہے۔

باب پنجم میں قیام پاکستان سے پہلے اشتراکیت کے اثرات اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی ترقی پسند تحریک کی غزل کا مطالعہ، بیسویں صدی کے نصف آخر سے اکیسویں صدی کے اوائل کی غزل میں معاصر شعرا کے حوالے سے پاکستان میں مارشل لا کا علامتی و تلازماتی جائزہ موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے لیا گیا ہے۔ باب ششم مقالے کا آخری باب ہے اس باب میں بحیثیت مجموعی امیر خسرو سے منسوب اردوئے قدیم کی غزلیہ شاعری کے نمونوں سے عصرِ حاضر تک کی غزل میں عہد بہ عہد ارکانِ اسلام و متعلقات کا مطالعہ ان کے تلازماتی بہاؤ اور علامتی حیثیات میں کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "اردو زبان و ادب میں ہندوستانیوں عیسائیوں کی خدمات۔ انیسویں صدی تک "

مقالہ نگار: پنکی جسٹن، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، جامعہ کراچی، کراچی

اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات کو سراہا گیا اور اس پر جامع و بسیط مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ تاریخ ادبیات کی کوئی کتاب ان کی خدمات کا اعتراف کیے بغیر آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس ان مستشرقین کی مدد کرنے والے ان کے ادبی کارناموں میں برابر ساتھ دینے والے پردہ اخفا میں رہے۔ ہنری مارٹن نے بائبل کا اردو ترجمہ کیا جسے ہندوستان و یورپ میں خوب سراہا گیا لیکن

ان کی مدد کرنے والے مقامی عیسائی شیخ صالح عرف عبد المسیح سے نہ صرف اردو دان طبقہ بالکل ناواقف ہے بلکہ اس کی محنتوں و کاوشوں کا ذکر بھی تاریخ ادبیات اردو میں جگہ نہ پا سکا۔ اسی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے پنکی جسٹن نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی علمی و ادبی خدمات کا آغاز انگریزوں کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے کیونکہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ جہاں برصغیر پاک و ہند پر علمی، معاشرتی اور سیاسی اثرات مرتب ہوئے وہیں مذہبی اثرات سے بھی نظر نہیں چرائی جا سکتی بقول رضیہ نور محمد:

> "پہلے پہل عیسائی مشنریوں کو برطانوی مقبوضات میں تبلیغ کی اجازت نہیں تھی تاہم کسی نہ کسی طرح عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی تھی پھر ۱۸۱۳ء میں اس کی اجازت بھی مل گئی اور اب بے کھٹکے عیسائی مشنریاں ایسی سرگرمیوں میں مشغول ہوئیں اور اردو میں مذہبی کتابوں کا ذخیرہ برطانوی مقبوضات کے طول و عرض میں پھیل گیا۔ سی رام پور کے مرکز سے سنسکرت اور بنگالی پر زیادہ توجہ ہوئی لیکن اردو کی مانگ بھی کسی طرح محدود نہ تھی"۔(5)

ان حالات میں جب عیسائیت کی تبلیغ تیز تر ہوتی گئی اور سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوئی تو پادریوں نے زبانی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مذہبی نوعیت کی کتابیں بھی یکے بعد دیگرے شائع کرنی شروع کر دیں۔ سرکاری ملازمین مالی امداد کے علاوہ منصب کے ذریعے بھی عیسائیت کی حمایت کرنے لگے۔ جلد ہی مشنریوں نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی کہ ہندوستانی عیسائیوں کو بحث و مباحثہ کی باقاعدہ تربیت دی جائے اور انھیں اہم بنیادی نکتے اور باریکیاں سمجھائی جائیں تاکہ وہ مناظروں میں اطمینان بخش جوابات دے سکیں۔ اس کے لیے باقاعدہ منظم طور پر انگریز مشنریز کی کوششیں منظر عام پر آئیں اور مناظرہ سوسائٹیوں کا باقاعدہ ایک جال پورے ہندوستان میں بچھا دیا گیا۔ رفاہ عامہ کی غرض سے انگریزی اسکول و اسپتال قائم ہونے لگے۔ انیسویں صدی کے وسط تک یہ اشاعتی کارروائیاں اس قدر زیادہ پھیل گئیں کہ یہ احساس عمومی طور پر ہونے لگا کہ انگریز در حقیقت مقامی باشندوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ سیاسی و معاشرتی حالات تھے جنھوں نے ہندوستان کی تمام اقوام پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نتیجتاً تبدیلی مذہب کی طرف رجحان دن بہ دن بڑھتا رہا اور ایک بڑی تعداد میں لوگ دائرہ عیسائیت میں داخل ہونے لگے۔

اس مقالے میں آنے والے بیشتر مصنفین ایسے ہی ہیں جنھوں نے نہ صرف عیسائی مذہب قبول کیا بلکہ تبدیلی مذہب کے بعد اپنا سارا زور قلم تبدیلی مذہب کے موقف کو بیان کرنے میں صرف کر دیا۔ اس کی

اہم اور مشہور مثال ماسٹر رام چند کی ہے جنھوں نے ایک طرف اردو زبان و ادب میں ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں شمع و پروانہ کی داستانوں دیو اور پری کے قصوں یا انفرادی محرومیوں کے ماتم کے بجائے اجتماعی فلاح اور عوام کی تعلیم و ترقی کے سامانموجود تھے جبکہ دوسری طرف انھوں نے تحریف القرآن، مسیح الدجال بدعات عیسائی مذہب اور اعجاز القرآن جیسے کتب و رسائل بھی تصنیف کیے جس میں انھوں نے اپنے قلم کو اپنے ان نظریات و خیالات پر مرکوز کر دیا کہ آدمی مذہب کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ انسان اگر ایک مذہب ترک کر دے تو دوسرا ضرور اختیار کرے یہ بات ہمیشہ سے دنیا میں ہوتی آئی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی انسانیت کی خدمت خدا کی خدمت سے کچھ کم نہیں۔ ماسٹر رام چندر کے علاوہ عبد اللہ آتھم، مولوی عماد الدین (جو بعد میں پادری عماد الدین کہلائے) مولوی صفدر علی، پادری رجب علی، شیخ صالح عرف عبد المسیح، پنڈت نرائن داس، کھڑک سنگھ، پادری داؤد سنگھ، پتمبر سنگھ، لالہ چند و لعل، نہما نیلا شاستری، بابو ایشری داس اور بابو ساسپید بنرجی جیسی معروف شخصیات نے بھی تبدیلی مذہب کے بعد اپنی علمی سرگرمیوں کا رخ مذہبی مباحث کی طرف موڑ لیا جس کے نتیجے میں اہم تصانیف و رسائل منظر عام پر آئے۔

"گارسین دتاسی" نے اپنے خطبات اور مقالات کے ذریعے انیسویں صدی میں اردو ادب کی تاریخ و ارتقا کے بارے میں سال بہ سال بے پناہ معلومات فراہم کی ہیں یعنی اس سال ہندوستانی اور ہندی میں کون کون سی کتابیں شائع ہوئیں، کون سے نئے اخبارات و رسائل جاری ہوئے، کتنے جدید مطبع قائم ہوئے، کن کن مصنفین نے ادب میں اضافہ کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے صرف نام گنوانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ تنقید و تبصرے بھی کیے اور ساتھ ساتھ کتاب، اخبار اور رسالے کی حقیقت اور قدر و قیمت کو بھی بیان کرتے چلے گئے۔ اس کے علاوہ مصنفین کے حالات و مساعی کو بھی ادبی مباحث کی روشنی میں بیان کیا۔ انھوں نے عیسائی مبلغین کی کوششوں اور اس کے نتیجے میں دائرہ عیسائیت میں داخل ہونے والے ہندوستانی عیسائیوں کا ذکر بھی بڑے ذوق و شوق سے بیان کیا ہے۔ اس مقالہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ راقمہ نے گارسین دتاسی کے خطبات و مقالات میں سے ان تمام ہندوستانی عیسائیوں کے نام اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں کو جمع کیا اور اس کو بنیاد بناتے ہوئے اس پر مزید کام کیا۔ اس مقالے میں بائبل کے اردو تراجم و تفاسیر کا لسانی مطالعہ و تجزیہ کیا گیا ہے۔ بائبل کے اردو تراجم کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے بول چال کے وہ نمونے فراہم کیے جو اس زمانے کی دوسری تصانیف میں ناپید ہیں۔ مقالے میں بائبل کے چند اردو

تراجم کو بنیاد بناتے ہوئے اس کے ترجمے کا لسانی تجزیہ کیا گیا ہے ۔ اس مقالے کا ایک باب عیسائی اخبارات و رسائل کے مطالعے پر مشتمل ہے۔

اس مقالے کی مصنفہ کے مطابق بعض عیسائی مصنفین کے بارے میں مواد جمع کرتے ہوئے اہم تخلیقی شواہد منظر عام پر آئے ہیں جن کے مطابق اردو کا پہلا سوانح نگار (پتمبر سنگھ) پہلا مضمون نگار (ماسٹر رام چندر)، پہلا ڈراما نگار کیپٹن گرین آروے، پہلا سفر نامہ و روز نامچہ نگار (شیخ صالح عرف عبدالمسیح)، بہترین داستان گو، مثنوی گو، لغت نویس و شاعر (کوئن فراسو) ثابت کرتے ہیں اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری میں بعض ایسے صاحب دیوان عیسائی شعرا ہیں جن کا کلام میر، غالب، داغ جیسے استاد شعرا کی زمینوں میں ہے۔ مقامی عیسائی شاعر جارج پیش شور مس بہت اچھے شاعر تھے، روزانہ ایک دو غزلیں کہا کرتے تھے، صاحب دیوان تھے، شور کے پانچ دیوان، دو اردو مثنویاں اور ایک دیوان فارسی بھی ہے ۔ اس مقالے میں اُن عیسائی صوفی شعرا کا تذکرہ بھی ہے جنھوں نے بائبل کی کتاب "زبور" کو منظوم کرنے میں اپنی انتھک کوششیں صرف کر دیں لیکن آج تک پردہ اخفا میں رہے۔ ان عیسائی صوفی شعرا کی شاعری آج بھی گرجا گھروں میں سنی اور گائی جاتی ہے۔ ان کی خدمات کو مذہبی درسگاہوں میں تو سراہا گیا لیکن تاریخ ادبیات اردو میں شامل نہ ہوسکے۔ راقمہ نے ان شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے نمونہ شاعری بھی دے دیے ہیں تاکہ قارئین ان کی شاعری کو پڑھ کر خود فیصلہ کر سکیں کہ ان کی شاعری کسی بھی طرح اپنے عہد کے دیگر شعرا سے کم نہیں۔

وہ تمام مستشرقین و مبلغین جنھوں نے اردو شعر و ادب و علم و ہنر میں ہندوستانی عیسائیوں سے باقاعدہ مدد لی۔ اُردو کی ادبی تاریخ میں ان کی خدمات کے اعتراف میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن مقامی عیسائی شعرا و ادبا کی خدمات کو نہ جمع کیا گیا اور نہ ہی منظر عام پر لانے کی کوئی مبسوط کوشش کی گئی۔ راقمہ نے کوشش کی ہے کہ ان ہندوستانی عیسائیوں کی علمی و ادبی خدمات کو اس شرح و بسیط کے ساتھ منظر عام پر لایا جائے کہ قارئین خود اس بات کا اعتراف کر سکیں کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں ان کی خدمات کسی بھی طرح اردو ادب کے دیگر مصنفین سے کم نہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ مقالے میں ان تمام ہندوستانی شعرا و مصنفین کو شامل کیا گیا ہے جن کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی، رام بابو سکسینہ، شفقت رضوی، محمد سردار علی وغیرہ نے ان شعرا کو یورپین، انڈو یورپین یا اینگلو انڈین کے زمرے میں رکھا ہے۔

موضوع مقالہ: "اردو غزل میں حمدیہ و نعتیہ موضوعات"

مقالہ نگار: راشد ارشد، 2013ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر راحیلہ تنویر، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

"اردو غزل میں حمدیہ و نعتیہ موضوعات: کے عنوان کے تحت لکھے گئے مقالہ میں مقالہ نگار راشد ارشد نے "ولی دکنی، میر تقی میر، خواجہ میر درد، رفیع سودا، نظیر اکبر آبادی، غلام ہمدانی مصحفی، حیدر علی آتش، قلندر بخش جرأت، انشاء اللہ خان انشا، امام بخش ناسخ، مومن خان مومن، ابراہیم ذوق، اسد اللہ خاں غالب، بہادر شاہ ظفر، داغ دہلوی، حسرت موہانی اور جگر مراد آبادی وغیرہ کی غزل میں حمدیہ و نعتیہ موضوعات تلاش کیے۔ اس مقالہ میں اردو غزل کے سرکردہ شعرا کے کلام سے اللہ عزّ و جلّ اور رسول ﷺ کے ذکر یعنی حمد و نعت کے موضوعات کو اخذ کر کے قارئین کی نظر کیا گیا ہے۔ اس مقالے سے ان شعرا کے مذہبی میلان کا پتا چلتا ہے اور ان کے اللہ عزّ و جل اور رسول ﷺ سے تعلق، عقیدت اور لگاؤ سے بھی شناسائی ہوئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس شاعر نے حمد و نعت کے بیان میں کس موضوع کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بڑی پر لطف اور مسرور کن تھی کہ غزل جسے حسن و عشق کے معاملات کو بیان کرنے کی صنف سمجھا جاتا ہے اللہ عزّ و جل اور رسول ﷺ کے ذکر کو نکالا جائے۔ اس موضوع کے حوالے سے مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

> "مجھے جو بھی مطلوبہ شعر ملا میں نے اسے خوب مزے لے کر پڑھا اور لکھا۔ اکثر ایسے اشعار بھی ملے جن کا مضمون، اندازِ بیان اور پیرایۂ اظہار ایسا زبردست تھا کہ مجھ پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی اور میں جھوم جھوم جاتا۔ ان اشعار کو باآواز بلند پڑھتا اور اپنی اہلیہ کو سناتا۔ حقیقتاً کچھ اشعار ایسے دل پذیر اور دل کش ہیں کہ ان کو عقیدت و محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھا گیا ہے"۔(6)

اس مقالے کا پہلا باب تعارفِ موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موضوع کیا ہے؟ موضوع کی تحدید (حد بندی) کیا ہے؟ مقاصدِ تحقیق اور ذرائع تحقیق کیا ہیں؟ دوسرے باب کا عنوان "اردو غزل" ہے۔ اس میں غزل کے معانی و مطالب اور تعریف، غزل کی ہیئت اور فن، غزل کی اہمیت، غزل کے موضوعات اور روایت کو شامل کیا گیا ہے۔ تیسرا باب "صنفِ حمد" کے عنوان کے تحت ہے۔ اس میں حمد کے معانی و مطالب، حمد کی ضرورت و اہمیت، حمد کے لوازمات و آداب، حمد کی مختلف اقسام، حمد کے موضوعات اور روایت کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان "صنفِ نعت" ہے۔ اس میں نعت کے معانی و مطالب، نعت

کی اقسام، نعت کی ضرورت و اہمیت، نعت کے لوازمات و آداب ولحاظ، نعت کے موضوعات، قرآن مجید میں نعت اور نعت کی روایت کو بیان کیا گیا ہے۔ پانچویں باب کا عنوان "اردو غزل میں حمدیہ موضوعات" ہے۔ اس میں منتخب شعرا کی غزل کے مطالعہ سے حمدیہ موضوعات کو اخذ کر کے شعری امثال کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان اشعار کو جن میں کسی نہ کسی انداز سے عزّ وجلّ کی طرف اشارہ یا حوالہ دیا گیا ہے ان کو بھی اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ چھٹے باب کا عنوان "اردو غزل میں نعتیہ موضوعات" ہے۔ اس میں بھی مذکورہ شعرا کی غزل میں سے نعتیہ موضوعات کو اخذ کر کے لکھا گیا ہے۔ وہ موضوعات جن کو سب شعرا نے اپنی غزل میں بیان کیا ہے، انھیں پہلے لکھا گیا ہے اور وہ موضوعات جن کو سب نے تو نہیں لیکن کچھ نے اپنی غزل میں بیان کیا ہے ان کو بعد میں "متفرق موضوعات" کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں مجموعی جائزہ "محاکمہ" لکھا گیا ہے جس میں تمام مقالے کا مختصر جائزہ اور نتائج تحقیق شامل ہیں۔

موضوع مقالہ: "اردو مرثیہ کے تاریخی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"

مقالہ نگار: مجاہد عباس، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر سید عون ساجد، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو ادب کی اکثر اصناف میں واقعہ کربلا کے تلازمات کثرت سے ملتے ہیں تاہم اردو مرثیہ میں اس واقعہ کو مجموعی حیثیت سے برتا گیا ہے۔ اس مقالے میں اردو مرثیہ کے متن سے ان عناصر کا کھوج لگایا گیا ہے جن سے شعرا نے مستقل طور پہ استفادہ کیا ہے۔ مقالہ نگار نے ان تاریخی عناصر کی پیشکش کے اعتبار سے مختلف ادوار کے شعرا کے کلام کا تنقیدی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ ادب اور تاریخ کے علوم میں اختلاف کے وجود کس قدر مجانست و معانقت پائی جاتی ہے؟ ایک ادبی صنف ایک تاریخی واقعہ کو کیونکر بروئے کار لا سکتی ہے؟۔ تاریخی عناصر کی روح ادبی صنف کی روحِ رواں کیسے بن جاتی؟ اسی طرح تاریخی اور ادبی سچائیوں کا مقامِ اتصال کیسے وجود پاتا ہے؟ مرثیہ نگار اپنے عہد کے اعتبار سے کس طرح کے تاریخی عناصر سے استفادہ کرتے رہے اور ان عناصر کی پیشکش کن اسالیب و افکار میں کرتے رہے ہیں؟۔ اس مقالے کے چند بنیادی اور اہم سوالات ہیں جن سے اس تحقیقی مقالے کے مقاصد کا تعین ہوتا ہے۔ دائرہ کار کے اعتبار سے اس مقالے میں اردو مرثیہ کے قدیم، کلاسیکی اور جدید ادوار کے برجستہ شعرا کے نمونہ جاتی کلام کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مقالے کے ابتدائی دو ابواب تاریخ اور ادب کے تعلق اور عربی و فارسی مرثیہ نگاری کے حوالے سے ترتیب دیے گئے ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں ادب اور تاریخ کا تعلق بیان کیا گیا ہے۔ تاریخی تناظر میں مرثیے کے مطالعہ کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ادب اور تاریخ کے علوم کی مبادیات، ان میں فرق اور مطابقت واضح کر دی جائے۔ اس لیے مقالہ نگار نے ادب کی تعریف، نظریہ، مناصب اور مقاصد کے ساتھ ساتھ تاریخ کا تعارف، نظریہ، مناصب اور مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ ادب اور تاریخ کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے اور ان دونوں علوم میں مطابقت کے پہلو بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ اس مطابقت کی روشنی میں "نئی تاریخیت" کے نکات بھی واضح کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں مرثیہ نگاری کی روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہوئے عربی اور فارسی زبان میں مرثیہ نگاری کا اجمالی مطالعہ کیا گیا ہے اور مشہور مرثیہ نگاروں کا منتخب کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ اردو مرثیہ نے اگرچہ عربی اور فارسی مرثیہ سے الگ پہچان بنائی ہے تاہم اس روایت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے جس سے شعوری یالاشعوری طور اردو مرثیہ نگار متاثر ہوئے ہیں۔ تیسرے باب میں قدیم اردو مرثیہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دکن سے دلی تک مرثیے کا سفر، اس کی روایت، نامور شعرا اور ان کے کلام کا مطالعہ اس باب میں کیا گیا ہے۔ کاظم علی سکندر، افسردہ، درگاہ قلی خان اور سودا کے علاوہ د اہم شعرا کے مرثیوں کا مطالعہ اس باب کا حصہ ہے۔

چوتھا باب اردو مرثیہ کے کلاسیکی عہد کا احاطہ کرتا ہے۔ اس عہد کو انیس و دبیر کے عہد سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور میں ضمیر، خلیق، دلگیر، فصیح، انیس و دبیر کے علاوہ اس دور کے کئی دوسرے اہم شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں جدید اردو مرثیہ موضوع مقالہ نگار کے زیر تحقیق رہا۔ مرثیہ نگاری میں جدت کے اسباب اور تاریخی عناصر کی نئی تعبیر کے حوالے اس دور کی مرثیہ نگاری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس باب میں جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، نجم آفندی، آل رضا، صبا اکبر آبادی، آغا سکندر مہدی، سیف زلفی، وحید الحسن ہاشمی، باقر امانت خانی، ڈاکٹر صفدر حسین اور ہلال نقوی کے علاوہ کئی دوسرے اہم شعرا کے کلام کا مطالعہ شامل ہے۔ مقالے کے آخر میں "حاصل تحقیق" اور چند نئے قابل تحقیق موضوعات کی سفارشات بھی مرتب کی گئی ہیں جو آئندہ کے محقق کو دعوت فکر دیتی ہیں۔

جدیدیت و مابعد جدیدیت:

لفظ جدیدیت جس قدر مانوس اور عام ہے، اس کے بنیادی اور ضمنی مفاہیم اسی قدر مبہم اور پیچیدہ ہیں۔ جدیدیت کا تعلق محض ادب سے نہیں بلکہ تمام معاشرتی علوم میں اسے ایک جدید اور مستقل موضوع کا درجہ حاصل رہا ہے۔ یہ معاشرتی ارتقا اور تہذیبی رجحانات کی نمائندہ بھی ہے اور ایک تاریخی تناظر بھی رکھتی

ہے۔ چنانچہ جب ادب میں جدیدیت کو زیر بحث لایا جاتا ہے تو مذکورہ عناصر اور ان کی پرچھائیاں بھی در آتی ہیں۔ جدیدیت سے مراد ایسا میٹاڈسکورس ہے جو سیاسی اور ثقافتی سطح پر سرمایہ داریت کے خلاف ایسا ردعمل تھا جو جمالیاتی تنزل پذیر سٹائل کی صورت میں ادب میں سامنے آیا۔ مغرب میں ادب اور فنونِ لطیفہ کی صورت میں اس کا جو اظہار ہوا اسے جمالیاتی جدیدیت کہا جاتا ہے۔ جبکہ اس اظہار کے پیچھے متعدد روشن خیال فلسفیوں کی جو فکر کار فرما تھی اس کو فکری جدیدیت یعنی ہمہ گیر فکری جدیدیت کا نام دیا گیا۔ جبکہ اُردو ادب میں "جدیدیت" ہی سے سب کچھ مراد لیا گیا۔

زرعی سماج میں انسانی صلاحیت، اس کے عقلی، منطقی واستدلالی انداز کو کوئی اہمیت نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ عقیدے، یقین اور الٰہیاتی ارادیت کو اہمیت حاصل تھی۔ صنعتی دور میں یقین کی بجائے انسانی ٹیلنٹ کو اہم جانا گیا۔ اس ٹیلنٹ کو قائم کرنے میں فرانسس بیکن کا استقرائی طریقہ کار، رینے ڈیکارٹ کی عقلیت پسندی، جان لاک کی تجربیت پسندی، کانٹ کا ڈیوڈ ہیوم کی تشکیک کا جواب دے کر سائنس اور استقراپر علمی دنیا پر اعتماد بحال کرنا، ڈارون کے انواع حیوانات اور دوسرے نظریات، فرائیڈ کا انسانی سائیکی کا ماڈل، آئن سٹائن کا کائنات کا مطالعہ، سارتر کے وجودیت کے فلسفے اور مارکس کے معاشی ومادی تاریخ کے نظریات، یہ سب بیانیے شامل ہیں جو انسانی آزادی، خود مختاری، منطقیت، عقلیت اور سوچنے والے فرد کے اجتماعی انسانی جوہر کے "مکالماتی عقل" کے اصول اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور ماضی سے انکار کا رشتہ جوڑتے ہوئے نئی روایت کی بنیادیں بھی رکھتے ہیں۔ گویا جدیدیت کے متن کا اصل جوہر عقل اور تجربے پر قائم ہے جو روایت، عقیدہ اور متصوفانہ وجدان کو رد کرتے ہیں۔ فکری جدیدیت کا جو غیر مشروط علم تھا وہ خود شعوری، خود حقیقت پسند اور خود نظریہ ساز تھا مگر اسے بورژوا عقلیت، منطقیت کے حامل انسان کے ساتھ جوڑ دیا گیا جو سرمایہ داریت کا چہرہ بن کر "مارکیٹنگ جدیدیت" کو پیش کرنے لگا۔

روشن خیالی کا یہ "پروجیکٹ" سرمایہ داریت کی طرف سے ہائی جیک کر لیا گیا اور اوپر سے مسلط شدہ شعور، منطقیت اور عقلیت کی تقلید کرنے لگا۔ گویا یہ طاقت کا ایسا ڈسکورس بن گیا جس کے اصول خود شعوری نہیں تھے۔ یہ اینٹی ریشنلسٹ گروپ فرانس میں کافی مقبول ہوا جو مارکیٹنگ جدیدیت کے بعد پیش جدیدیت میں لاکاں، دریدا، دلیوزے، لیوتار، جین بادریلا جیسے فلسفیوں کی صورت میں سامنے آیا۔ جبکہ ریشنلسٹ گروپ (جدیدیت پسند) اٹلی اور جرمنی میں سامنے آیا۔ جس نے فرینکفرٹ سکول سسٹم تھیوری (Nikolas Luhman)، نیو آئیڈل ازم، ہیر ماس کی مکالماتی عقل (Communicative Reason)، گارڈ میئر

(Gadmer)کا عقل بارے میں 'Moving Events' کا نظریہ، Recoeur کا عقل کو " Mediating and Transforming Activity سمجھنا، یہ سب اصل فکری جدیدیت کی اس کھوئی ہوئی فکر کو پیش کرتے ہیں جو سرمایہ داریت کی زد میں آگئی اور مرکز میں مشروط عقلیت منطقیت اور سمجھداری کے حامل انسان کو لا کھڑا کیا۔

برصغیر میں جدیدیت مارکیٹنگ جدیدیت کا ہی پیش خیمہ تھی جس کی ترویج میں جہاں بیرونی قوتیں کارفرما تھیں وہاں مقامی استعماری قوتیں بھی تھیں جو جدیدیت کا ایسا دہرا شعور پیدا کر رہی تھیں جو انہیں قومی، سیاسی، سماجی حوالے سے کمزور کر رہا تھا۔ مغل معاشرہ زرعی نظام پر مشتمل تھا جس میں صنعتی معاشرے کی برق رفتاری کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ رہی سہی کسر مغل حکمرانوں کی عیش کوشیوں، عدم سیاسی بصیرت اور منطقی علوم کو پذیرائی نہ دینے کی وجہ سے پوری ہو رہی تھی۔ انہی کمزوریوں کی وجہ سے یہاں کی مڈل کلاس کے ذہنوں میں انگریزوں کا حاکمانہ طرز احساس اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ مغربیت زدگی کے سائے کی وجہ سے یہاں کے ادیب دہرے شعور کا شکار تھے۔ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق کی تخصیص نے انہیں جدیدیت کے اصل چہرے سے دور کر دیا تھا۔ مگر اس تاریکی میں چند ایسے چراغ ضرور موجود تھے جو کلونیل جدیدیت اور مغربیت زدگی کا شکار نہیں تھے۔ ان کی ابتدا سر سید احمد خان سے ہوتی ہے اور آگے چل کر ترقی پسند تحریک کی فکری و فنی کاوشوں سے جڑ جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک جو اصل فکری جدیدیت کا صحیح عکس پیش نظر رکھتی تھی اسے بھی مارکیٹنگ رسائل مثلاً "شب خون، اوراق" وغیرہ اور دوسری ترقی پسند مخالف تحریروں کے ذریعے نشانہ بنایا گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تحریکوں میں خامیاں ہوا کرتی ہیں۔ آرتھوڈوکس مارکس ازم اس کی ایک مثال ہے مگر "پریکس مارکسزم" مارکسی جمالیات کا فکری جدیدیت کے شانہ بشانہ رہنے والا عہد آفریں فلسفہ ہے جو فکری جدیدیت کو مادی بنیاد فراہم کرتا ہے اور ساتھ ہی ماڈرن ازم کے سرمایہ داریت کے ہاتھوں ہائی جیک ہونے پر اس کا محاکمہ بھی کرتا ہے۔ ذیل میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تناظر میں لکھے گئے مختلف جامعات کے تحقیقی مقالہ جات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

موضوع مقالہ: " اُردو تنقید میں جدیدیت کے مباحث: خصوصی مطالعہ "(شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا،

ڈاکٹر شمیم حنفی)

مقالہ نگار: محمد عابد، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر قاضی عابد ، بہاؤالدین زکریایونیورسٹی، ملتان

اردو تنقید سو سال سے زائد عرصہ گزارنے کے بعد آج بھی ادب فہمی کے ضمن میں بیک وقت قاری، مصنف، قرآت اور زبان جیسے عناصر خمسہ کی متحرک شمولیت پر اصرار کر رہی ہے۔ اردو تنقید نے دوسری منشور اور منظوم اصناف کی طرح مغربی ادب سے اخذ و استفادہ کر کے اپنے دامن کو وسعت بخشی۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو میں نئے تنقیدی نظریات متعارف کرائے گئے جنہوں نے یقیناً ادب کی قدر سنجی کے نئے ابواب وا کئے۔ تھیوری کے تحت سامنے آنے والے ان تنقیدی نظریات میں ساختیاتی تنقید، پس ساختیاتی تنقید، قاری اساس تنقید، امتزاجی تنقید، نئی تاریخیت، تانیثی تنقید، اکتشافی تنقید، نو مارکسی تنقید، ماحولیاتی تنقید، مابعد نو آبادیاتی تنقید وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تنقیدی نظریات کی تشریح و توضیح کئی معتبر رسائل و جرائد میں کی گئی اور ان کے عملی و اطلاقی نمونے بھی پیش کیے گئے۔ مابعد جدیدیت کے حوالے سے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "پوسٹ فکری جدیدیت، فکری جدیدیت سے آگے کی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ فکری جدیدیت کے اندر سے پیدا شدہ ایک صورت ہے۔ گویا مابعد جدیدیت، فکری جدیدیت کا حصہ ہے۔ یہ کوئی تاریخی تبدیلی نہیں بلکہ فلسفیانہ نوعیت کا مسئلہ ہے۔ اس کا کام نئی جدیدیت کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ مابعد مختصر لفظوں میں لایعنیت اور منطقی اثباتیت کے ملغوبے پر مشتمل صورتحال ہے جو آرڈر پر زور دیتی ہے، جس کی مختلف صورتیں اور میدان ہیں"۔(7)

مذکورہ تحقیقی مقالے کے باب اول میں مقالہ نگار نے اردو تنقید کی اولین روایت کا اجمالی جائزہ لیا اور مشرقی شعریات کے ان اصولوں کو پیش کیا ہے جو اس وقت کا لازمہ تھے جن کی خارجی بنیادیں اساتذہ کی اصلاحیں، مشاعروں کا ماحول، سامعین، بیاضیں اور تذکرے ہوا کرتے تھے۔ عمومی سطح پر یہ علمی روایت ہر شاعر کے ذہن میں جلوہ فگن تھی۔ باب دوم میں جدیدیت کا تاریخی پس منظر، مغرب اور مشرق کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ مقالہ نگار کے مطابق اصل ماخذات تک رسائی کے بعد جدیدیت کا جو تصور سامنے آیا ہے وہ اردو ناقدین کے پیش کردہ تصور سے بہت مختلف ہے۔ تیسرے باب میں جدیدیت اور شمس الرحمن فاروقی کے حوالے سے بحث کی گئی ہے جس میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ شمس الرحمن فاروقی کی پیش کردہ جدیدیت رومانوی الاصل، ہند اسلامی تہذیب کی پروردہ، پس ساختیاتی مباحث سے لبریز اور ترقی پسند مخالف

رحجان کی حامل ہے۔ اس طرح کی جدیدیت اصل جدیدیت کے علمی ڈسپلن سے ذرہ برابر بھی علاقہ نہیں رکھتی ۔ مقلہ نگار نے اسے "مارکیٹنگ جدیدیت "کا نام دیا ہے۔ چوتھا باب بعنوان "جدیدیت اور ڈاکٹر وزیر آغا" کے نام سے ہے۔

وزیر آغا نے جدیدیت کے نام پر ساختیاتی مباحث کو جس طرح شامل کیا اس پر بھی بات کی گئی ہے اور متصوفانہ آئیڈیالوجی کی بدولت وہ جس طرح اصل جدیدیت سے دور ہوتے ہیں اور ترقی پسند مخالف رجحان کو اپناتے ہیں، ان پہلوؤں کو بھی علمی حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب پنجم بعنوان "جدیدیت اور ڈاکٹر شمیم حنفی" قائم کیا گیا ہے۔ شمیم حنفی کا جدیدیت کا پیش کردہ تصور بھی باقی دوناقدین سے زیادہ مختلف نہیں۔ ان کے ہاں جدیدیت روحانی کشف سائنسیت مخالف اور مارکسی جمالیات سے دور رہتی ہے۔ شمیم حنفی کے افکار آرتھوڈوکس مارکسزم سے انصاف کرنے کے باوجود جدیدیت کے روشن خیال حصے (پریکس مارکسزم) سے قارئین کو محروم کر دیتے ہیں اور بار بار ان کے دیے ہوئے رومانوی حوالے جس طرح جدیدیت کی شعریات کو رومانویت سے جوڑ دیتے ہیں اس طرح کے مباحث کو بھی علمی حوالوں سے زیر بحث لاکر جدیدیت کے مادی حوالوں کی بنیاد کو ثابت کیا گیا ہے۔ متذکرہ باب کے بعد ان کا خلاصہ بعنوان "اردو تنقید میں جدیدیت کی روایت اور مابعد جدید کا آغاز " پیش کیا گیا ہے جن میں ان چاروں ابواب کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے جو پوری کتاب کے بنیادی مقدمات پر محیط ہے۔ یہ مقالہ جدیدیت کے تحت سامنے آئے مختلف اور متنوع تنقیدی نظریات کی تفہیم و تعبیر کی ایک بہترین کاوش ہے۔

موضوع مقالہ: "اردو ادب میں خرد افروزی اور روشن خیالی کی روایت "

مقالہ نگار: رفعت اقبال خان، 2010ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر قاضی عبد الرحمان عابد، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

حیات انسانی ماضی قدیم سے لے کر عصر موجود تک کتنی ہی صدیوں کے پڑاؤ کرتی، بے شمار نشیب و فراز، پیچ وخم، حادثات و تجربات، مراحل نوبہ نو سے گزر کر پہنچی ہے۔ انسان حیاتی تقاضوں کے باعث فطری صلاحیتوں یا نور عقل اور جذبہ دل سے کام لے کر تہذیب و تمدن، اقدار، علوم و فنون کی مشعلیں فروزاں کر کے اس ورثے کو آئندگان تک منتقل کرتا رہا ہے جس میں ہر نسل نے نئے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اضافے بھی کیے اور فرسودہ ہو جانے والے عناصر کو متروک بھی کیا۔ ترک و اضافہ کے اسی مسلسل عمل کے باعث آج یہ دنیا وہ نہیں جو کل تھی اور عصر حاضر میں ماضی کی نسبت تیز تر ہو جانے والی رفتار تغیر کے باعث وہ

نہیں رہے گی جو آج تک ہے۔ تغیر اپنا گواہ آپ ہے۔ خرد افروزی و روشن خیالی اس صداقت کی عقلی و شعوری توثیق ہے۔ حجری اوزاروں سے جوہری انشقاق، جنگلوں، غاروں سے مریخ کے خلائی مضافات، محدود گروہی زندگی سے عالمی معاشرے، قبائلی رسوم و اسالیب سے آفاقی مشترک اقدار کے شعور تک اس جاں گسل سفر میں انسان نے بہت کچھ پیچھے چھوڑا اور بہت کچھ اس کی دسترس میں ہے جن میں ماضی کی یادگاریں بھی ہیں۔ اس دوران جہاں کئی عقدے وا ہوئے، مسائل کے حل دریافت ہوئے ، وہاں عہد بہ عہد نئے عقدوں اور سوالوں کی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوتی رہیں۔ عصر موجود کی پیچیدہ تر زندگی میں کئی مسائل و معاملات کی نوعیت بھی بہت سنگین ہو چکی ہے جیسے بقا کا مسئلہ گروہوں، قبائل، اقوام کے دوائر کے ساتھ پورے کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے کر فطری و ماحولیاتی، زمینی و سماجیاتی توازن سے مشروط ہو چکا ہے۔

زندگی کی تعمیری قوتوں کو تخریبی عناصر سے ہمیشہ جدل کا سامنا رہا ہے اور تمام فطری و غیر فطری مسائل کی پیچیدگیوں سے عہدہ بر آ ہوتے رہنے کا عملِ جاریہ انسان کی ضرورت، اُس کے فائدے کا موجب ہے۔ وہ اس کا مکلف بھی اس لیے ہے کہ اُسے نایافت و نامعلوم کی آرزو، جذبہ جستجو، شرف عقل، علم الاسماو القلم کی نعمت ارزانی ہوئی ہے۔ وہ عالم جماد و نبات یا جہانِ جبلت کا پابند و اسیر نہیں اور اُس پر تفہیم حیات و کائنات ہی نہیں تزئین حیات بھی لازم ہے۔ شب آفرینی کی حکیمانہ مبارزت کا مداوا چراغ آفرینی کے عاقلانہ ہنر ہی سے ممکن ہے اور متزاحم و متوافق فطری ماحول میں بقا، سازگاری و فیض یابی، جوہر نوعی و انفرادی کی حتی الامکان ترقی و تکمیل بھی اسی طور ہو سکتی ہے۔ اصول فطرت کے تحت اس شعور و قدرت کے ممکنات ہزاروں برس کے ارتقا کے نتیجے میں بتدریج واضح ہو کر اضافہ پذیر ہوئے ہیں اور اندیشہ ہائے دور دراز کے باوجود انسان بہشت ارضی کے خواب نو سے دستکش ہونے پر آمادہ نہیں۔ انکشاف قدرت سے آثار تعبیر کے ظہور کے مابین، مابعد، جو ہفت خواں آئے یا آ سکتے ہیں، انہیں اہلِ دل و دانش حتی الوسع سر کرتے رہے اور آئندہ بھی یہ توقع کی جا سکتی ہے۔ پہلے بھی تازہ نگاہ تخلیقی شعور و عقل نے تقلید و روایت پرستی، پسپائیت و انفعالیت اور قدامت پرستی سے پیکار آزمارہ کر زندگی کی آگہی کے عمل اور بذات خود زندگی کو آگے بڑھایا۔ اسی مثبت عمل میں مختلف تہذیبوں میں متنوع سطحوں پر خرد افروز، روشن خیال روایات و افکار متشکل ہو کر تغیر وارتقا کے لازمی مراحل سے گزرتے رہے ہیں۔ خرد افروزی و روشن خیالی کا مفہوم آگہی کے ایسے ہی متذکرہ پہلوؤں سے عبارت ہے۔

زیر نظر مقالہ بحوالہ عنون بالا میں مقالہ نگار نے عالمی تاریخی و تہذیبی تناظرات میں اُردو کی خرد افروز ،روشن خیال علمی و فکری روایت کا مربوط مطالعہ کرنے کی طالب علمانہ کاوش کی ہے۔ اس مقالے میں خرد افروزی و روشن خیالی کے موضوعاتی زاویے سے متعلق اہم فکری و ادبی، سیاسی و سماجی تحریکوں، رجحانات یا منتخب نمائندہ مفکرین، ناقدین و دانشوروں کے افکار کو زیر بحث لایا گیا ہے جو مذہب و تاریخ مذہب، فلسفہ و ادب، بشریات و عمرانیات، تاریخ سے لے کر سیاست و صحافت جیسے متنوع شعبوں پر محیط ہیں۔ اسی طرح اس تحقیقی مقالے میں پاکستانی سماج میں خرد افروز، روشن خیال فکریات کے بعض مسائل و امکانات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے ۔

موضوع مقالہ: "پاکستان میں عملی تنقید کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "

مقالہ نگار: محمد اقبال کامران،2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر سعادت سعید، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور

ادب کے سنجیدہ قارئین اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اُردو تنقید کا آغاز شعرائے اُردو کے تذکروں سے ہوا۔ آزاد، حالی اور شبلی نے جدید تنقید نگاری کی بنیاد رکھی۔ عہد سرسید میں پیروی مغرب کا چلن عام ہوا تو اُردو تنقید نے اپنا رشتہ سماج سے استوار کیا۔ مغربی افکار اور تنقیدی نظریات کے فروغ نے برصغیر میں عمرانی، رومانوی، نفسیاتی اور مارکسی تنقید کو جنم دیا۔ قیام پاکستان سے قبل تنقید کے درج بالا تصورات کی روشنی میں عملی تنقید ہو رہی تھی۔ مغربی نظریات نقد کے ساتھ ساتھ مشرقی اور روایتی زاویہ نظر بھی اطلاقی تنقید میں مستعمل تھا۔

تقسیم ہند ایک اٹل حقیقت ہے جس کے نتیجے میں دُنیا کے نقشے پر پاکستان اور بھارت نمودار ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں ملکوں کے ادیبوں کے درمیان جغرافیائی سرحدیں تو حائل ہو گئیں مگر ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ اگر بھارتی نقاد پاکستانی تخلیق کاروں کے فکر و فن کا محاکمہ کرتے رہے تو پاکستانی ناقدین نے بھی ملکی اور مذہبی تعصبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہندوستانی ادیبوں کو کبھی نظر انداز نہ کیا اور اُن کی ادبی فتوحات کو خراج تحسین پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیا۔اس تناظر میں مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

> "پاکستانی ناقدین نے اپنی عملی تنقیدات میں نہ صرف جملہ اصناف ادب میں دادِ تخلیق دینے والے تخلیق کاروں کے فکر و فن کا احاطہ کیا ہے بلکہ انھوں نے عالمی

ادب، علاقائی ادب اور دیگر فنون لطیفہ کے نمائندہ فن کاروں کو بھی اپنی اطلاقی تنقید کا موضوع بنایا ہے"۔(8)

ہمارے ناقدین نے مبسوط تصانیف اور تنقیدی مقالات کے ذریعے کلاسیکی اور جدید ادبی سرمائے کی اہمیت، افادیت اور معنویت بھی اجاگر کی ہے اور ادبی تحریکات، رجحانات اور رویوں کے مثبت اور منفی کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پاکستانی ناقدین نے اپنے تجزیاتی مطالعوں میں نہ صرف روایتی اور جدید تنقیدی پیمانے برتے ہیں بلکہ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کے ساختیاتی اور پس ساختیاتی مطالعے پیش کر کے پاکستان میں فروغ پانے والی عملی تنقید کی روایت کو مابعد جدیدیت سے بھی آشنا کیا ہے۔ ہمارے ناقدوں نے نہ صرف ماضی کے معاندانہ تنقیدی رویوں کی بیخ کنی کرنے کی شعوری کاوش کی ہے بلکہ انھوں نے نظریاتی اختلاف رکھنے والے ادیبوں اور ان کی تخلیقات پر منصفانہ اور ہمدردانہ تنقید لکھ کر عملی تنقید کی روایت کو ایک مثبت جہت بھی عطا کی ہے۔ مقالہ بحوالہ عنوان بالا میں مقالہ نگار نے اس تحقیقی مقالے میں پاکستانی ناقدین کے مذکورہ بالا تنقیدی کارناموں اور مستحسن تنقیدی رویوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

مقالے کے پہلے باب میں ادبی تنقید کے بنیادی مباحث کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُردو تنقید کے آغاز سے لے کر تقسیم ہند تک عملی تنقید کی روایت کا جائزہ دوسرے باب میں لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں پاکستان کے ترقی پسند ناقدین کی تنقیدی فتوحات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عملی تنقید کے فروغ میں "حلقہ ارباب ذوق" کے کلیدی کردار کا مطالعہ چوتھے باب میں کیا گیا ہے۔ پانچواں باب دبستان، روایت اور پاکستانی ادب اور اسلامی ادب جیسی تحریکات سے وابستہ ان ناقدین کی تنقیدی مساعی کا احاطہ کرتا ہے جن کی عملی تنقید میں مشرقی اور مغربی جہات کا امتزاج ملتا ہے۔ چھٹا باب پاکستانی محققین اور ادب کے قابل فخر معلمین کی عملی تنقید کے تجزیاتی مطالعے کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ ساتواں باب پاکستان میں اطلاقی تنقید کے جدید، مابعد جدید اور معاصر تناظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ آخر میں حاصل مطالعہ کے عنوان سے پاکستان میں عملی تنقید کے جائزے سے اخذ شدہ تحقیقی نتائج کو قلم بند کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "علامہ اقبال کی اردو نظموں کے کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ "

مقالہ نگار: انوار الحق، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، پشاور یونیورسٹی، پشاور

علامہ اقبال کے فکر و فن پر جامعات اور جامعات سے باہر سینکڑوں محققین نے تحقیقی و تنقیدی کام کیا ہے۔ اس کا آغاز علامہ اقبال کی زندگی میں ہی نہ صرف اردو زبان سے ہو گیا تھا بلکہ ان کی شاعری کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اگر اقبالیات پر ہونے والے کام کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے فکر و فن کی واضح منضبط اور مبسوط صورت گری جامعات میں سندی تحقیق ہی کے ذریعے سامنے آئی، عہد حاضر میں دانش وروں، نقادوں اور مختلف قلم کاروں بالخصوص ریسرچ سکالرز نے مختلف زاویوں، نکتہ ہائے نظر اور موضوعات کے حوالے سے علامہ کے افکار، فلسفہ اور شاعری کا جائزہ لیا ہے، یہ کام اس قدر وسعتوں اور ایسے ایسے متنوع زاویوں سے ہوا ہے کہ اب علامہ کے فکر و فن پر تازہ موضوع کی تلاش نئے محققین کے لیے یقیناً ایک مشکل کام ہے۔ مذکورہ بالا عنوان کے تحت لکھا گیا تحقیقی مقالہ علامہ اقبال کی اردو نظموں کے کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہے۔ مقالہ نگار نے علامہ کے فکر و فن اور بالخصوص ان کی نظموں کے کرداروں پر متعدد حوالوں سے ایک مستند، مفصل اور پر مغز تحقیقی و تنقیدی کام ہے جو نسبتاً ایک نیا اور تازہ موضوع ہے۔

شاعر اپنے افکار و محسوسات اور تجربات و مشاہدات کا اظہار نہ صرف اپنی ذات یعنی میں (واحد متکلم) کی ضمیر سے کرتا ہے بلکہ مختلف ضمیروں اور کرداروں کے ذریعے سے بھی کرتا ہے۔ اردو نظم کا مطالعہ بتاتا ہے کہ علامہ اقبال تک آتے آتے نظم کے کرداروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے لیکن علامہ کی شاعری، اردو کی سابقہ شاعری سے جہاں دوسرے حوالوں سے مختلف ہے وہاں ان کی نظموں کے کردار اور ان کرداروں سے وابستہ فکری تلازمات بھی منفرد رنگ کے حامل ہیں اور پھر جدید اردو نظم میں کردار نگاری کے حوالے سے اقبال کی اہمیت اس حوالے سے بھی فزوں تر ہے کہ انھوں نے یہ اسلوب اردو نظم میں پہلی بار باقاعدہ طور پر اختیار کیا۔ مزید بر آں انھوں نے اپنے افکار و محسوسات اور فلسفہ و دانش کیے اظہار گری کے لیے باقاعدہ کرداری نظمیں تخلیق کیں، مقالہ نگار کے مطابق:

> "اس لحاظ سے بھی اقبال کو اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو نظم میں کردار نگاری کی باقاعدہ طور پر بنیاد رکھی"۔(9)

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اردو تحقیق و تنقید نے جدید تحقیقی و تنقیدی حوالوں سے ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں، بالخصوص معاصر علمی و سائنسی ماحول میں جہاں بیسیوں علوم، شعر و ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں وہاں مختلف سائنسی، سماجی، سیاسی، نفسیاتی، عمرانی، مذہبی اور معاشرتی سانچوں اور علوم کی روشنی میں

شعر وادب کو پرکھا جارہا ہے، تاہم مذکورہ تحقیقی و تنقیدی کام کو بیان شدہ پیمانوں کے تحت وسیع منظر نامے کے ساتھ پرکھتے ہوئے فکر اقبال کی سیکڑوں نئی جہتوں کو سامنے لایا گیا ہے کیونکہ علامہ کے ہاں اردو نظم کا قریباً نصف حصہ کرداری اسلوب سے متعلق ہے۔ مذکورہ مقالہ نگار نے کردار نگاری جیسے جدید تنقیدی رویے کی روشنی میں فکر اقبال کو دیکھنے کی محققانہ ودانشورانہ کوشش زیر نظر مقالے کی صورت میں کی ہے۔

مقالہ نگار نے مقالے میں مذکورہ کرداروں کی ایک جامع فہرست بھی دی، یوں مذکورہ باب میں نہ صرف ان کی نظموں کے کرداروں کی نشان دہی کی گئی بلکہ جمع آوری اور گروپ بندی بھی کی گئی ہے۔ باب سوم "علامہ اقبال کی اردو نظموں کے کرداروں کا تحقیقی جائزہ" کو سات ذیلی فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں موجود ہر کردار کا جائزہ قرآن پاک، عہد نامہ قدیم وجدید، مختلف کتب و تفاسیر، مستند انسائیکلوپیڈیاز، کتب اصطلاحات وفنون، فرہنگوں اور تذکروں کی روشنی میں فرداً فرداً الف بائی ترتیب سے لیا گیا ہے۔ مزید بر آں ہر کردار کے متعلق حقائق تک رسائی کی کماحقہ، کوشش کے بعد اس کے حوالے سے جملہ حقائق و تفصیلات کو جامع و پر مغز انداز میں زیب قرطاس کیا گیا ہے۔ یوں فصل اول میں اللہ کی ہستی کے علاوہ انبیائے کرامؑ کی ہستیوں کے متعلق باقاعدہ قرآن پاک اور کتبِ احادیث و تفاسیر کی روشنی میں مدلل انداز میں بحث کر کے من گھڑت اسرائیلی روایات اور دیگر ملحدانہ نظریات کی رد پیش کی گئی ہے نیز اللہ تعالی اور انبیائے کرامؑ کے حقیقی مقام کا تعین مذکورہ بالا ماٰخذ کی روشنی میں کرنے کے بعد کلام اقبال میں اس کی حقیقت وماہیئت اور معنویت پر بحث کی گئی ہے۔ فصل دوم میں مابعد الطبیعیاتی کرداروں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا جس میں سب سے پہلے اسلامی تخیل سے وابستہ کرداروں اور پھر دیگر مذاہب عالم کی مقدس ہستیوں یا کرداروں کی تحقیق پیش کی گئی ہے۔ فصل سوم میں دیگر مذہبی کرداروں کے تحقیقی جائزے کو بھی مزید تین ذیلی حصوں میں تقسیم کر کے پہلے صحابہ کرام، اولیائے کرام اور آخر میں عام مذہبی کرداروں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا۔ فصل چہارم میں علامہ اقبال کی نظموں میں مستعمل ومذکور تاریخی و تلمیحی اور سیاسی کرداروں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا، فصل پنجم میں خالص روایتی کردار تحقیقی مباحث کے تحت آئے ہیں۔ فصل ششم "مشاہیر ادب و فلسفہ کے کرداروں کا تحقیقی مطالعہ " میں علامہ کی نظموں میں مذکور و مستعمل مشاہیر ادب و فلسفہ کے کرداروں کا تحقیقی مطالعہ اس انداز میں پیش کیا گیا کہ پہلے مشاہیر شعر وادب اور اس کے بعد مشاہیر فلسفہ کے کرداروں کی تحقیق درج کی گئی، یوں فصل ہفتم "اساتذہ، احباب معاصر اور رشتہ دار کردار" میں بالترتیب اساتذہ، احباب، معاصر اور رشتہ دار کرداروں کا تحقیقی مطالعہ زیر بحث آیا ہے۔

باب چہارم "علامہ اقبال کی اُردو نظموں کے کرداروں کا تنقیدی مطالعہ" کے نام سے ہے۔ یہ مذکورہ مقالے کا نسبتاً طویل تر باب ہے جس کو مزید سات ذیلی فصلوں میں اس انداز میں تقسیم کیا گیا کہ فصل اول "مذہبی ہستیاں یا کردار" میں مذہبی ہستیاں یا شخصیات کے تحت پہلے اللہ تعالیٰ اور انبیائے کرامؑ کے کرداروں کا تنقیدی مطالعہ، فصل دوم میں مابعد الطبیعیاتی کرداروں، فصل سوم میں مذہبی کرداروں، فصل چہارم میں تاریخی، تلمیحی اور سیاسی کرداروں، فصل پنجم میں روایتی کرداروں، فصل ششم میں مشاہیر شعر وادب کے کرداروں اور فصل ہفتم میں اساتذہ، احباب، معاصر اور رشتہ دار کرداروں کا تنقیدی مطالعہ مدلل مستند اور مفصل انداز میں کیا گیا لیکن مذکورہ تنقید و تجزیے کو محض واقعہ نگاری، اسم شماری یا کتب نگاری تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ایک مخصوص علمی منطقی، سائنسی، عالمانہ اور دانش ورانہ انداز میں درج ذیل نکات کو سامنے رکھا گیا۔

۱۔ علامہ اقبال نے اپنے پیغمبرانہ افکار کی تفہیم و ترسیل میں کردار نگاری کے کن کن حربوں کو اپنی نظموں میں استعمال کیا، کیوں کہ ان کے ہاں کردار نگاری محض کرداروں کی جمع آوری تک محدود نہیں بلکہ کردار نگاری متنوع انداز میں مختلف تخلیقی سطحوں پر کامیاب انداز میں موجود ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح رہے کہ کرداروں کی محض جمع آوری اور تخلیقی کردار نگاری میں نمایاں فرق ہے۔

2۔ علامہ اقبال کی اردو نظموں کے کرداروں کے تنقیدی مطالعے کے تناظر میں اقبال کی اس عظیم شعری صلاحیت کو متنوع زاویوں سے بھرپور انداز میں زیر بحث لایا گیا جس سے ان کے کمال فن اور کردار نگاری کی مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

3۔ افکار اقبال کی صورت گری میں مذکورہ کردار کس حد تک ممد و معاون ہیں، کلام اقبال (اردو نظموں) کے حوالے سے مذکورہ کردار اور مذکورہ کرداروں کے حوالے سے کلام اقبال (اردو نظمیں یا بہ الفاظ صحیح تر ان نظموں میں مذکور افکار) کی تفہیم کس حد تک ممکن ہے۔

۴۔ علامہ اقبال کی اردو نظموں کے کرداروں کے متعلق جملہ تفاصیل مہیا کرتے ہوئے فکر اقبال میں اس کی نئی معنوی و فکری جہتوں کا مطالعہ کیا گیا اور علامہ کے اس آفاق گیر پیغام تک ممکنہ حد تک رسائی کی کوشش کی گئی جس کی آج پوری دنیا کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص ضرورت ہے۔

5۔ علامہ اقبال نے اپنی اردو نظموں میں (بوجوہات خاص) بعض کرداروں کی تعریف و تحسین کی اور بعض کی تنقید و مذمت، جس کی وجہ سے ان پر کم نظر مسلمان، محدود اسلامی فلسفے کا حامل، تصوف نا آشنا، حافظ

دشمن، فاشسٹ، قدم بہ قدم فرقہ پرست، جمہوریت کا مخالف، ماضی کا عاشق ،مثالیت پسند، خرد دشمن، صحرائیت و بدویت اور جارحانہ قوت پسندی کا پرچارک، سریانیت کا قائل، نطشے کا چربہ ساز بلکہ مقلد اور مسولینی و لینن کا پجاری جیسے بیسیوں من گھڑت اور غلط الزامات لگائے گئے جس کا مقصد اقبال دشمنی و اقبال شکنی کے بجز کچھ نہیں۔ مذکورہ مقالہ نگار نے اقبال کے کرداروں کے تنقیدی مطالعے کے بعد ممکنہ حد تک خالص تحقیقی و تنقیدی، منطقی، عالمانہ، دانش ورانہ اور غیر جانب دارانہ انداز میں ان الزامات کا نہ صرف رد پیش کیا ہے بلکہ فکر اقبال کی حقیقی جہتیں متعارف کرائی ہیں۔

پانچویں اور آخری باب میں علامہ اقبال کی اردو نظموں کے کرداروں کے مطالعہ کا بحیثیت مجموعی جائزہ اور حاصل تحقیق میں وہ نتائج، حقائق اور تاثرات پیش کئے گئے جو ان کی اردوں نظموں میں موجود وسعتوں اور تہہ در تہہ پوشیدہ معنوی قرینوں کے دوران فنی و فکری انگڑائیاں لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ مقالہ نگار نے مجموعی جائزہ میں طویل حاصل تحقیق یا طویل تر مجموعی جائزہ سے گریز کیا اور مقالہ ہذا کے کلیدی موضوع و بحث کو اولین ترجیح دیتے ہوئے تمام مباحث کو علامہ اقبال کی اردو نظموں اور نظموں کے کرداروں تک محدود رکھا تاکہ موضوع کی انتہائی حد تک گرہ کشائی کو ممکن بنایا جا سکے۔ علامہ اقبال کے افکار کا خمیر مذاہب عالم، تاریخ عالم، سیاست عالم کے علاوہ مختلف سماجی علوم فلسفہ، اقتصادیات، معاشرت، بشریات، وغیرہ سے اٹھ اٹھ کر نظم کے پیچیدہ پیکر میں جلوہ گر ہوتا ہے مزید برآں ان کے فکر و فلسفہ کی گرہ کشائی کردار نگاری جیسے جدید تنقیدی رویے کے تحت کرنا بجائے خود کوہ گراں کاٹنے اور جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ موضوعات کی تفہیم میں انتہائی حد تک تسہیل کی خاطر مقالہ نگار نے مقالے کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنے کے بعد، ان ابواب کو ذیلی فصول اور ان فصول کو مزید ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا نیز حوالہ جات کا اندراج ہر باب کے آخر میں یا مقالہ کے آخر میں کرنے کی بجائے ہر فصل کے آخر میں کیا گیا۔ اس تکنیک سے یقیناً موضوعات کی تفہیم میں آسانی پیدا ہو گئی ہو گی۔

تانیثیت:

تانیثیت ایسی سوچ اور طرز فکر کا نام ہے، جو ظلم و تشدد اور جبر و دھونس کے رویوں کی مذمت کرتے ہوئے جائز حقوق کی متقاضی ہے۔ یہ عورت کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا نتیجہ ہے کہ جہاں کہیں پسی ہوئی عورت نے اپنے حقوق کے تحفظ کی بات کی تو جسمانی و ذہنی اذیتوں کے علاوہ جلا دی گئی یا خودکشی کا رنگ دے کر مار دی گئی۔ موجودہ دور کی عورت اپنے بارے میں قائم کردہ فرسودہ تصورات کے خلاف باغیانہ روش اختیار

کر رہی ہے اور نہ سمجھے جانے کا قصہ بننے کی بجائے اپنی سوچ کی عکاس بن گئی ہے۔ تانیثی طرز فکر کے حامل مصنفین نے شعور وادراک سے قلم کے ذریعے آگہی کی شمع روشن کر دی ہے۔

موجودہ دور میں عورتوں کی اقتصادی خود مختاری بہت بڑا انقلابی قدم ہے، جس میں ہر طبقے اور ہر عمر کی عورت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے لیکن بیشتر مرد، عورت کے ہم قدم ہونے کی بجائے اپنی شخصیت کے اصل جوہر، محبت شاقہ و جستجوئے معاش کھو کر آرام طلبی کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور نفسیاتی طور پر حاکمیت کے طلسم کدے کے ٹوٹنے کے خوف سے جبر، بے جا دھونس اور تشدد کے علاوہ عورت کے مالی وسائل پر قابض ہو رہے ہیں۔ میڈیا وار کے منفی پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ بھی نکل رہا ہے کہ تیسری دنیا کے ترقی پزیر ممالک میں جدیدیت کی آڑ میں خانگی نظام کی دھجیاں بکھر رہی ہیں۔ عورت جو گھریلو زندگی کے استحکام میں کلیدی کردار ادا کر رہی تھی۔ مسلسل استحصال اور مرد کے عدم تعاون کی وجہ سے اب وہ مرد کی بے وفائی اور بے راہ روی کے بدلے میں اُسی روش کو اختیار کرنے پر بھی آمادہ ہو رہی ہے۔ اس رد عمل کی شدت کو کم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ مرد و عورت کے مابین معاندانہ اور غاصبانہ مزاج میں تبدیلی لاتے ہوئے دوستانہ رویے کو فروغ دیا جائے تاکہ خانگی زندگی میں استحکام کے علاوہ بڑھتی ہوئی شرح طلاق پر قابو پایا جا سکے۔ ذیل میں پاکستانی جامعات میں "تانیثیت" کے پس منظر میں لکھے گئے تحقیقی مقالہ جات کا مطالعاتی جائزہ پیش ہے۔

موضوع مقالہ: " تانیثیت اور پاکستانی اردو ادب "

مقالہ نگار: نورین روبی، 2010ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد سلیم ملک، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

عورت کے بارے میں بیشتر اوہام و نظریات اور رویہ جات کی تاریخ بہت قدیم ہے اور ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے۔ مذکورہ بالا مقالہ نگار نے اردو ادب میں تانیثیت کے اہم موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریری کیا ہے۔ یہ مقالہ چار تفصیلی ابواب پر مشتمل ہے، جن میں سے باب سوم کو مزید پانچ ذیلی فصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان "تانیثیت: تاریخ، تہذیب اور مذہب کے آئینے میں" ہے۔ مقالہ نگار نے اس میں عورت کے بارے میں قائم کردہ مختلف نظریات، اوہام مفروضات کی تاریخی، تہذیبی وسماجی اور مذہبی محرکات وعوامل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت اختصار کے ساتھ دُنیا کے بڑے مذاہب میں عورت کے متعین کردہ حقوق کا تقابل و موازنہ کیا گیا ہے۔ مزید براں، اُن تمام عوامل کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جو موجودہ دور کی عورت کے استحصال اور جائز حقوق کی عدم دستیابی کا سبب ہیں۔ دوسرا باب بعنوان "تانیثیت اور پاکستانی

اردو شاعری "میں خواتین مصنفین کو ادبی تاریخ میں نظر انداز کیے جانے کی وجوہات کے علاوہ شعوری و لاشعوری سطح پر ہونے والے رد عمل کی صورت میں منظر عام پر آنے والی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم "تانیثیت اور پاکستانی اُردو نثر" میں اُردو ادب کے تانیثی ادبی نثری سرمائے کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں ایسی اصناف منتخب کی گئی ہیں جن میں تانیثیت کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ مقالہ نگار نے اس باب کو مزید پانچ ذیلی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔اس کے ذیلی پانچ حصوں کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(ا)۔ "تانیثیت اور پاکستانی اُردو ناول" میں تانیثی ناول نگاروں نے حقوق نسواں کا شعور اُجاگر کرنے کے علاوہ عورت کو درپیش مسائل و مشکلات کی تصویر کشی اور اُن محرکات کی نشاندہی بھی کی ہے جو اس استحصال کا سبب بنے۔ مرد اور عورت کی جنسی گراوٹوں، سماجی بے حسیوں، احساس تنہائی، اعصابی تھکن کے علاوہ ایثار و قربانی کے باوجود سماجی استبدادی رویوں اور نفرت کے باعث، عدم توازن کی شکار عورت کے مسائل موضوع بنائے گئے ہیں، تانیثی ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر حجاب امتیاز علی، جمیلہ ہاشمی، شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، نثار عزیز بٹ، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی اور انتظار حسین، رضیہ فصیح احمد لقیس ریاض، ڈاکٹر سلیم اختر اصغر ندیم سید انوار صدیقی اہم نام ہیں۔ خانگی ادب جس کی بنیاد ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری نے رکھی تھی۔ رضیہ بٹ، اے آر خاتون، فاطمہ ثریا بجیا اور ان کے تتبع میں لکھنے والوں میں بشریٰ رحمٰن، سلمیٰ کنول، رفعت سراج اور عمیرہ احمد وغیرہ نے تانیثی ناول نگاری کی عمارت استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

(ب)۔"تانیثیت اور پاکستانی اُردو افسانہ" میں مقالہ نگار نے فسادات کے دوران عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم، اپنوں کی بے حسی، جنسی استحصال کی مختلف صورتوں کو نمایاں کیا ہے۔ خدیجہ مستور، ممتاز شیریں، احمد ندیم قاسمی، جیلانی بانو خالدہ حسین کی سماجی حقیقت نگاری کا نتیجہ ہے کہ موجودہ دور میں نیلم احمد بشیر، بشریٰ اعجاز، داؤد رہبر، انوار صدیقی، عطیہ سید، زاہدہ حنا اور اُمِ عمارہ جیسے نام منظر عام پر آئے۔ اس دور کی سماجی کجیوں اور بدلتی اقدار و طرز زندگی نے عورت کے مسائل میں جس طرح اضافہ کیا ہے، اُن میں گھریلو زندگی کے مسائل کے علاوہ ہسپتالوں بازاروں، دورانِ سفر یا جائے ملازمت پر جنسی طور پر ہراساں کرنا، جنسی تشدد اور ملازمت پیشہ عورتوں کو درپیش خانگی و سماجی مشکلات سر فہرست ہیں جو افسانے میں موضوعاتی تنوع میں اضافے کا باعث بنی۔

(ج)۔ "تانیثیت اور پاکستانی اُردو ڈراما "میں راقمہ نے اشفاق احمد، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، یونس جاوید، امجد اسلام امجد اور مستنصر حسین تارڑ وغیرہ کے ڈراموں میں گھروں میں کام کرنے والی ملازماؤں اور نوکرانیوں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچے طبقے کی عورتوں کے استحصال اور اُن کو درپیش مسائل کو پیش کیا ہے۔ تانیثی سوچ و فکر کے اعتبار سے بانو قدسیہ کے ڈرامے فوقیت کے حامل ہیں کیونکہ وہ صنفی تخصیص کو مد نظر رکھے بغیر میاں بیوی کی عدم مطابقت کی بنیادی وجہ بد عہدی اور خیانت کو قرار دیتی ہیں۔ عورت کے استحصال کی داستان، لڑکیوں کی شادی و جہیز کے مسائل، سسرال کے مظالم مار پیٹ، خانگی تشدد کی مختلف صورتیں، بے جوڑ اور وٹہ سٹہ کی شادیوں کے بُرے انجام، طلاق کی دھمکیوں سے پیدا ہونے والے عدم تحفظ کے احساس اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا بیان، ان کے ڈراموں کے وہ خاص موضوعات ہیں جو انھیں اپنے عہد کے ڈرامانویسوں میں ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔

(د)۔"تانیثیت اور پاکستانی اُردو خود نوشت سوانح عمری "میں تانیثیت کے حوالے سے جو پہلو بیان کیے گئے، ان میں شوہر کی بے جا حاکمیت اور عدم توجہی کے باعث عورت جن اذیتوں کا شکار ہوتی ہے، اس کی عکاسی ملتی ہے۔

(ہ)۔" تانیثیت اور پاکستانی اُردو تحقیق و تنقید" میں تانیثی طرز فکر کے نمائندہ محققین و ناقدین کے تانیثی تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ اُردو ادب میں تانیثیت کے اثرات شاعری سے زیادہ نثر میں دستیاب ہوئے ہیں، اس لیے مقالہ نگار نے مقالے کا تیسرا باب تانیثیت اور پاکستانی اُردو ادب پانچ ذیلی موضوعات میں تقسیم کیا۔

باب چہارم " تانیثیت کے اثرات مستقبل کے پاکستانی اُردو ادب پر " کے زیرِ عنوان ہے، جس میں حال کے آئینے میں فردا کی تصویر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کیوں کہ ماضی کے اثرات اور حال کے واقعات وہ بنیاد تیار کرتے ہیں، جس پر مستقبل کی عمارت ایستادہ ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں سماجی اور افرادی سطح پر نفسیاتی تبدیلیوں میں توازن اُسی صورت بحال ہو سکے گا جب مرد و عورت کے بارے میں قائم کردہ اوہام و مفروضات اور فرسودہ رسوم و رواج کی بیخ کنی کی جائے گی اور عورت کو بحیثیت انسان تسلیم کرتے ہوئے مرد و عورت کے خلاف مخالفانہ و غاصبانہ رویے کی بجائے معاونت اور تسلیم کرنے کا رویہ اختیار کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔ چوں کہ کمپیوٹر ایج کی سب سے بڑی ضرب مذہب و اخلاقیات پر پڑ رہی ہے۔ اس لیے اخلاقی اقدار میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جو روایت شکن اور باغیانہ روش کی بجائے

مفاہمانہ طرز کا حامل ہو اور نئی نسل کی نفسیاتی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی اور اخلاقی اقدار کی تطہیر کا باعث ہو۔ یہ فریضہ قلم کار بخوبی انجام دے سکتے ہیں، کیوں کہ معتدل و مثبت طرز فکر ہی ایک اچھی سوچ و عمل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ لہذا جہاد بالقلم کے ساتھ ساتھ تمام تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعے صنفی امتیازی رویوں کی مذمت کرتے ہوئے معاشرے کی صحت مند اخلاقی اقدار کی ترویج ہی انتشار اور ذہنی خلفشار کے اس دور میں شجر سایہ دار ثابت ہوگی۔ مذکورہ باب میں مقالہ نگار کی طرف سے ایسے نکات پیش کیے گئے ہیں جو امکانی صداقتوں پر مبنی ہیں۔ مقالے کے آخر میں محاکمہ پیش کیا گیا ہے جس میں تانیثیت اور پاکستانی اُردو ادب کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، جس کے مطابق عورت کے بارے میں نئے تصورات اور سماجی رویوں کو تاریخی، تہذیبی اور مذہبی تناظر میں جانچنے کے علاوہ اصناف نظم و نثر میں تانیثیت کے مختلف پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

موضوع مقالہ: " نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کا کردار "

مقالہ نگار: منزہ مبین، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر حمیرا اشفاق، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالہ نگار نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ کی کاوشیں اور ان میں بیگمات بھوپال کا کردار" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے اٹھارھویں صدی میں برصغیر کا سیاسی و سماجی پس منظر بالخصوص سامراجی و نو آبادیاتی تناظر میں اس کا احاطہ کیا گیا ہے، علاوہ ازیں ہندوستانی معاشرے میں تعلیم نسواں، تعلیم نسواں کی حمایت و مخالفت، سرسید اور ان کے رفقا "حالی، ڈپٹی نذیر احمد، شیخ عبد اللہ، مولوی ممتاز علی، شیخ اکرام" وغیرہ کی خواتین کے لیے تعلیمی کوششوں، بھوپال میں طبقہ نسواں کے لیے علمی و ادبی کاوشوں اور ان میں بالخصوص بیگمات بھوپال کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم "نواب سکندر جہاں بیگم کی تصانیف میں فروغ تعلیم نسواں کی کاوشیں: ایک مطالعہ " کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں نواب سکندر بیگم کی تعلیم و تربیت، نواب سکندر بیگم کی تعلیمی کوششیں، سکولوں کا اجرا اور ان کا انتظام و انصرام، مسلم لیڈیز کانفرنس کا افتتاح، مدرسہ حرفت و اناث وغیرہ کا قیام، نواب سکندر جہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی، اردو ادب کی سرپرستی اور سرسید احمد خاں کی حوصلہ افزائی وغیرہ کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم " نواب شاہجہاں بیگم کی تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے فروغ کی کاوشوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ " کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں نواب شاہجہاں بیگم کی ولادت اور تعلیم و تربیت، نواب شاہجہاں بیگم کی تعلیمی کاوشیں، نواب شاہجہاں بیگم کی تصنیفات اور ذوق علمی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم کا عنوان "نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیم و تصنیفات اور ذوق علمی کا تنقیدی مطالعہ " ہے۔ اس باب میں نواب سلطان جہاں بیگم کی ولادت اور تربیت، نواب سلطان جہاں بیگم کی تعلیمی کوششیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام، ندوۃ العلما کی اصلاح، آل انڈیا کانفرنس کی تحریک، انجمن ترقی اردو کی مالی و قلمی معاونت، محمڈن کالج کی سرپرستی، نواب سلطان جہاں بیگم کی تصنیفات، لیکچرز اور تقاریر وغیرہ کا طبقہ اناث کے تعلیمی سروکار کے حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ باب پنجم "بیگمات بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کے نتیجے میں بھوپال کی علمی و ادبی ترقی: تجزیاتی مطالعہ " سے متعلق ہے۔ مقالے کے آخر میں موضوع "نو آبادیاتی ہندوستان میں تعلیم نسواں کے فروغ میں بیگمات بھوپال کی ادبی خدمات" کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: " پاکستانی اردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " (1947ء تا 2000ء)

مقالہ نگار: فوزیہ رانی، 2011ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

عورت عالمی ادب کا ایک اہم موضوع اور افسانوی تحریروں کا مرکزی کردار رہی ہے۔ ادب کی تخلیق اور نسوانی کردار نگاری پر زیادہ تر مرد ہی حاوی رہا ہے۔ گزشتہ صدی میں تانیثی نظریات کے پیش نظر اس امر کا احساس شدت سے کیا جانے لگا کہ انسانیت اور نسائیت لازم و ملزوم ہیں۔ عورت کی انسانی حیثیت کی بحالی اور اُس کے وجود کو تسلیم کرنے کی ضرورت کا خیال پیدا ہوا تو ادب میں عورت کی کردار نگاری کے جملہ نقائص بھی سامنے آئے اور یہ احساس بھی بیدار ہوا کہ عورت کا تخلیقی تجربہ مرد کے تخلیقی تجربے سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ عورت کے احساسات و جذبات کو عورت ہی بہتر سمجھ سکتی ہے۔ اس لیے عورت کی کردار سازی بھی عورت ہی بہتر انداز میں کر سکتی ہے۔ عورت کی طرح سوچنا، محسوس کرنا اور عورت ہونا دو مختلف تجربے ہیں۔ اس تناظر میں خواتین کے افسانوی ادب میں نسوانی کرداروں کا مطالعہ دوہری اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے تحقیقی مقالے میں خواتین افسانہ نگاروں کو جگہ دی ہے۔ مقالہ نگار نے مذکورہ بالا مقالے میں ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان افسانہ نگار خواتین کے تخلیق کردہ نسوانی کرداروں کا مطالعہ

شامل ہے۔اس مقالے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقالے کے موضوع کے مطابق صرف پاکستانی افسانہ نگار خواتین کو شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ مثلاً قرۃ العین حیدر قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۶۱ء تک پاکستان میں مقیم رہیں۔ اُن کے صرف اِسی دور کے افسانوں کو شامل مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں ۱۹۴۷ء سے ۲۰۰۰ء کے دوران شائع ہونے والے افسانوی مجموعے تحقیق کا اولین ماخذ ہیں۔ رسائل اور انتخابات سے افسانے نہیں لیے گئے۔ مذکورہ مقالے کے بارے میں مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

> "خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب کرتے ہوئے سب سے پہلے اہم اور نمائندہ افسانہ نگار خواتین کو شامل تحقیق کیا ہے۔ اس کے بعد چند غیر معروف خواتین افسانہ نگار بھی اپنے نسوانی کرداروں میں اپنے عہد کی پاکستانی عورت کی عکاسی کی وجہ سے مقالے میں شامل ہیں۔ مقالے میں عورت کی کمتر سماجی حیثیت اور مردانہ استحصال کے خلاف متشدد احتجاجی رویہ اپنانے والی افسانہ نگار خواتین کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے تا کہ نسوانی کردار نگاری کے سارے زاویے سامنے آسکیں"۔(10)

مذکورہ مقالے کی ابواب بندی موضوعاتی اعتبار سے ہے اس لیے مختلف ابواب میں یا ایک ہی باب کے مختلف حصوں میں افسانہ نگار خواتین کے ناموں کی تکرار بھی نظر آتی ہے۔ افسانہ نگار خواتین کی ترتیب اُن کے اولین افسانوی مجموعے کی اشاعت کے حوالے سے ہے اور مقالہ نگار نے ایک ہی باب کے مختلف ذیلی عنوانات کے تحت بھی ہر مرتبہ اس ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ کرداروں کے مطالعے کے دوران افسانے کا نام اور جس افسانوی مجموعے میں وہ افسانہ شامل ہے، دونوں کی نشاندہی عبارت میں کر دی گئی ہے تاہم ہاجرہ مسرور، رضیہ فصیح احمد اور فردوس حیدر کے افسانوی کلیات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں کے ناموں کے ساتھ مجموعے کی نشاندہی کا التزام نہیں کیا گیا۔ اس مقالے کا پہلا باب تانیثیت کی تعریف اور متعلقہ مباحث پر مشتمل ہے۔ تانیثی ادبی نظریے کے خدوخال واضح کرتے ہوئے تانیثی ادیب، تانیثی قاری اور تانیثی متن کے ساتھ ساتھ تانیثی لسانی مطالعات کے اہم پہلو بھی بیان کیے گئے ہیں۔ مرد ادیبوں کے ہاں عورت کے کردار اور خواتین قلم کاروں کے ہاں عورت کی پیش کش کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پاکستانی عورت کی تاریخی اور سماجی صورت حال کے حوالے سے اُس کے تانیثی شعور کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں کردار نگاری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ادبی کردار کی تعریف اور افسانے میں کردار کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اردو افسانے میں کردار نگاری کے مختلف رجحانات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرے باب

میں رشتوں کے حوالے سے تخلیق ہونے والے نسوانی کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پاکستانی افسانہ نگار خواتین عورت کے سب سے زیادہ کردار اس کے رشتوں کے حوالے سے ہی تخلیق کرتی ہیں۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی، بیوہ اور محبوبہ کے روپ میں عورت کے کردار کے متنوع پہلوؤں کا مطالعہ اس کی فنی و موضوعاتی قدر و قیمت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ چوتھا باب پیشوں کے حوالے سے تخلیق ہونے والے نسوانی کرداروں پر مشتمل ہے۔

پانچواں باب واحد متکلم نسوانی کرداروں اور جدید عہد کی عورت کی کردار نگاری کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ جدید دور کی روایتوں اور قدروں کی اصلاح کی خواہش مند، ان کے انہدام کی کوشش میں منفی رویہ اپنانے والی اور عورتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والی تین بڑے رجحانات کی حامل خواتین کے کردار اس باب میں شامل ہیں۔ چھٹے باب میں افسانہ نگار خواتین کے افسانوں سے ایسے نسوانی کرداروں کا انتخاب کیا گیا ہے جن کے رشتے اور خاندانی وسماجی حوالے ان کے وجود کی شناخت معدوم نہیں کرتے بلکہ وہ اپنا تشخص تلاش کرنے اور اپنی انفرادیت کا اظہار کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کرداروں کا مطالعہ تین بڑے رجحانات کے تحت کیا گیا ہے۔ اولین رجحان فیصلے اور ذات کے اثبات کی خواہش کا ہے۔ دوم باطن کے حوالے سے عورت کے انفرادی اور اجتماعی اظہار کے رویے کے حامل کردار ہیں۔ سوم جذباتی ونفسیاتی ضرورتوں اور حالتوں کے حوالے سے انفرادی اظہار کے حامل کردار اس میں شامل ہیں۔ ساتویں باب میں حاصل مطالعہ کے عنوان کے تحت تحقیق کے نتائج بیان کیے گئے ہیں۔

موضوع مقالہ: " اردو مضمون نویسی کے ارتقا میں خواتین کا حصہ "(1898ء تا 1930ء)

مقالہ نگار: فرزانہ اقبال، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، پشاور یونیورسٹی، پشاور

ہندوستان میں خواتین کی اُردو مضمون نگاری کی تاریخ طویل ہے۔ مگر اب تک یہ تاریخ پردہ اخفا میں رہی۔ مرد ادبا کی ناپسندیدگی اور خواتین کی تخلیقات سے بے اعتنائی کا رویہ، مستورات کی تحریروں کو کم درجہ کا ادب قرار دے کر ان کی صلاحیتوں سے انکار اور موجودہ دور کے محققین کی سُستی ایسے عوامل ہیں کہ اب تک اُردو ادب میں خواتین کے ابتدائی مضامین کو مرد حضرات کی تحریریں قرار دیا جاتا رہا ہے۔ کرم زدہ رسائل میں مستورات کی ہزاروں تحریریں پردہ گمنامی سے باہر منظر عام پر آنے کی منتظر ہیں۔ اس دشت میں کوئی قدم رکھنا بھی چاہے تو مواد کی عدم دستیابی یا نایاب ہونے کا ڈراوا اور مردوں کی تحریروں کا بہکاوا ابتدا سے ہی بطور

توشہ سفر ہمراہ باندھ دیا جاتا ہے۔ نسل در نسل منتقل ہونے والی غلط فہمی سینہ بہ سینہ موجودہ دور کے محققین ادب کو اس یقین کے ساتھ ادبی ورثہ کی صورت سونپی گئی ہے کہ اُردو مضمون نگاری میں خواتین کی مضمون نگاری کا کوئی حصہ موجود نہیں ہے۔ خواتین کے رسائل میں شائع شدہ مضامین کی حقیقت یہ ہے کہ مصلحان قوم نے طبقہ اناث کے بختِ خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے اپنی تحاریر کو مستورات کا فرضی نام عطا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ محققین ادب پرانے موضوعات میں تحقیق کے نئے پہلو تلاش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ ادب کے ان موضوعات پر مواد کی تلاش اور چھان پھٹک کا کٹھن مرحلہ طے نہیں کرنا پڑتا۔ رسائل کی گرد جھاڑ کر کم و پیش ایک صدی قبل تحریر کردہ مضامین کا جائزہ لے کر حقائق کو منظر عام پر لانے کی تگ ودو اس لحاظ سے بھی مشکل امر ہے کہ یہ قدیم رسائل، لائبریریوں میں ترتیب سے سجے سجائے نظر بھی نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب کی دیگر اصناف میں خواتین کی تخلیقات بہت تاخیر سے منظر عام پر آئیں۔

یہ ہی رویہ اُردو مضمون نگاری کے ارتقا میں خواتین کے کردار کا بھی ہے۔ تاریخ ادب اردو، صحافت اور اردو رسائل و جرائد کی تاریخ سے لے کر اُردو مضمون نگاری کی تاریخ اور تحقیقی مقالہ جات میں خواتین کے رسائل کا ذکر تو ایک دو سطور میں شامل جاتا ہے مگر مضمون نگار خواتین کے نام اور مضامین کے ذریعے سماجی، تہذیبی و سیاسی خدمات کا تذکرہ ناپید ہے۔ بر سبیل تذکرہ یہ موضوع سامنے آ بھی جائے تو خواتین کے لئے شائع ہونے والے اخبارات کے ضمن میں مصلحانِ قوم مولوی ممتاز، علامہ راشد الخیری اور شیخ عبداللہ کے قومی کارناموں میں مستورات کی تحاریر و تخلیقات دب جاتی ہیں۔ اس مضمون کے انتخاب کے حوالے سے مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

> "اس موضوع کے انتخاب کا بنیادی مقصد خواتین کی مضمون نگاری، حقائق، موضوعات اور خواتین کی تحریروں کے معاشرے پر اثرات کا جائزہ لینا تھا۔ نیز یہ تاثر زائل کرنا تھا کہ خواتین کی مضمون نگاری ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دیگر تانیثی ادب کی طرح ہندوستان میں خواتین کی اُردو مضمون نگاری بھی ۱۹۳۰ء سے قبل مستحکم بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کر چکی تھی"۔(11)

مذکورہ بالا تحقیقی مقالہ کا باب اول "تعارف" ہے اس باب کے تین ذیلی عنوانات ہیں۔ "اُردو مضمون نگاری کا ارتقا" میں اُردو مضمون نگاری کے ارتقا اور تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو مضمون نگاری کے

ضمن میں اداروں، رسائل اور شخصیات کے کردار اور خدمات کو مختصراً بیان کیا ہے۔ "اُردو مضمون نگاری اور خواتین" کے عنوان کے تحت چیدہ چیدہ خواتین کی اُردو مضمون نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ "پردہ نشیں مضمون نگار خواتین" کے ذیلی باب میں ان مضمون نگار خواتین کا تعارف اور خدمات پیش کی گئی ہیں جنہوں نے قلمی یا فرضی نام اختیار کر کے اُردو مضامین تحریر کئے اور مختلف رسائل میں شائع کروائے۔ قلمی نام سے مضامین تحریر کرنے والی خواتین کی حیثیت کیا تھی؟ کیا یہ مضامین مرد ادبا کے تحریر کردہ تھے؟ اور مستورات کو فرضی نام اختیار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان حقائق کا ناقدانہ اور محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم "محمدی بیگم اور رسالہ تہذیب النسواں" ہے اس میں اُردو کی پہلی خاتون مدیرہ "محمدی بیگم" کی حیات، شخصیت اور ادبی کارناموں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ محمدی بیگم کے رسالہ "تہذیب النسواں" کی اشاعت سے بیداری اور اصلاح نسواں کے ضمن میں ادا کردہ کردار کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم میں اُردو ادب کی ابتدائی اور اہم مضامین نگار خواتین "عباسی بیگم" اور "خاتون اکرم" کے مضامین کا جائزہ پیش گیا ہے۔ ان کے تحریر کردہ مضامین میں عصری شعور تربیت نسواں، امور خانہ داری، اصلاح معاشرت، دنیا کی بے ثباتی اور اسلامی اقدار کے پہلوؤں کا تحقیقی و تنقیدی اور توضیحی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نیز مضامین کی اہمیت وافادیت پر بحث کی گئی ہے۔ باب چہارم "نذر سجاد حیدر" اور "ظفر جہاں بیگم" کے مضامین کے توضیحی جائزہ پر مشتمل ہے۔ ان مضامین نگار خواتین کے ہاں حقوق نسواں، تعلیم نسواں اور سماجی مسائل کے تجزیہ کی نوعیت پر بحث کی گئی ہے۔ عصری مسائل، جدید تہذیب پر مباحث اور مضامین میں دعوتِ فکر و عمل کے پہلو اُن مستورات کے مضامین کا بنیادی مقصد رہا ہے۔ اس ضمن میں ان مضامین کے سماج پر اثرات کا مطالعہ اور موازنہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی ممتاز شخصیت "حجاب امتیاز علی" نے جہاں دیگر اصناف میں خامہ فرسائی کی وہیں ان کے مضامین بھی رسائل نسواں کی زینت بنتے رہے۔

باب پنجم میں حجاب امتیاز علی کی مضمون نگاری کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حجاب کے مضامین مین رومانیت، ماضی پرستی، فلسفہ زندگی، ماضی پرستی کے عناصر کی نشاندہی ملتی ہے۔ اس باب میں حجاب کے مضامین کا فکری جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کے اسلوب اور فن کا ناقدانہ تجزیہ بھی اس باب کا حصہ ہے۔ اردو ادب کی چند اہم مضمون نگار خواتین کے مضامین کو باب ششم میں جگہ دی گئی ہے۔ یہ خواتین معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتی تھیں۔ ان کا اثر ورسوخ تعلیم نسواں و حقوق نسواں کے ضمن میں اہمیت کا

حامل تھا۔ نواب شاہجہاں بیگم، نواب سلطان جہاں بیگم، بیگم صغری ہمایوں مرزا، اور رضویہ خاتون نے مضمون نگاری سے طبقہ نسواں کی بیداری کا فریضہ انجام دیا۔ ان مضامین نگار مستورات نے سماجی، مذہبی اور اخلاقی شعور بیدار کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان مستورات کے مضامین کا فکری جائزہ اس باب میں پیشکیا گیا ہے۔ باب ہفتم میں موضوع اور مواد کا مجموعی جائزہ اور نتائج پیش کئے گئے ہیں۔ اس باب میں خواتین کے مضامین کا مقام ومرتبہ اور قدومنزلت کا تعین کیا گیا ہے۔ تمام کتب ورسائل، اخبارات اور ماخذات جن سے اس مقالہ کی تسوید میں مددلی گی گئی، مقالہ کے آخر میں "کتابیات" کی صورت ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں۔

موضوع مقالہ: " پاکستانی اردو شاعرات پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے اثرات "

مقالہ نگار: عائشہ حمید، 2010ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد آفتاب احمد، نمل، اسلام آباد

بیسویں صدی کا آغاز ایک ہنگامہ خیز عہد کا آغاز ہے۔ مختلف سماجی، سیاسی اور سائنسی رجحانات اس صدی میں بعد ازاں تحریکوں کی شکل اختیار کر گئے۔ ان رجحانات کے پیش نظر رومانوی تحریک، انجمن ترقی پسند مصنفین یا ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے تحت کئی جدید تحریکیں اور رجحانات سامنے آئے۔ ان رجحانات اور تحریکوں نے انسانی زندگی کے کئی دیگر پہلوؤں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ بیسویں صدی کی ان جدید ادبی تحریکوں اور سیاسی و سماجی حالات نے ادب کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ اُردو کی ادبی تحریکوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان تحریکوں کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے عام طور پر مردانہ ادب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ خواتین بھی اسی ادبی اور سماجی فضا کا حصہ ہیں جن میں یہ تحریکیں پروان چڑھیں۔ ان کا ادب ان تحریکوں سے ماورا رہتے ہوئے خلاؤں میں ترتیب نہیں پاتا لیکن جامعاتی اور غیر جامعاتی تحقیق میں ایسا تحقیقی جائزہ کم ہی نظر آتا ہے جس سے خواتین کے ادب پر بیسویں صدی کی تحریکوں اور رجحانات کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہو۔ اُردو شعر وادب میں خواتین شعرا کا ایک نمایاں حصہ رہا ہے تاہم برصغیر کے سیاسی وسماجی حالات اور علمی و ادبی صورت حال نے خواتین شعرا کے نمایاں ہونے کے مواقع پیدا نہ ہونے دیے اس لیے بہت سی خواتین شعرا وادبا ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گئیں۔ شاعری کے میدان میں خواتین کو ۱۹۴۷ء سے قبل اپنے نمایاں اظہار کا موقع نہ مل سکا تھا۔ اس خطے کی سیاسی و

جغرافیائی تبدیلی کے باعث یہ بات عام مشاہدے میں آتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو شاعری میں شاعرات کا نمایاں کردار نظر آنے لگا۔

بیسویں صدی کی نمایاں تحریکوں کے اثرات پچاس کی دہائی تک آتے آتے اُردو شعر و ادب میں نمایاں صورت اختیار کر چکے تھے۔ سرسید تحریک کی عقلیت پرستی اور ٹھوس استدلالی انداز کے ردِ عمل میں رومانوی طرزِ فکر نے جنم لیا۔ رومانوی تحریک نے جذبہ تخیل کی بنیاد پر ادب کی تخلیق پر زور دیا۔ سرسید تحریک اور رومانوی تحریک کے انتہا پسند رویوں کے نتیجے میں ترقی پسند تحریک کا جنم لینا ایک فطری امر تھا۔ ترقی پسند تحریک نے بنیادی طور پر زندگی اور اس کے گردوپیش کو اہم گردانا یوں ادب برائے زندگی کا رویہ برتا جانے لگا۔ اس طرح بیسویں صدی کے اولین تین عشروں میں ادب میں حقیقت نگاری نے فروغ پایا۔ ترقی پسند تحریک نے خارجی زندگی کے عوامل کا بالواسطہ اظہار کیا اور انسان کے داخل سے اغماز برتا۔ اس تحریک کے متوازی ایک ایسی تحریک روبہ عمل دکھائی دیتی ہے جس نے انسانی زندگی کے خارج کو اہم گردانتے ہوئے اس کے داخل کی پراسراریت کو بھی موضوع بنایا۔ اس حلقے کے زیر اثر اُردو ادب میں جدید رجحانات متعارف ہوئے۔ ۱۹۶۰ء اور 1970ء کے عشرے میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی فلسفیانہ تحریکوں کی بدولت نئے ادبی رویے اور رجحانات اُردو شعر و ادب میں نفوذ پذیر ہوئے۔ اسی عہد میں فیمینزم (Feminism) کے اثرات نے شاعرات کو ایک بڑی سطح پر متاثر کیا۔ مقالے کے حوالے سے مقالہ نگار لکھتی ہیں:

> "اس مقالے میں ان شاعرات کے فن کا تجزیہ کرنا بھی مقصود ہے جو اب تک ادبی منظر نامے پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے واضح اور نمایاں اثرات کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ اس مقالے میں اس مقصد کے حصول کی کما حقہ کوشش کی گئی ہے"۔(12)

یہ مقالہ پاکستانی خواتین کی اُردو شاعری پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے فکری و موضوعاتی اثرات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں اُن پاکستانی خواتین کی اُردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں سے فکری و موضوعاتی اثرات قبول کیے۔ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں برصغیر کی سماجی و تہذیبی صورت حال کے زیر اثر خواتین شعرا کے ارتقائی سفر کا مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں ان ابتدائی شاعرات پر تحریک انجمن پنجاب کے اثرات کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم میں رومانوی تحریک کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان نمائندہ شاعرات کا خصوصی مطالعہ کیا گیا

ہے جنھوں نے رومانوی تحریک کے فکری عناصر کو اپنی شعری تخلیقات میں برتا۔ ان شاعرات کے کلام کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جن کے ہاں رومانوی عناصر جزوی صورت میں موجود ہیں۔ باب سوم ترقی پسند تحریک کے آغاز و تعارف کے ساتھ ترقی پسند فکر سے متاثر نمائندہ شاعرات کے خصوصی مطالعے پر مشتمل ہے۔ وہ شاعرات جن کے ہاں ترقی پسند موضوعات عمومی صورت میں موجود ہیں انہیں مجموعی مطالعے کے ضمن میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب چہارم میں حلقہ ارباب ذوق کے مختصر تعارف کے بعد اس تحریک کے زیر اثر جنم لینے والے جدید فکری رجحانات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس باب میں ایسی خواتین شعرا کا خصوصی مطالعہ کیا گیا ہے جن کے کلام میں جدیدیت سے اثر پذیری کا عنصر نمایاں ہے۔ باب پنجم میں نسائی شعور کی تحریک کے ارتقائی سفر کی نشان دہی کرتے ہوئے تانیثیت کے مباحث کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان نمائندہ اُردو شاعرات کا خصوصی مطالعہ کیا گیا ہے جن کے ہاں نسائی شعور کی علمبر داری کا احساس ملتا ہے۔ وہ شاعرات جن کے ہاں یہ موضوعات ذیلی صورت میں موجود ہیں انہیں عمومی مطالعے میں جگہ دی گئی۔ باب ششم تمام مذکورہ مباحث کے نتائج اور محاکے پر مشتمل ہے۔

تخلیقی اظہار کی سطح پر کبھی بھی ممکن نہیں رہا کہ عورت کی نفسی کیفیات کو من و عن کوئی مرد بیان کر سکے۔ اس لیے مقالہ نگار نے اس مقالے میں جہاں یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ بیسویں صدی کی ان جدید ادبی تحریکوں نے اُردو شاعرات پر کیا اور کون سے اثرات مرتب کیے، وہیں اس بات کا جائزہ بھی لیا کہ خواتین شعرا نے خالصتاً نسائی جذبوں کے اظہار میں کون کون سے ذرائع استعمال کیے۔ کیوں کہ بعض نفسی و جذباتی رویے ایسے بھی ہیں جن کا مکمل تخلیقی اظہار مرد شعرا کے ہاں ممکن نہیں ہے اور شاعرات نے ان کا عمدگی سے اظہار کیا ہے۔ اس پر تحقیقی و تنقیدی کام کی ضرورت ہمیشہ سے رہی ہے جو اس مقالے کا بنیادی مطمح نظر ہے۔ اس طرح خواتین کے ہاں جدید شعور اور خصوصی طور پر عورت پن کے حوالے سے ان کے نظریہ فکر کو بھی سامنے لانے کی ضرورت رہی ہے۔ اس مقالے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں نے اُردو شاعرات کے موضوعات کو کس طرح متاثر کیا اور پھر ان شاعرات نے ان موضوعات کو کس طرح برتا اور اسلوب اور موضوعات کی سطح پر کیا نمایاں تبدیلیاں کیں۔

موضوع مقالہ: "اردو افسانے کی روایت اور پاکستانی خواتین افسانہ نگار: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"

(1947ء سے عصر حاضر تک)

مقالہ نگار: نورین رزاق، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

عورت کہانی سنانے کے لیے موزوں ترین ہستی ہے۔ صدیوں سے اس کا تعلق بالواسطہ اور بلاواسطہ کہانی سے جڑا ہوا ہے۔ پاکستانی عورت نے اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ مذکورہ بالا عنوان کے تحت لکھے گئے مقالے میں مقالہ نگار نے پاکستانی افسانہ نگار خواتین کی تخلیقی کاوشوں کے فکری و فنی جائزے کو مبسوط و مربوط انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب کے میدان میں بھی مردوں کی اجارہ داری قائم ہے۔ عورت کے محسوسات اور ادراک کی دنیا مرد سے مختلف ہوتی ہے۔ مرد و زن کی جسمانی ساخت، جذباتی وابستگیاں، عملی مشکلات، نقطۂ نظر اور سماجی تعلقات و روابط کا دائرہ الگ الگ ہے۔ پاکستانی عورت اور مرد کے حقوق و فرائض اور اختیارات کا دائرہ کار بھی یکساں نہیں ہے۔ عورت کا مشاہدہ اور تخلیقی تجربہ خاص اس کی شخصیت کا حصہ ہے۔ پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو پرکھتے ہوئے جانبدارانہ رویے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ افراط و تفریط پر مبنی رویوں میں بے جا تنقیص یا بے جا سرپرستی نظر آتی ہے۔ مذکورہ بالا مقالے میں یہ تمام باتیں پیش نظر رہی ہیں۔ مقالہ نگار لکھتی ہیں:

> " تقسیم سے قبل اور بعد میں لکھنے والی خواتین افسانہ نگاروں کے انفرادی مطالعوں میں زمانی ترتیب پیش نظر رکھی ہے۔ انفرادی مطالعے کے آغاز میں ہر افسانہ نگار کا مختصر سوانحی خاکہ اور افسانوی مجموعوں کی تفصیل درج کی گئی ہے"۔(13)

افسانوی مجموعوں کو زمانی ترتیب سے لکھا گیا ہے لیکن مقالے میں وہ ایڈیشن درج کیا گیا ہے جس سے مقالہ تحریر کرتے ہوئے استفادہ کیا گیا۔ اسی طرح مقالہ نگار نے قیام پاکستان سے لے کر عصر حاضر تک خواتین افسانہ نگاروں کے مطبوعہ افسانوی مجموعے پیش نظر رکھے ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے ایک افسانے کے علاوہ رسائل یا انتخابات سے استفادہ نہیں کیا گیا۔ مسز عبد القادر اور حجاب امتیاز علی کا تخلیقی سفر قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا لیکن ان کے اس دور میں گذشتہ موضوعات کا اعادہ نظر آتا ہے۔ اس لیے انھیں صرف باب دوم "خواتین کی افسانہ نگاری تقسیم سے قبل" میں شامل کیا گیا ہے۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے فکر و فن میں ارتقا نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کے تقسیم سے قبل لکھے گئے افسانوں کو پہلا دور قرار دیتے ہوئے انھیں باب پنجم میں دوبارہ شامل کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا قیام پاکستان میں بہت کم عرصہ رہا ہے اس لیے ان کا ذکر باب دوم میں شامل ہے۔ باب سوم اور چہارم میں متن میں افسانہ نگاروں کی نشان دہی کیے بغیر خواتین کے فکر و فن

کا جائزہ مجموعی رجحانات کی روشنی میں کلی طور پر کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار، افسانے کا نام اور دیگر تفصیلات باب کے اختتام پر حواشی میں درج کی گئی ہیں۔ اس حوالے سے مقالہ نگار لکھتی ہیں:

"پاکستان کی نسبتاً غیر اہم اور غیر معروف افسانہ نگاروں کو شامل مطالعہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو افسانے کی روایت میں خواتین کے کردار کی مکمل تصویر پیش کی جاسکے"۔(14)

مذکورہ مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل کا جزو "الف" افسانے کی فنی مبادیات اور نظری مباحث کا مختصر احاطہ کرتا ہے جب کہ جزو "ب" میں اردو افسانے کی روایت کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم تقسیم سے قبل خواتین کی افسانہ نگاری پر مشتمل ہے۔ اس باب کے تین جزو ہیں۔ "الف" جزو میں اس دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جزو "ب" تقسیم سے قبل لکھنے والی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مجموعی فکری و فنی جائزے پر مشتمل ہے۔ جزو "ج" میں اس دور کی نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا انفرادی جائزہ شامل ہے۔ باب سوم پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات کا مجموعی طور پر احاطہ کرتا ہے۔ یہ باب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں پاکستان کی لکھاری عورت کو میسر سماجی، تہذیبی اور سیاسی حالات پر طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

باب چہارم پاکستانی افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کے فنی، تکنیکی اور اسلوبیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس باب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ پاکستانی خواتین کے فنی، دوسرا تکنیکی اور تیسرا حصہ اسلوبیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ باب پنجم میں ان نمائندہ خواتین افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا انفرادی جائزہ لیا گیا ہے جو اپنے فکر و فن کی بنیاد پر عوامی اور ادبی حلقوں میں یکساں مقبول ہیں اور اردو افسانے کی روایت میں منفرد مقام اور پہچان رکھتی ہیں۔ باب ششم دیگر پاکستانی خواتین افسانہ نگاروں کے تذکرے پر مشتمل ہے، اس باب کے بھی دو حصے ہیں۔ جزو (ب) میں نسبتاً غیر معروف خواتین کی افسانہ نگاری کا جائزہ اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کچھ پاکستانی خواتین افسانہ نگار بیرونِ ملک مقیم ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے جائزے پر مشتمل باب ہفتم کے بھی دو حصے ہیں، پہلے حصے میں ان خواتین افسانہ نگاروں کے فکر و فن کا مختصر مجموعی جائزہ لیا گیا ہے، جب کہ باب کا دوسرا حصہ انفرادی مطالعوں پر مشتمل ہے۔ تحقیق کی روشنی میں مقالے کے آخر میں مجموعی جائزہ کی صورت میں گذشتہ ابواب کا نتیجہ پیش کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تانیثی مطالعہ "

مقالہ نگار: عاصمہ کبیر، 2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر حمیرا اشفاق، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

تنقید کی اہمیت اور ادب کے لیے اس کی ناگزیر ضرورت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ جس کے نتیجے میں ادب کی تفہیم کے نئے لب و لہجے اور نئے تنقیدی رویے سامنے آتے رہتے ہیں۔ تانیثیت، نسائیت یا فیمینزم بھی ایک ایسا ہی تنقیدی رویہ ہے جس کی مدد سے ادبی سرمایے کو جانچنے کی روش عام ہو رہی ہے۔ کئی ناقدین ادب اس تنقیدی رجحان کے زیر اثر شعر و ادب کی مکرر تعبیر و تشریح میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اُردو ناول کے آغاز وارتقا میں اگرچہ بہت سے ناول نگار سامنے آئے جنھوں نے نہ صرف اپنے وقت کی تہذیب کو ناول کے فن میں سمو کر دوام بخشا بلکہ انیسویں و بیسویں صدی کے ہندوستان کی عورت کی الجھنوں، پریشانیوں اور مسائل کی بھی بھرپور نمائندگی کی اور حقوق کی ادائیگی میں مرد و عورت کی تخصیص کو غیر منصفانہ عمل گردانا۔ نسائی شعور کی بیداری میں مرد و خواتین نے مل کر ناول کے میدان میں قدم رکھا اور اصلاح نسواں کے لیے تگ و دو کی۔ ان اولین ناول نگاروں میں نذر سجاد حیدر کا نام نمایاں ہے۔ ان کے ناول اُردو کے تانیثی ادب کا نادر سرمایہ ہیں جن کا تانیثی مطالعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہمیت کا حامل کام ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب اور ماحصل میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب تانیثیت کی تعریف، مغربی و اُردو ادب میں تانیثیت کی تحریک کا مختصر جائزہ، اُردو کلاسیکی ناولوں میں نسائی شعور اور اسلام میں عورت کے مقام و مرتبے پر مبنی ہے۔ دوسرے باب میں اوائل ہندوستان کے اُن حالات و واقعات کو بیان کیا گیا ہے جنھوں نے مختلف تحاریک کو جنم دیا جس کے نتیجے میں ہر تحریک اور شخصیت عورت کی حیثیت اپنے طور پر طے کرتی رہی۔ تیسرے اور چوتھے باب میں نذر سجاد حیدر کے ناولوں کے کرداروں اور موضوعات کا تانیثی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں نذر سجاد کے ناولوں کا ہم عصر خواتین ناول نگاروں کے ساتھ تقابلی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ اس پس منظر میں اُس صدی کی تانیثی جہت واضح اور نمایاں ہو سکے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی مرد افسانہ نگاروں کے ہاں نسوانی کردار۔ ایک مطالعہ "

مقالہ نگار: ارم سلیم، 2010ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن۔ پنجاب یونیورسٹی، اورنٹل کالج، لاہور

مذکورہ موضوع" پاکستانی مرد افسانہ نگاروں کے ہاں نسوانی کردار "نسبتاً محدود ہے کیونکہ اس میں تین شرائط پائی جاتی ہیں۔ ایک پاکستانی افسانہ نگار، دوسری مرد افسانہ نگار اور تیسری صرف نسوانی

کردار۔ مذکورہ مقالے کا پہلا باب عورت کے سماجی مقام کا احاطہ کرتا ہے جس میں زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک کی عورت کی سماجی، مذہبی اور قانونی حیثیت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ تانیثیت کی تحریک، اُس کے عوامل اور مغرب سے مشرق تک کا سفر بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کا دوسرا حصہ افسانے کے فن اور تکنیک پر مشتمل ہے جس میں افسانوی فن کے حوالے سے بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ کردار نگاری افسانے کا اہم جزو ہے کیونکہ افسانہ نگار اپنے تجربے، مشاہدے اور علم و دانش کو قاری کے دل و دماغ پر نقش کرنے کے لیے کردار کا سہارا لیتا ہے۔ اس مقالے کا بنیادی موضوع کرداروں کا مطالعہ ہے اس لیے مقالے کا دوسرا باب کردار نگاری پر مشتمل ہے جسے مقالہ نگار نے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ قیام پاکستان سے پہلے کی کردار نگاری اور دوسرا حصہ قیام پاکستان کے بعد کی کردار نگاری پر مختصر جائزے کی صورت میں ہے۔

مقالے کا تیسرا باب خاندانی رشتوں کے حوالے سے عورت کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ جس میں ماں، بیوی، بیٹی اور بہن کا کردار موضوع تحقیق رہا۔ ان کرداروں کے مطالعے سے عورت کی نفسیات، جذبات، خواہشات، مجبوریاں اور سماجی مسائل سامنے آئے۔ جنھیں مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے تجربے تخیل اور مشاہدے کی بنا پر پیش کیا اور کرداروں کی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا۔ چوتھے باب میں پیشے کے اعتبار سے عورت کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ نسوانی کردار ہمیں اپنے ارد گرد مختلف حالات میں جدا جدا رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کے پیچھے ان کی مجبوریاں اور خواہشات محرک کا کام کرتی ہیں ۔ مقالے کا پانچواں باب عورت کے مختلف کرداروں کا احاطہ کرتا ہے جس میں ساس، دادی، نانی، ہمسائی، سہیلی اور معذور عورت کے کرداروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ مقالے کا یہ حصہ دوسرے ابواب کی نسبتاً مختصر ہے کیونکہ اس میں عورت کے ایسے کرداروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو عموماً افسانے میں کم استعمال ہوتے ہیں یا پھر ضمنی کرداروں کی صورت افسانے کا حصہ بنے ہیں۔ مقالے کا چھٹا اور آخری باب "مرد افسانہ نگاروں کا عورت کے بارے میں رویہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مختلف کرداروں کی روشنی میں مرد افسانہ نگاروں کا مزاج، سوچ اور عورت کے بارے میں اُن کے احساسات و جذبات اور تخیل و مشاہدے کو پیش کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "ہیر وارث شاہ اور ولیم شکسپیئر کے منتخب ڈراموں کے نسوانی کرداروں کا تقابلی مطالعہ "

مقالہ نگار: راحیلہ امبرین، 2020ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نبیلہ رحمان پنجاب یونیورسٹی، اورنٹل کالج، لاہور

مذکورہ بالا مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب "وارث شاہ اور شیکسپیئر کا تعارف نامہ " ہے۔ اس میں وارث شاہ اور ولیم شیکسپیئر کے حالات زندگی، تصانیف اور فن کے حوالے سے مختصر احوال بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں وارث شاہ اور شیکسپیئر کے پیشرو اور متقدمین ادیبوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے تا کہ قارئین جان پائیں کہ ان دونوں ادیبوں کے عہد میں کس قسم کا ادب تخلیق ہو رہا تھا۔ مقالے کا دوسرا باب "ڈرامہ اور داستان: تاریخ اور ارتقا" کے عنوان سے ہے۔ ڈرامہ کیا ہے؟ اس کی کتنی اقسام ہیں؟ بنیادی عناصر کون کون سے ہیں؟ اور یورپ (برطانیہ) اور ہندوستان خصوصاً پنجاب میں ڈرامے کا ارتقا کیسے ہوا؟ ان سب ذیلی عنوانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ "پنجاب اور انگلستان میں عورت کی سماجی حیثیت " اس مقالے کا تیسرا باب ہے۔ وارث شاہ اور شیکسپیئر کے نسوانی کرداروں کی تفہیم کے لیے ہندوستانی خاص طور پر پنجابی اور انگلستانی تہذیبوں میں عورت کی حیثیت کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ لوک ادب میں عورت کی سماجی حالت کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔ مقالے کا چوتھا باب "وارث کی ہیر اور شیکسپیئر کے منتخب ڈراموں کے نسوانی کرداروں کا تعارف" کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں پہلے داستان ہیر وارث شاہ کے نسائی کرداروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور پھر ولیم شیکسپیئر کے پانچ منتخب ڈراموں "اوتھیلو، جولیس سیزر، رومیو جولیٹ، کنگ لیئر اور ہیملٹ " کے نسوانی کرداروں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہاں ہر ڈرامے کا خلاصہ بھی بیان کیا گیا ہے تا کہ قارئین جان سکیں کہ ہر ڈرامے میں نسوانی کرداروں کا کیا کردار رہا ہے۔ مقالے کا پانچواں باب "وارث شاہ کی ہیر اور شیکسپیئر کے منتخب ڈراموں کے نسوانی کرداروں کا تقابلی مطالعہ " ہے۔ اس میں وارث شاہ کی ہیر کا باری باری ہر ڈرامے کی نسوانی کرداروں سے تقابل کیا گیا ہے۔

مذکورہ مقالے میں ان ادبا کے تقابل سے جو بات سامنے آئی وہ یہ ہے دونوں ادیبوں کے عہد میں اگرچہ ڈیڑھ صدیوں کا وقفہ ہے اور دونوں کا سماج اور معاشرہ بھی مختلف پس منظر کا حامل ہے اس کے باوجود دونوں کے سماج میں عورت مجبور محض ہی رہی ہے۔ دونوں سماجوں میں عورت کی مظلومیت کا باعث جہاں سیاسی نظام ہے وہیں ہر دو کی معاشرت بھی ہے۔ مقالے کا چھٹا اور آخری باب " حاصلات " کے عنوان سے ہے۔ اس مقالے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وارث شاہ کے علاوہ دیگر پنجابی ادیبوں اور دانشوروں کی تخلیقات کا بھی دیگر یورپی ادیبوں سے تقابل کیا جانا چاہیے جس سے نہ صرف قارئین کو دیگر معاشروں کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ اس معاشرے کو چلانے والے جملہ عوامل کا بھی علم ہو گا۔ اس طرح انسانی سماجیات سے بہتر آگہی حاصل ہو سکے گی اور شاید کسی حد تک مسائل کا تدارک بھی۔

سیاسیات:

برصغیر پاک وہند میں 712ء میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے ملتان تک کا علاقہ اموی خلافت کے زیر نگین ہو گیا۔ عربوں کی راست بازی اور حسن سلوک نے اہل خطہ کو ان کا گرویدہ کر لیا چنانچہ سندھ کے باسیوں نے جوق در جوق اسلام قبول کر کے سندھ کو "باب الاسلام" میں تبدیل کر دیا۔ بد قسمتی سے اموی خلافت میں عدم استحکام کی بدولت دمشق و بغداد کے حکمران برصغیر میں اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور مرکزی خطوں میں اسلام کا حیات آفرین پیغام تین صدیوں بعد ترکوں اور افغانوں کی سیاسی کامیابیوں کے دوش بدوش پھیلا، جس میں سب سے نمایاں کردار صوفیائے کرام اور مشائخ عظام نے ادا کیا۔ سلطان محمود غزنوی کے پے درپے حملوں نے ہمیشہ کے لیے ہندو اقتدار کی بنیادیں ہلا دیں۔ 1022ء میں پنجاب باقاعدہ طور پر سلطنت غزنی کا حصہ بن گیا جس سے مسلمان صوفیا اور مبلغین کو نہایت ساز گار ماحول میسر آگیا، ان کی مخلصانہ کاوشوں کو مزید جلا اس وقت ملی جب 1206ء میں قطب الدین ایبک شمالی ہندوستان کو فتح کر کے دہلی میں خود مختار سلطان کی حیثیت سے تخت نشین ہوا جس سے ہندوستان میں بھرپور سیاسی و سماجی غلبے کا آغاز ہو گیا۔ جلد ہی سلطان شمس الدین التمش اور سلطان غیاث الدین بلبن جیسے مدبر حکمرانوں نے اپنے حسن انتظام سے رعایا کے دل موہ لئے۔ یہ تابندہ روایت ترکوں کے بعد خلجی، تغلق، سید، لودھی اور سوری حکمرانوں کے دور میں جاری وساری رہی اور مسلمانوں کے انتظامی اور عسکری صلاحیتوں کا شہرہ چہار دانگ عالم میں پھیل گیا۔

یہ سفر مغلوں کے دور حکومت میں نئی بلندیوں کو جا پہنچا اور انہوں نے بھی ہندوستان میں ہر شعبہ حیات مثلاً تعمیرات، فنون لطیفہ، ادب، مذہبی رواداری اور ثقافت و تمدن وغیرہ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے اس کے علاوہ ہندوستان میں ایک نئے انتظامی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک مروج ہے۔ 1707ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد تخت دہلی پر کوئی ایسا شخص متمکن نہ ہو سکا جو اپنے اسلاف کے اوصاف کا حامل ہوتا چنانچہ ایک طرف جانشینی کے دعوے داروں میں میدان کارزار گرم ہوا تو دوسری طرف غیر مسلم قوتوں نے بھی سر اٹھانا شروع کر دیا۔ دکن میں مرہٹوں نے زور پکڑا اور شمالی ہندوستان کو نشانہ ستم بنانے لگے تو پنجاب میں سکھوں نے قیامت صغریٰ برپا کر دی۔ رہی سہی کسر دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی اور مغلیہ سلطنت کی کمزوری روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ اس دور ابتلا میں انگریز جو ہندوستان میں تاجر بن کر وارد ہوئے تھے آہستہ آہستہ مقامی حکمرانوں کے باہمی تنازعات میں دخل اندازی کے ذریعے اثر رسوخ اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے لگے۔

جنگ پلاسی 1757ء کے بعد وہ بنگال کی سیاست میں اس حد تک دخیل ہو گئے کہ 1773ء میں انہوں نے نواب بنگال کو معزول کر کے باقاعدہ حکومت کرنی شروع کر دی۔ 1799ء میں انہوں نے میسور پر قبضہ کر لیا اور 1817ء میں ان کی سازشوں کی بدولت مرہٹوں کی آزاد حکومتیں اپنا وجود کھو بیٹھیں۔ 1843ء میں سندھ ان کے زیر نگیں ہوا اور 1849ء میں انہوں نے سکھوں کو شکست دیکر پنجاب کا الحاق کر لیا۔ اس طرح ہندوستان کے مقامی حکمران رفتہ رفتہ اپنی نااہلی اور باہمی اتحاد کے فقدان کی بنا پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست پر شکست کھاتے چلے گئے۔ انگریزوں کے غلبہ ہندوستان سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا کیونکہ مغل دور حکومت میں حکمرانی کے ساتھ ساتھ فوج، ملکی انتظامیہ اور علمی شعبوں کی اعلیٰ ملازمتوں کا غالب ترین حصہ مسلمان پُر کرتے تھے مگر برطانوی اقتدار کے عروج کے ساتھ ہی مسلمانوں نے اپنے آپ کو جو چھ صدیوں سے ریاستی امور میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے، یکایک پہلے درجے سے تیسرے درجے میں موجود پایا، مثلاً صوبہ بنگال کے پہلے گورنر لارڈ کلائیو نے ایک سرکاری اعلان کے ذریعے یہ لازم قرار دیا کہ کسی مسلمان کو چپڑاسی یا جونیئر کلرک سے بڑا عہدہ نہ دیا جائے۔ مسلمانوں کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب لارڈ ولیم کے دور حکومت میں فارسی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور نتیجتاً کسی بھی مسلمان کے لئے کسی ذمہ دار عہدہ پر فائز ہونا تقریباً ناممکن ہو گیا۔ اسی طرح فارسی بھی بطور عدالتی زبان ترک کر دی گئی اور عدالتوں میں مسلم فقہا کی اسامیوں کو ختم کر دیا گیا۔ ان تمام اقدامات کی بنا پر مسلمان سیاسی، تہذیبی اور تمدنی طور پر ذلت و پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے چلے گئے۔

عہد حاضر میں مسلم سیاست کی انقلابی تشکیل کا آغاز 1857ء کے ہنگامہ کے بعد ہوا۔ مورخین نے اس ہنگامہ کو مختلف الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ بہر حال طلبائے تاریخ کے لئے یہ حقیقت اختلاف رائے سے منزہ و بے داغ ہے کہ یہ نہایت پُر خطر اور فیصلہ کن سانحہ تھا جس نے مستقبل کی سیاست کا رخ دور رس عواقب و نتائج کی طرف موڑ دیا جس سے برصغیر میں بسنے والی اقوام کی نسبت اہل اسلام زیادہ اثر پذیر ہوئے۔ سید احمد شہید اور انکے متبعین نے اس ہنگامہ سے بہت پہلے اہل اسلام کو دعوت عزم و عمل دی تھی کہ برطانیہ کی مخالفت کو اپنا سیاسی و مذہبی فریضہ تسلیم کر کے جہاد و حریت میں سرفروشی و جاں نثاری کے جذبہ کا اظہار کریں۔ ایک اور امر واقعہ جو برطانوی استبداد کے تحت اہل اسلام کے احساس عدم تحفظ میں زیادتی کا موجب ہوا یہ تھا کہ عیسائی تبلیغی اداروں نے مذہبی ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت برطانوی حکمرانوں کی منظور شدہ حکمت عملی تھی۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلم زاویہ نگاہ

سے 1857ء کا ہنگامہ مذہبی تعصبات کا حامل تھا۔ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ امر ہی ضرب کاری و صدمہ عظیم کی حیثیت رکھتا تھا کہ فارسی کی بجائے انگریزی کو تعلیمی و دفتری زبان قرار دیا گیا جس کے لئے یہ استدلال پیش کیا گیا کہ انگریزی روشن خیالی کی اشاعت کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ ڈبلیوڈبلیو ہنٹر نے اپنی تصنیف "اور انڈین مسلمان" میں اس دور کے مسلمانوں کی دردانگیز واشک آور تصویر کھینچی ہے وہ معزز مسلمان خاندانوں کے متعلق لکھتے ہوئے کہتا ہے:

"وہ شکستہ برآمدوں کے ٹپکتے ہوئے تنگ مکانوں میں بے نور زندگی کے دن گذار رہے ہیں اور مسلسل قرض کے تاریک و عمیق غار میں گرتے چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ کوئی ہمسایہ ہندو ساہوکار ان سے برسرپرخاش ہو جاتا ہے اور تب ناگہاں کوئی دشمن اس نگاہ شکستہ کو بھی ضبط کرلیتا ہے اور اس طرح ایک قدیم مسلم خاندان ورطہ گمنامی اور گرداب خمول میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو جاتا ہے"۔(15)

یہ وہ سیاسی حکمت عملی تھی جس کی برطانیہ نے تعلیم دی تھی۔اس کے خیالات ہندوستانی ذہن پر تیزی سے مسلط ہوتے چلے گئے اور یہ امر ان کے ذہن نشین ہو گیا کہ سیاسی ارتقا کی جو شاہراہ برطانیہ نے پہلے ہی سے متعین کر دی ہے اس پر ہی جادہ پیائی کی جائے گی۔ سر سید احمد خان نے 1858ء میں مجلس قانون ساز میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان کی مجلس قانون ساز میں اہل ملک کو شریک نہ کرنا ملک کیلئے متعدد نقصانات کا موجب ہے ان کی شرکت کے بغیر حکومت کسی طرح یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ جو قوانین و قواعد وہ منظور و نافذ کرتی ہے وہ کس حد تک اس ملک کے لئے موزوں و ناموزوں ہیں۔ واقعات کے اس پس منظر اور حالات کے اس ماحول میں "اے۔ او ہیوم" اور "ڈبلیو۔ سی بیر جی" کی مساعی سے 1885ء میں ہندوستانی قومی کانگرس کی اساس قائم ہوئی۔ جن کے مقاصد میں ملکی مشترکہ مفاد کیلئے جدوجہد کرنے والوں کے مابین دوستانہ مراسم اور ذاتی روابط کی توسیع و استحکام اور اس کے علاوہ نسلی، مذہبی اور صوبائی عصبیت کے زہر افتراق سے ملکی عوام کے ذہن و ضمیر کی تطہیر، وقت کے معاشرتی مسائل کے بارے میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی آراو خیال کا حتمی اندازہ، اس کا طریقہ کار اور اس پر عمل کا تعین جس پر جادہ پیما ہو کر ارباب سیاست عوامی مفاد کے لئے سرگرم عمل ہو سکیں۔ چونکہ تعلیم یافتہ طبقہ اکثر و بیشتر ہندو تھا۔ اس لئے کانگرس کی رکنیت میں بھی ان کی اکثریت و اہمیت واضح تھی۔ آغاز کار میں کانگریس کے رہنما امن پسند اور آئینی افراد تھے لیکن رفتار وقت کے

ساتھ ساتھ ان کی زمام اختیار متلون مزاج افراد کے دست تصرف میں آگئی اور متعصب فرقہ وارانہ ذہنیت کے ہندوؤں کی اکثریت یا کثیر تعداد بھی کانگرس کی رکن بن گئی۔

جس دور میں کانگرس لا مذہب سیاست اور قومیت وطن کے فلسفہ کی تبلیغ وحمایت کر رہی تھی اسی دور میں برصغیر کو دواہم صورت حال کا سامنا ہوا جو ملکی سیاسی تحریکوں میں دور رس نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ملک کی دو کثیر الافراد قومیں یعنی مسلمان اور ہندو دونوں وسیع پیمانے پر مذہبی اصلاحات میں مصروف کار ہو گئیں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی عملی سیاست میں مذہب جزو لازم بن گیا۔مسلمانان ہند کی تاریخ میں ان پُر خطر اور اندیشہ ناک لمحات میں سر سید احمد خان نے اپنے آپ کو ایک عظیم مسلم رہنما ثابت کیا۔وہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی احیا کا وسیع دستور العمل لیکر سامنے آئے۔ان کی نگاہ پیش بین و دور رس نے پہلے ہی یہ حقیقت پنہاں بے نقاب دیکھ لی کہ یہ کار عظیم صرف اسی صورت میں انجام پا سکتا ہے جبکہ ارباب حکومت کے دامن ضمیر سے اہل اسلام کی مخالفت کے خار و سوزن کو نکال دیا جائے اور اہل اسلام کے ذہن میں مغربی تعلیم کا شعور و ذوق پیدا کیا جائے جو ان کی رائے میں اسلام کو عقلی اور استدلالی طور پر سمجھنے کا موجب تھا۔ مقصد اول حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایک کتابچہ "اسباب بغاوت ہند" تصنیف کیا اور اس کے بعد "ہند کے وفادار مسلمان" کے عنوان سے دوسرا کتابچہ لکھا۔دیگر مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے غازی پور میں مدرسہ کا افتتاح کیا جو بعد میں ترقی کر کے علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے موسوم ہوا۔ان کا علی گڑھ کالج ملت مسلمہ کی بیداری کے لئے معاشرتی، تعلیمی، مذہبی اور سیاسی تحریکات کا واحد مرکز تھا۔ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، وقار الملک اور محسن الملک سر سید احمد خان کے رفقائے کار اور ان کے کارناموں کے مداح و ثناخواں تھے۔ان حضرات نے مسلمان عوام کو سر سید کے پیغام گوش گزار کرنے کے لئے بڑے جوش و جذبے اور سرگرمی عمل کا مظاہرہ کیا۔یہ تحریک علی گڑھ تک محدود نہ تھی۔ہر خطہ ملک میں سکولوں اور کالجوں کا افتتاح ہونے لگا۔جہاں مغربی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ان اقدامات سے ملت اسلام نے بڑی حد تک اس خسارہ کی تلافی کر دی جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا تھا۔

سیاسیات میں سر سید احمد خان اس نظریے کے بانی تصور کئے جاتے ہیں کہ ہندوستان دو جداگانہ قوموں کا مسکن ہے۔یہی نظریہ بعد کو ہندوستانی سیاست میں نقطہ مرکز بنا۔ان کا شمار ان ابتدائی مسلم رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کی چشم بینا نے اس حقیقت کو واشگاف دیکھ لیا تھا کہ وہ ادارے جو مغربی طرز جمہوریت میں

قابل عمل ہیں ان کے لئے بر صغیر ہند میں کامیابی کے امکانات خیال موہوم اور حقیقت معدوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے کہ اس ملک کے عوام میں نسلی اور مذہبی اختلافات نقطہ عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں انہوں نے اہل اسلام کو "ہندوستانی قومی کانگرس" میں شرکت سے بازر کھا جو غالب اکثریت کی وجہ سے خالص ہندو جماعت بن گئی تھی۔ یہ مشکل ترین مرحلہ تھا کہ ہندو مسلمان ملک کی سیاسی عقدہ کشائی کیلئے ایک مشترکہ مقام فکر و عمل پر مجتمع ہو سکیں۔ "انجمن زمینداراں، برٹش انڈیا سوسائٹی اور برٹش انڈین ایسوسی ایشن" جیسی تبلیغی جماعتوں میں عملاً ایک مسلمان رکن بھی نہ تھا۔ جب مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی تو انہوں نے اپنی سیاسی تنظیمیں جداگانہ بنائیں۔ 1886ء میں محمڈن ایسوسی ایشن کا آغاز ہوا اور اس کے بعد کلکتہ میں نواب امیر علی خان نے "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کی بنیاد ڈالی۔ سر سید احمد خان نے میرٹھ میں تقریر کرتے ہوئے وضاحت کی کہ مسلمان اور ہندو دو جداگانہ قوموں کی حیثیت سے کسی امکانی صورت میں مشترکہ سیاسی طریقہ فکر و عمل کی ترتیب و تاسیس میں رفیق کار یا معاون نہیں ہو سکتے۔ اس دور میں مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی بیداری اس مرحلہ پر پہنچ گئی تھی جہاں انہوں نے اپنے تحفظ کے لئے اپنی ملت کو منظم کر لیا۔

انڈین ایکٹ 1892ء کی رُو سے ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی بالواسطہ منتخب شدہ مجالس مقننہ کے لئے مخلوط انتخابات کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ مسلمانوں کیلئے نہایت یاس انگیز و حرماں آمیز ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندو کے ساتھ مخلوط و مربوط ہو کر وہ کبھی مناسب نمائندگی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جس کا استحقاق انہیں اپنی تعداد اور تاریخی اہمیت کے مطابق حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں منظر سیاست پر ایک سنجیدہ فرقہ وارانہ پرخاش رونما ہوئی۔ یعنی مذہبی اختلافات میں لسانی مناقشہ کا اضافہ ہو گیا اور مسلم و ہندو سیاسیات میں اردو ہندی نزاعی مسئلہ بھی شامل ہو گیا۔ اسی تنازع کے نتیجے میں تحریک پاکستان کا بھی آغاز ہوا اور بالآخر 1947ء میں دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت پاکستان کے نام سے معرض وجود میں آ گئی۔ بر صغیر کی مذکورہ بالا سیاسی صورتحال کی طویل تمہید باندھنے کا مقصد یہ ہے کہ ذیل میں "سیاسیات" کے حوالے سے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالوں کا جو مطالعاتی جائزہ پیش ہے اس کے پس منظر اور پیش منظر سے بہتر انداز میں آگاہی ہو سکے۔

موضوع مقالہ: "اردو فکشن (ناول، افسانہ) کے سقوط ڈھاکہ پر اثرات"

مقالہ نگار: زینب افشاں، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

مذکورہ بالا موضوع تاریخی، تہذیبی، ادبی اور سماجی اعتبار سے اہم ہے کیونکہ مختلف مقالہ نگاروں نے اردو شاعری اور اردو نثر پر سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے کام کیا ہے لیکن اس مقالے سے قبل ناول اور افسانے کے موضوع کو منتخب کر کے متعلقہ مواد دقت نظر سے نہیں دیکھا گیا، نہ ہی سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے لکھے گئے اردو ناولوں اور افسانوں کا الگ الگ مطالعہ کیا گیا، جس کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ کے ان اصناف پر گہرے اور دیرپا اثرات کا مجموعی جائزہ نہیں لیا جاسکا۔ البتہ اردو شاعری اور اردو نثر پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات پر کام کیا گیا۔ ایسی صورت میں اردو فکشن، خاص طور پر ناول اور افسانہ خصوصی توجہ اور مطالعے کا مرکز نہ بن سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ناول اور افسانہ ہی وہ دو تخلیقی نثری اصناف سخن ہیں جن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سانحے کے اثرات تخلیقی حوالوں سے شاعری کے ساتھ ساتھ ناول اور افسانے پر ایسے گہرے اور دیرپا ہیں کہ انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مذکورہ مقالہ نگار کا موضوع اسی لیے ایک اہم موضوع معلوم ہوتا ہے۔

اس مقالے کا پہلا باب "اردو فکشن کا پس منظر اور پیش منظر: آغاز وارتقا" ہے۔ اس باب میں اردو فکشن کی تعریف، اس کے آغاز وارتقا کے حوالے سے مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ اردو ناول کے آغاز اور ارتقا کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ جب سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بات ہو تو بہتر طور پر سمجھا جاسکے کہ اردو ناول پر اس سانحے کے اثرات کی صورت کیا رہی۔ اسی طرح اردو افسانے کے آغاز وارتقا کے موضوع پر بھی بنیادی مباحث کا اہتمام کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اردو افسانہ اردو ادب میں کتنی اہم صنف سخن ہے۔ یہاں یہ بھی بتایا گیا کہ اردو افسانے نے سقوط ڈھاکہ کے اثرات کو کس حد تک قبول کیا اور اردو افسانے کی اس اثر پذیری کا اردو ادب پر اثر کتنا گہرا اور دیرپا ہو سکتا ہے۔ اس باب میں اردو فکشن کے مباحث کچھ اس طرح سے مرتب ہوئے ہیں کہ اردو ناول اور اردو افسانے کی ہیئت، اسالیب، موضوعات، رجحانات اور تاریخ بہت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ مربوط صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس باب میں " اردو ناول اور اردو افسانہ: آغاز وارتقا" کے موضوع کی نسبت سے قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے امتیاز کے ساتھ بھی زیر بحث آئے ہیں تاکہ ہجرت کا مسئلہ اچھی طرح سمجھا جاسکے۔ اس ہجرت کو سمجھنا اس لیے بھی اہم ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد ایک انتہائی اہم طبقے کو دوسری ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا اور یہ حوالہ اردو ناول اور افسانے کا خاص موضوع بھی رہا ہے۔

دوسرا باب" سانحہ مشرقی پاکستان، پس منظر اور پیش منظر" ہے جس میں اس سانحے کے اسباب، واقعات اور نتائج واثرات پر اختصار مگر جامعیت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ اس موضوع کو ظاہر ہے کہ تاریخی حوالوں سے ہی دیکھا جاسکتا تھا لہٰذا کوشش کی گئی ہے کہ اس سانحے کے اسباب کو اچھی طرح مگر غیر جانب داری کے ساتھ دیکھا جائے تاکہ آگے چل کر اردو ناول اور اردو افسانے پر اس کے اثرات کا درست طور پر کھوج لگایا جاسکے۔ اس باب میں سقوط ڈھاکہ کے واقعے کی تصویر کشی کی کوشش بھی گئی ہے تاکہ جن حالات میں یہ سانحہ رونما ہوا، وہ اصل صورت میں سامنے آسکیں۔ ان واقعات کی کئی جہتیں ہیں جو بعد ازاں اردو فکشن پر اثر انداز ہوئیں۔ یہ واقعات ایسے ہیں جو ناولوں میں تو اسباب اور نتائج کے ساتھ موضوع کا حصہ بنے ہیں مگر خاص طور پر افسانوں میں بعض اوقات واقعات کی کوئی ایک ایک جہت بھی مکمل موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے، مقالہ نگار کے مطابق :

> " ایسی صورت میں ضروری تھا کہ سقوط ڈھاکہ کے واقعات کی ضروری جزئیات معرض بحث میں آجائیں تاکہ اردو فکشن پر ان کے اثرات درست طور پر سمجھے جاسکیں۔ سقوط ڈھاکہ ایسا سانحہ ہے جس کے تاریخ وادب پر گہرے اثرات مجموعی صورت میں مرتب ہوئے ہیں اور اس نے خطے کا جغرافیہ تک تبدیل کر دیا ہے۔ اس واقعے کے نتائج واثرات کا تذکرہ بھی مذکورہ باب میں سمٹ آیا ہے، یوں یہ واقعہ اپنے تمام حوالوں سے اس باب میں زیر بحث آگیا ہے"۔(16)

تیسرا باب" اردو ناول پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات" پر مشتمل ہے۔ اس باب میں اردو کے ایسے ناول زیر بحث آئے ہیں جو سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے حوالے سے تخلیق ہوئے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے جن ناول نگاروں کے حوالے سے بحث کی ہے اُن میں "فضل احمد کریم فضلی عنایت اللہ، رضیہ فصیح احمد، انتظار حسین قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ، خالدہ حسین، ظفر پیامی، نشاط فاطمہ، مستنصر حسین تارڑ، فہمیدہ ریاض، سلمٰی اعوان، طارق محمود، طارق اسماعیل ساگر، حمید شاہد، نسرین پرویز، حسین الحق، جیون خان، روف ظفر اور عبدالصمد وغیرہ شامل ہیں۔

مقالہ نگار نے ان مذکورہ بالا ناول نگاروں اور ان کے نالوں پر بحث مصنف وارزمانی ترتیب سے کی ہے۔ اس باب میں زیادہ تر مصنفوں کا صرف ایک ایک ناول زیر بحث آیا ہے کیوں کہ انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ایک ایک ناول ہی تخلیق کیا تھا تاہم بعض کے دو یا دو سے زیادہ ناول بھی شامل کیے گئے

ہیں۔ مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ ان ناولوں کا مجموعی تاثر تجزیاتی صورت میں پیش کیا جاسکے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا ناولوں کے علاوہ اردو میں درجنوں ایسے ناول موجود ہیں جن میں سقوط ڈھاکہ کا حوالہ ضمناً در آیا ہے۔ مقالہ نگار نے ایسے ناول اس باب کے لیے منتخب نہیں کیے ورنہ یہ سلسلہ غیر معمولی حد تک دراز ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اتنی بڑی تعداد میں ناول نگاروں کا اس موضوع کو ضمناً اپنے ناولوں میں لانا اس بات کا ثبوت ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے واقعے نے اردو ناول کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ جدید ناولوں میں بھی سقوط ڈھاکہ کا سانحہ بار بار حوالے کے طور پر آرہا ہے۔ مثلاً مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے میں" تو کم و بیش غالب موضوع احساس زیاں کے حوالے سے سقوط ڈھاکہ ہی رہا ہے۔ مقالے کے باب چہارم کا موضوع "اردو افسانے پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات" ہے۔ اس باب میں اردو کے وہ افسانے زیر بحث آئے ہیں جو سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر لکھے گئے۔ اس باب میں جن افسانہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے اُن میں ابراہیم جلیس، رضیہ فصیح احمد، انور عنایت اللہ، انتظار حسین، اے حمید، اختر جمال، مسعود اشعر، پروفیسر محمود واحد، امراؤ طارق، شہزاد منظر، آغا سہیل، مسعود مفتی، ش صغیر ادیب، محمد منشایاد، فرخندہ لودھی، غلام محمد، احمد زین الدین، ڈاکٹر رشید امجد، ام عمارہ، ڈاکٹر مشرف احمد، پروفیسر علی حیدر ملک، اے خیام، شہناز پروین، طارق محمود جمیل عثمان، آصف فرخی، قیصر قصری، احمد سعدی، س-م ساجد، اور قمر عبداللہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس باب میں افسانہ نگاروں اور ان کے افسانوں پر سقوط ڈھاکہ کے تناظر میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان افسانوں کا تجزیہ اس طرح سے کیا گیا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ مقالہ نگار نے ہر افسانہ نگار کا مختصر تعارف کرایا ہے اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ زیر بحث افسانہ نگار کی افسانہ نگاری کا عمومی حوالہ بھی نظر انداز نہ ہو۔ جن افسانہ نگاروں نے سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ایک سے زیادہ افسانے لکھے ہیں، ان کے زیادہ سے زیادہ افسانوں پر بحث کی گئی ہے۔ یوں یہ مقالہ اس موضوع پر لکھے گئے اردو افسانوں کا مجموعی تذکرہ بن جاتا ہے۔ افسانوں کی ایک بڑی تعداد ان مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ ہے جن میں سقوط ڈھاکہ کا حوالہ ضمناً آیا ہے۔ ایسے افسانوں کی تعداد بلا مبالغہ سینکڑوں میں ہے۔ اس صورت حالات سے یہ پتا چلتا ہے کہ اردو افسانہ نگاری نے اس قومی سانحے کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ اردو افسانے پر اس سانحے کے اثرات کا عالم یہ ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر افسانے باقاعدہ اس عنوان کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر عصر حاضر کے معروف افسانہ نگار قمر عبداللہ نے سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر افسانہ "دنوں کی

صلیب" لکھا جو شائع بھی ہو چکا ہے۔ مقالے کا پانچواں باب "سقوط ڈھاکہ کے اردو فکشن (ناول۔ افسانہ) پر اثرات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" ہے۔ مقالہ نگار نے اس باب میں سقوط ڈھاکہ کے سانحے کا مختصر مگر جامع تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس کے اسباب گنوائے ہیں تاکہ تنقیدی مطالعے اور جائزے کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم ہو سکے۔ اس باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ سقوط ڈھاکہ کے واقعے کے کیوں کر ادب پر اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ باب کے اگلے حصے میں اردو کے ایسے ناولوں کی فہرست فراہم کی گئی ہے جن پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات واضح اور غالب موضوع کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں ان ناولوں میں سے چند اہم جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں، جن میں سقوط ڈھاکہ کے مختلف حوالے دکھائی دیں۔ اس باب میں وہ موضوعات خاص طور پر تلاش کر کے پیش کیے گئے ہیں جن کا تعلق سقوط ڈھاکہ سے ہے۔

باب کے اگلے حصے میں اردو افسانے پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لینے کے لیے پہلے ان افسانوں کی فہرست مصنف وار فراہم کی گئی ہے جو سقوط ڈھاکہ کے موضوع پر تخلیق ہوئے۔ اس مطالعے میں زیر مطالعہ افسانوں کے ان موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے جو سقوط ڈھاکہ کے اسباب، واقعات اور اثرات و نتائج کی کوکھ سے پھوٹے ہیں۔ اس نسبت سے مذکورہ افسانوں سے اہم ترین حوالوں کی جھلکیاں بھی پیش کی گئی ہیں تاکہ تفہیم میں مشکل پیش نہ آئے۔ باب کے آخری حصے میں ایسے اردو ناولوں اور افسانوں پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات دکھانے کے لیے موضوعات کی ایک جامع فہرست بنائی گئی ہے۔ یہ جامع فہرست مذکورہ بالا ناولوں اور افسانوں پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات کی گہرائی اور گیرائی ظاہر کر رہی ہے۔ اس فہرست کے تنوع سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اردو ادب، خاص طور پر فکشن سے متعلق تخلیق کاروں نے اس قومی سانحے کو کتنی شدت سے محسوس کیا۔ ان موضوعات کا غیر معمولی تنوع یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ اردو فکشن نگار اپنے معاشرے کے بارے میں کتنا باخبر اور حساس ہے۔ اس نے سقوط ڈھاکہ جیسے قومی سانحے کی شدت کو قومی زیاں سمجھا اور قومی زندگی کو درست سمت میں رواں رکھنے کی خواہش کا اظہار برملا کیا ہے۔ مقالے کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل کیا گیا ہے جس میں آٹھ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں سے کیے گئے انٹرویوز فراہم کیے گئے ہیں۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اردو ناول میں سیاسی رجحانات: نمائندہ ناولوں کے تناظر میں "

مقالہ نگار: محمد یاسین، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد الطاف، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ عروج و زوال اور نشیب و فراز سے عبارت ہے اس اس کے اثرات پاکستانی عوام پر بھی پڑے۔ ادبا نے اپنے اپنے عصری حوالے اس کا پردہ چاک کیا۔ مقالہ ہٰذا چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ناول کی روایت پیش کی گئی ہے روایت میں ناول کے دیگر رجحانات کے ساتھ سیاسی رجحان کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ادب میں سیاسی رجحان کا جائزہ لیا گیا، ادب کی ابتدا شاعری ہے۔ اس لیے جن شعرا کے ہاں اس رجحان کو برتا گیا اُن کے اشعار بطور حوالہ پیش کیے گئے ہیں۔ شاعری کے بعد مقالہ نگار نے اُردو افسانے میں سیاسی رجحان کے چند حوالے پیش کیے ہیں۔ اس کے بعد قیام پاکستان سے قبل لکھے جانے والے ناولوں میں سیاسی بازگشت کو تلاش کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء تک سیاسی حوالے سے لکھے گئے ناولوں کو پیش کیا گیا۔ چوتھا باب ۱۹۷۱ء سے ۲۰۰۰ء تک کے سیاسی ناولوں پر محیط ہے۔ ۲۰۰۰ء سے تاحال لکھے گئے ناولوں کو پانچویں باب جبکہ چھٹے باب میں حاصلِ تحقیق اور نتائج کو بیان کیا گیا۔

معاشرت و معیشت:

معاش عربی زبان کا لفظ ہے اس کا مادہ "ماش" ہے، جس کے معنی زندہ رہنے کے ہیں۔ گویا معاش کے معنی ذریعہ زندگی کے ہیں اور عام طور پر اہل لغت کے ہاں انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی لٹریچر میں "علم الاقتصاد" کی اصطلاح بھی ان مذکورہ مفہوم ادا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ علم معاشیات اصطلاحی طور پر ایسے وسائل کی دریافت کو کہتے ہیں جو دولت پیدا کرنے کے مناسب طریقے اور اس کے خرچ کے صحیح استعمال کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ عصر حاضر میں علم معاشیات کو اکنامکس (Economics) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ Economic کا مادہ ایک لاطینی لفظ "Nomost " ہے جس کے معنی "گھریلو ضابطہ" کے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک گھر میں رہنے والے افراد کیسے روزی کماتے ہیں اور کیسے زندگی گزارتے ہیں۔ بعد میں اس لفظ کا اطلاق " Polos "یعنی ریاستی افراد کی معاشی زندگی پر کیا گیا۔ جس میں اس امر کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ ریاست میں رہنے والے افراد کی معاشی زندگی کس طرح گزرتی ہے، اور وہ محدود وسائل کے پیش نظر غیر محدود ضروریات کی تکمیل کس طرح کرتے ہیں۔ یہ وہ علم ہے جس میں اس نظام کار کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جس کے تحت ایک معاشرہ کے اندر اپنے محدود مادی اور انسانی ذرائع کی مدد سے خوشحال زندگی گزارنے اور تسکین حاجات کا بلند تر معیار حاصل کرنے کے لئے ایک منصوبہ کے تحت اجتماعی کوشش عمل میں لائی جاتی ہے۔

اس جدید دور میں کسی بھی علاقے کا معاشی و معاشرتی مطالعہ اس علاقے کی معاشی و معاشرتی ترقی کے لئے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ خصوصا محققین کے لئے اور ان لوگوں کے لئے جو معاشی و معاشرتی ترقی کے لئے منصوبے بناتے ہیں۔ معاشرت و معیشت (Socio Economy) انسانی آبادی کی خصوصیات کے مطالعہ کا نام ہے۔ معاشرتی و معاشی تبدیلی ہر معاشرے میں ہوتی رہتی ہے اس تبدیلی میں چند اہم عوامل خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرتی و معاشی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت جن عوامل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے ان میں ہجرت اور شہروں کی طرف نقل مکانی کی بہت اہمیت ہے۔ افراد اپنے پیشے، آمدنیاں، کاروبار وغیرہ بدلتے رہتے ہیں۔ ذیل میں مذکورہ بالا معاشرت و معیشت کے پس منظر میں لکھے گئے پی ایچ ڈی اُردو کے تحقیقی مقالہ جات کا مطالعاتی جائزہ پیش ہے۔

موضوع مقالہ: "اردو افسانے میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر "

مقالہ نگار: عمارہ طارق، 2105ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر تحسین فراقی، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

کسی بھی ملک کا معاشی نظام اس ملک کی تہذیب، ادب، مذہب، سماج اور اقدار کو متاثر کرتا ہے اور اس پر بڑی حد تک بقائے زندگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ ادب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے چنانچہ ادب اور معیشت کا گہرا رشتہ ہے۔ مذکورہ بالا مقالے کا موضوع دنیا کے دو بڑے معاشی نظاموں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق ہے۔ اس مقالہ کو مقالہ نگار نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو اس کے تاریخی تناظر میں پیش کرتا ہے۔ اس باب میں ان دونوں نظاموں کی ابتدا و ارتقا اور اس کی مختلف صورتوں کو واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یورپ سے شروع ہونے والے اس تاریخی سفر کو مختلف ادوار میں مختلف ممالک کے بدلتے ہوئے حالات وواقعات اور مزاج و میلانات میں ان نظاموں کو ڈھلتے اور بدلتے ہوئے دکھایا گیا ہے تاکہ قارئین ان نظاموں کی تاریخ اور اپنے ملک میں ان کی موجودگی کے اسباب، اثرات اور مسائل سے کماحقہ واقف ہو سکیں۔

دوسرے باب میں ابتدائی افسانہ نگاروں سے لے کر ترقی پسند افسانہ نگاروں اور تقسیم سے پہلے لکھنے والوں کے افسانوں میں ان نظاموں کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ تیسرا باب آزادی کے بعد ہندوستانی افسانہ نگاروں کے ہاں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظاموں کے مظاہر کو تحقیقی انداز میں پیش کرتا ہے۔ چوتھے

باب میں آزادی کے بعد پاکستان میں مضبوط ہونے والے جاگیرداری نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کے مسائل ،افسانوی روایت کے تحت تنقیدی و تجزیاتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس مقالے کا پانچواں باب علامتی افسانے کے استعاراتی اور تجریدی پہلوؤں میں ان نظاموں کی موجودگی کو واضح کرتا ہوا عصر حاضر کے بیانیہ افسانوں کے ذریعے ان نظاموں کے معاشرے پر اثرات کا گہری نگاہ سے جائزہ لیتا ہے۔ مقالہ نگار اس تحقیقی مقالے کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> "حتی المقدور کوشش کی کہ نہ صرف ان کی پیروی کی جائے بلکہ اپنے مزاج کو بھی ان کے مطابق ڈھالا جائے۔ میں نے بنیادی ماٰخذ پر زیادہ انحصار کیا۔ حوالہ جات اور کتابیات میں بھی تحقیقی اصول میرے پیش نظر رہے ہیں۔ تحقیق ایک مشکل اور دشوار مرحلہ ہے اس کا انداز مجھے اس مقالے کی تیاری کے دوران ہوا"۔(17)

مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے توقیت کا اہتمام کیا ہے مگر بعض جگہوں پر اہم افسانہ نگاروں کا ذکر پہلے کرنا ناگزیر تھا چناں چہ اگر اس صورت میں زمانی ترتیب قائم نہ رہی۔ اس کے باوجود مذکورہ مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اہم ادبی کاوش ہے۔

موضوع مقالہ: "مشرق اور مغرب کی تہذیبی کشمکش اور اردو افسانہ "

مقالہ نگار: سمیرا اسلم،2011ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد کامران، پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، لاہور

مذکورہ بالا مقالہ پانچ ابواب مشتمل ہے۔ ابتدائی باب پانچ فصول مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں تہذیب کی تعریف، دوسری فصل میں مشرقی تہذیب کی خصوصیات، تیسری میں مغرب کی تہذیبی خصوصیات، چوتھی میں مشرق اور مغرب کی تہذیبی کشمکش اور پانچویں فصل میں اردو ادب میں مشرق اور مغرب کی کشمکش کو واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اُردو غزل، نظم اور "ناول میں موجود کشمکش کو خاص طور پہ موضوع بنایا گیا ہے، یوں بتدریج کشمکش کی پرداخت کا احاطہ کر کے کشمکش کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ باب دوم میں آغاز سے ۱۹۴۷ء کے اُردو افسانے کی فکری اور فنی کروٹوں کی تفہیم کی گئی ہے۔ یہ باب چونکہ کشمکش کے حوالے سے مختلف رجحانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے اس لیے اس میں مشرق اور مغرب کے تہذیبی نقوش علیحدہ کر دیے گئے ہیں۔ تاریخی تناظر میں مغربی تہذیب کے خصائص کو واضح کر کے اُن عناصر کو بے نقاب کیا گیا ہے جو مشرقی

تہذیب کے لیے زہر قاتل ثابت ہو رہے ہیں۔ تیسرے باب میں ۱۹۴۷ سے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے اُردو افسانے میں کشمکش کے رجحانات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں افسانہ نگاروں کے اساسی نظریات وسیع تناظر میں سامنے آئے ہیں۔ اُن کے موضوعات اُن کے ادبی مقاصد سے کس قدر ہم آہنگ تھے! انھوں نے کن کن فنی حربوں کو آزما! یہ سب تفصیل اس باب کا حصہ ہے۔ چوتھا باب اُردو میں 1 ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد سیاسی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں یعنی فرد کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ، اقدار کی شکست وریخت، تہذیبی تصادم اور بے گانگی کے تناظر میں اُردو افسانے کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف افسانوں میں اچانک رونما ہونے والی عالمی دہشت دی کو پیش کیا گیا ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ روایتی کہانی کے جدید افسانے میں ڈھلنے کے کیا محرکات ہیں۔ پانچواں باب مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا موضوعاتی اور فنی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں افسانہ نگاروں کے ذہنی رویوں کو مزید سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مقالے کے آخر میں مقالہ نگار نے "حاصلِ بحث" کے عنوان سے تمام جزئیات کو مختصر طور پر سمیٹ کر افسانہ نگاروں کا ادبی مقام متعین کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی نمایاں ادبی حیثیت کا اعتراف واظہار کیا گیا ہے تاکہ مقالے کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو اُس کے ذہن میں اُبھرنے والے سوالات کا تسلی بخش جواب مل سکے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اردو ناول میں معاشی عدم استحکام کے اثرات "

مقالہ نگار: عابد سلیم، 2020ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی۔ یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور

ناول کی صنف کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انسانی زندگی اپنی تمام تر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اس کا موضوع بن جاتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ ناول کی ضخامت اور لچک دار پلاٹ ہے۔ جس کی بدولت زندگی کے متنوع پہلوؤں کو بہ آسانی کہانی کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ مقالہ نگار نے پاکستانی اردو ناول کی اقتصادی جہت کو موضوع تحقیق بنایا اور "پاکستانی اردو ناول میں معاشی عدم استحکام کے اثرات" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ مقالہ نگار نے اپنے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول ادب اور معیشت کے بنیادی مباحث سے متعلق ہے۔ اس میں معیشت اور معاشیات کا مفہوم، اسلام میں معاشیات کی اہمیت، اردو ادب میں معاشی افکار اور مسائل کی پیش کش، معاشی استحکام، معاشی عدم استحکام اور اس کے اثرات زیر بحث آئے ہیں۔ اس باب میں پاکستان کی اقتصادی تاریخ کے تناظر میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ پاکستان میں معاشی عدم استحکام کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ معاشرے میں کیا اثرات مرتب کر رہا ہے؟۔ باب

دوم میں قیام پاکستان سے لے کر سقوط ڈھاکہ تک کے عرصہ میں لکھے جانے والے پاکستانی اردو ناولوں میں معاشی عدم استحکام کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم میں سقوط ڈھاکہ سے بیسویں صدی کے آخر تک لکھے جانے والے پاکستانی اردو ناول میں معاشی عدم استحکام کے اثرات کو جانچا گیا ہے۔ باب چہارم میں اکیسویں کے آغاز سے ۲۰۱۹ء تک کے پاکستانی اردو ناول میں معاشی عدم استحکام کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں پاکستان کے نمائندہ ناول نگاروں کے ناولوں کا معاشی عدم استحکام کے اثرات کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے میں ابہام سے بچنے کے لیے مقالہ نگار نے تمام ابواب میں ناول نگاروں کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ناموں کی حروف تہجی کی ترتیب یعنی الف بائی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ کسی بھی ناول کو متعلقہ باب میں رکھتے ہوئے اس کے اولین سن اشاعت کو یقینی بنایا جائے تا کہ اس دور کے مخصوص سماجی اور اقتصادی تناظر میں اس کا تجزیہ کیا جاسکے۔ مقالے میں شاملِ تحقیق کچھ ناولوں میں اقتصادی یا معاشی سروکار بہت زیادہ واضح نہیں ہیں مگر وہ ناول اپنے دیگر فکری اور فنی حوالوں سے اس قدر زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے مقالہ نگار نے ان ناولوں کو بھی مختصر پیرائے میں اس تحقیق کا حصہ بنایا ہے۔

اخلاقیات:

معاصر ادبی افکار میں اخلاقیات کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ معاشرے کا وجود کسی نہ کسی اصول پر ہوتا ہے۔ معاشروں کے وجود کو قائم رکھنے والے دساتیر کو عموماً اخلاقی ضوابط کہا جاتا ہے۔ اخلاقی ضوابط اور اخلاقی قدروں میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ مختصراً ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خالق کائنات کے بتائے ہوئے راستے پر عمل کرنا ہی اخلاق ہے۔ گویا عبادت کرنا ہو تو خدا کے لیے کرے۔ کسی کے ساتھ بھلائی کرنا ہو تو وہ بھی خدا کے لیے کرے۔ تب ہی اس کے ثمر خیر سے فیض مند ہوا جاسکتا ہے۔ انسانی زندگی اخلاقی دائرے سے نکل کر قالب بے روح بن کے رہ جاتی ہے۔ اس لیے پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ " اے لوگو! اپنے اخلاق کو اچھے اخلاق بناؤ"۔

خداوند کریم نے اخلاقی قدروں کا احساس فطری طور پر انسان میں رکھ دیا ہے۔ اس لیے پیغمبر اسلام نے ہر عمل سے پہلے دل کی طرف متوجہ ہونے کا حکم فرمایا تا کہ وہ اچھے اور برے کی تمیز دلائے۔ حیات انسانی کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کے لیے رب العالمین نے اخلاقی اصول سمجھائے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش میں جس اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے، اسی کا صلہ بھی پاتا ہے۔ انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے قوانین خارجی ہوں یا داخلی، سب کا مطمع نظر اخلاقیات کی پیروی اور بالا دستی ہے۔ قانونی گرفت سے انسان کا واسطہ اس وقت پڑتا ہے جب وہ اخلاقی دائرے سے باہر نکلتا ہے۔ وگرنہ ایک سلیم الفطرت انسان کی قانون سے مڈبھیڑ ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں کہ تعزیری قانون مجسمہ اخلاق کے لیے نہیں بلکہ بے راہ اور حیوان کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اکثر علماءِ اخلاق نے انسانی زندگی کے لیے اخلاقیات کو "ام الفضائل" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

انسانی تہذیب و تمدن میں اخلاقی قدروں کی اہمیت مسلمہ رہی ہے۔ ہر قوم اور ہر مذہب میں انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اس کی کلیدی حیثیت تسلیم کی جاتی رہی ہے اور جن اقوام نے ترقی کے بلند زینے چھوئے ان کی مثالی تہذیب بہر صورت اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مرہون منت رہی ہے۔ دور حاضر کے معاشرے میں بگاڑ، بد امنی اور بے سکونی در اصل اخلاقی اقدار سے روگردانی کی وجہ سے ہے۔ اگر دور جدید کا انسان کماحقہ اخلاقی اقدار کی پیروی کرے تو یقیناً یہ زندگی مسرت و انبساط کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ انبیا کرامؑ کی سمادی اور روحانی تعلیمات جو سراسر چشمہ ہدایت تھیں، سے ہٹ کر فلسفیانہ اخلاقیات کا قدیم ترین سہرا یونانیوں کے سر رہا ہے۔ قدیم اخلاقی مفکرین میں سے جالینوس، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام سر فہرست ہیں۔ اُردو ادب میں بھی اخلاقیات کے موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے تخلیقی کام سامنے آئے جن میں پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی مقالے بھی شامل ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی مقالہ جات کا مطالعاتی جائزہ پیش ہے جو 2010ء کے بعد ضبط تحریری کیے گئے۔

موضوع مقالہ: "اردو افسانے میں خیر و شر کا تصور: قیام پاکستان کے بعد "

مقالہ نگار: راحیلہ بشیر، 2012ء

نگران مقالہ: یونیورسٹی آف پنجاب، اورینٹل کالج، لاہور

ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن میں آغاز ہی سے ادب کی تخلیق ایک اہم کارنامہ شمار کی جاتی رہی ہے۔ نثری ادب کی ایک اہم صنف افسانہ ہے جس میں زندگی سے متعلق منتخب تجربات کا جمالیاتی اظہار اور عصری شعور کی رو بھرپور اور خوبصورت تناظر میں جاری و ساری ملتی ہے۔ افسانہ نویس فن کی سطح پر داخلی و معروضی عرفان کے ذریعے مختلف کیفیات سے اکتساب کرتا ہوا علم اور تجربے سے کام لیتا ہے اور فن پارے میں نئی سے نئی معنویت پیدا کرتا ہے۔ تخلیق کار کی استعداد، تخیل، انسانی زندگی، اُمنگوں،

آرزوؤں، خوابوں، دل چسپیوں اور خیالات کو تخلیقی جذبہ فراہم کرتی ہے اور وہ فن پارے کو بہتر سے بہتر پیرائے میں بیان کرتا ہے۔اس کی محنت و ریاضت سے ادب کی دنیا میں بوقلموں تصورات کے اَن دیکھے باب کھلتے ہیں، مختلف جہات کی منظر کشائی ہوتی ہے، جدید سے جدید امکانات کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

افسانے میں جہاں دیگر موضوعات ملتے ہیں وہاں تہذیب انسانی کے اخلاقی پہلوؤں کے حوالے سے بھی کرداروں کی پیش کش عمل میں آتی ہے۔اب یہ کردار اچھائی، برائی یا دونوں صفات کا مرقع ہوسکتے ہیں۔ مثبت یا منفی، صحیح یا، غلط اور خیر یا شر کے حوالے سے یہ کردار مختلف تصورات و نظریات کے حامل ہوتے ہیں اور ان تصورات و نظریات کی بنیاد کا تعین وہاں کے سماج، مذہب، اخلاقیات اور رسوم و رواج سے ہوتا ہے ۔جب خالق کائنات نے روئے زمین پر انسان کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تو اس کی فضیلت کی بنیاد علم پر استوار فرمائی ۔سادہ لفظوں میں یہی فضیلت اور علم "خیر" ہیں یعنی انسان فطری طور پر خیر کا خواہاں ہے اور شر سے گریزاں ہے۔انسان کے باطن میں ہر وقت خیر و شر کی جنگ جاری رہتی ہے۔ دیکھا جائے تو حیات انسانی کی بقا اور ارتقا کا راز شر سے خیر تک کے سفر میں پوشیدہ ہے۔

مذکورہ مقالہ بعنوان "اردو افسانے میں خیر و شر کا تصور: قیام پاکستان کے بعد کو مجموعی طور پر پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔مقالہ نگار نے ابواب کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ خاص سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے پاکستانی معاشرت میں خیر و شر کے تصورات میں ہونے والی تبدیلیوں کو اردو افسانوں کے ذریعے جانچا جاسکے۔ پہلا باب تصور خیر و شر کے بنیادی مباحث پر مشتمل ہے۔اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ تمام نظریاتی مباحث کو مدنظر رکھتے ہوئے اِن دو جذبات و متضاد کیفیات کی توضیح مختلف اقدار اور رسوم و رواج کے ذریعے کی جا سکے ۔ اس باب کو چند ذیلی مباحث کے تحت بیان کیا گیا ہے ۔ آغاز میں مختلف اُردو و انگریزی لغات کی روشنی میں ان کے مفاہیم جاننے کی سعی کی گئی ہے۔ خیر و شر کیا ہے؟ اس پر روشنی ڈالنے کے لیے اولین ذریعہ مطالعہ مذاہب ہو سکتا ہے۔ مختلف مذاہب کے ہاں اس حوالے سے مروجہ تصورات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان میں خیر و شر کے حوالے سے دی گئی تعلیم کو مختصر بیان کیا گیا ہے۔یوں اس موضوعاتی جائزے سے خیر و شر کے مشترکہ اور منفرد تصورات کو سامنے لانے کی کاوش کی گئی ہے۔بعد ازاں تصوف کی نظر میں خیر و شر کے کیا تصورات ہیں، اس حوالے سے ایک مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فلسفہ، فلسفہ جمال، نفسیات اور مختلف سیاسی نظاموں کے تحت ان متضاد جذبات کے حوالے سے کیا کیا نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں ان پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام

علوم اور شعبہ ہائے زندگی میں خیر وشر کی وضاحت کے بعد کیفیات، جذبات، احساسات اور اقدار کے تحت خیر وشر کی متضاد و متخالف ممکنہ فہرستیں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یوں خیر اور شر کے حوالے سے بنیادی مباحث کا احاطہ فکری سطح پر کیا گیا ہے جس کی روشنی میں آئندہ ابواب میں اُردو افسانے کے تجزیات کیے گئے ہیں۔ دوسرا باب "اردو افسانے میں تصور خیر وشر پر تقسیم ہند کے اثرات" ہے۔ اس میں خیر وشر کے مختلف عناصر کا مختلف عنوانات کے تحت افسانہ نگاروں کے ہاں تقسیم ہند کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرا باب "اردو افسانے میں تصور خیر وشر پر عسکری آمریت کے اثرات" ہے۔ اس باب میں بھی خیر وشر کے حوالے سے ذیلی عنوانات ترتیب دیے گئے ہیں۔ چوتھا باب "اردو افسانے میں تصور خیر وشر پر جنگوں کے اثرات" ہے۔ بنیادی طور پر یہ باب مسئلہ کشمیر، ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کی جنگ پر مشتمل ہے۔ عنوانات کو خیر وشر کے متضاد جذبات وکیفیات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ پانچواں باب "اردو افسانے میں تصور خیر وشر: عصری تناظر میں" ہے۔

چونکہ زمانہ موجود میں ذرائع آمد ورفت، انٹرنیٹ، ٹی وی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی بدولت دنیا گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ تمام دنیا کی تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئی ہیں ایسے میں دنیا میں خیر وشر کے تصورات میں ہونے والی تبدیلی نے پاکستانی سیاست پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں ان کا ایک جائزہ بھی اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔ محاکمے میں تمام ابواب کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقالے کا ملخص پیش کر دیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں تمام مآخذات کو تحقیقی اصولوں کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ روبینہ سرور،اُردو تراجم قرآن کے اسالیب منتخب اور نمائندہ تراجم کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ،مقالہ برائے پی ایچ ڈی(اُردو)،جامعہ کراچی،2014ء،ص:13

2۔ محمد طاہر قریشی، ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر: سقوط دلی تا سقوط ڈھاکہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی(اُردو)،جامعہ کراچی، 2013ء،ص:12

3۔ غلام فاروق،اُردو غزل میں غیر اسلامی تصورات کا نفوذ،مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،سرحد یونیورسٹی،پشاور،2021ء، ص:1

4۔ محمد یوسف ، آزاد کشمیر میں اُردو حمدیہ و نعتیہ شاعری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،ہزارہ یونیورسٹی،مانسہرہ،2020ء ص:9

5۔ رضیہ نور محمد،اُردو زبان وادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ،مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جامعہ پنجاب،لاہور،1967ء،ص:9

6۔ راشد ارشد،اُردو غزل میں حمدیہ ونعتیہ موضوعات:منتخب شعرا کے حوالے سے،مقالہ برائے پی ایچ ڈی(اُردو) ،یونیورسٹی آف ایجوکیشن،لاہور،2013ء،ص:12

7۔ محمد عابد،اُردو تنقید میں جدیدیت کے مباحث: خصوصی مطالعہ (شمس الرحمان فاروقی،ڈاکٹر وزیر آغا،ڈاکٹر شمیم حنفی) مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی،ملتان،2017 ، ص:14

8۔ محمد اقبال کامران، پاکستان میں عملی تنقید کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جی سی یونیورسٹی،لاہور، 2012ء،ص:1

9۔ انوار الحق، علامہ اقبال کی اُردو نظموں کے کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جامعہ پشاور، 2017ء،ص:1

10۔ فوزیہ رانی، پاکستانی اُردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (1947ء تا2000)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پنجاب، لاہور، 2011ء، ص:2

11۔ فرزانہ اقبال، اُردو مضمون نویسی کے ارتقا میں خواتین کا حصہ: 1898ء تا1930ء، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2017ء، ص:2

12۔ عائشہ حمید، پاکستانی اُردو شاعرات پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، نمل، اسلام آباد، 2010ء، ص:10

13۔ نورین رزاق، اُردو افسانے کی روایت اور پاکستانی خواتین افسانہ نگار: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (1947ء سے عصر حاضر تک)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پنجاب، لاہور، 2012، ص:1

14۔ ایضاً

15۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم، صادق حسین، اقبال بک ڈپو، لاہور، 1944ء، ص: 130

16۔ زینب افشاں، اردو فکشن (ناول، افسانہ) کے سقوط ڈھاکہ پر اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2012ء، ص:10

17۔ عمارہ طارق، اُردو افسانے میں جاگیردارنہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پنجاب، لاہور، 2015ء، ص:6

باب سوم:

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ

(ادبی اصناف کے تناظر میں)

نثری اصناف:

اُردو ادب دو اصناف نثر اور شاعری پر مشتمل ہے۔ نثر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی "بکھرے ہوئے، جدا جدا یا منتشر" کے ہوتے ہیں۔ نثر میں الفاظ مختصر نہیں ہوتے بلکہ منتشر ہوتے ہیں یعنی نثری تحریر میں الفاظ کا پھیلاؤ، بکھراؤ اور تفصیل ہوتی ہے۔ نثر ایسا کلام ہے جس میں وزن اور قافیہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی نثر میں وزن اور قافیہ ہو تو اُسے نظم کے زمرے میں ہی شمار کیا جاتا ہے یا پھر اسے نثر مقفیٰ کہا جائے گا۔ نثر ایک ذریعہ ترسیل ہی نہیں بلکہ ادبی صنفی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ نثر دو اصناف یا اقسام پر مشتمل ہے۔ ان اقسام میں افسانوی یا داستانوی نثر اور غیر افسانوی یا غیر داستانوی نثر شامل ہے۔

اُردو کے افسانوی ادب میں "داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ، شخصیت نگاری، افسانچہ، ڈراما، تھیٹر اور تمثیل نگاری وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ غیر افسانوی ادب انشائیہ، طنز و مزاح، تذکرہ، مقالہ، مضمون، مکتوب یا خطوط نگاری، سوانح، آپ بیتی، خاکہ نگاری، سفر نامہ، روزنامچہ، رپورتاژ اور ترجمہ نگاری وغیرہ پر مشتمل ہے۔ زیر تحقیق باب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں پاکستانی جامعات میں اُردو کی نثری اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر شامل ہے۔ دوسرے حصے میں اُردو ادب کی شعری اصناف کے حوالے سے جامعات میں کی گئی تحقیق کو زیر بحث لایا گیا ہے جبکہ اس باب کے تیسرے حصے میں "لسان و لسانیات" میں اُردو زبان، صوتیات، معنویات، صرف اور نحو وغیرہ کے عنوانات کے تحت لکھے گئے مقالات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ پاکستانی جامعات میں اُردو نثر کے افسانوی ادب میں کی گئی تحقیق کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے ذیل میں اُردو کے افسانوی ادب کی نمایاں نثری اصناف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

داستان:

داستان خیالی واقعات پر مبنی ایک طویل کہانی کو کہتے ہیں جس میں عجیب وغریب واقعات، شہزادے، شہزادیاں، جنات، پریاں، محلات اور طلسم وسحر کے کارنامے دلچسپ انداز میں بیان کیے جاتے ہیں جو پڑھنے اور سننے والے کے لیے راحت ومسرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ داستان میں جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ قصے سے قصہ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ مختلف مناظر کہانی میں ایک خاص کیفیت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ رنگا رنگ مناظر، حیرت انگیز کردار اور جادوئی اور طلسماتی واقعات پڑھنے اور سننے والے کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں۔ قاری ہر لمحہ قصے یا داستان کے انجام تک پہنچنے کے لیے بے قرار رہتا ہے۔ اس طرح داستان ایک طویل کہانی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ صنف بھی ہے۔ داستان کے بارے میں گیان چند لکھتے ہیں:

> " گو ظاہر اس کا کوئی اعلیٰ مقصد مثلاً خیر وشر کا جہاد ہو لیکن دراصل یہ افسانوی دلچسپی کے لیے لکھی جاتی ہیں جس کو پڑھ کر حظ اُٹھانا مقصود ہوتا ہے"۔ (1)

اُردو میں داستان نگاری کے آغاز میں دکنی دور کو اہمیت حاصل ہے۔ دکن میں لکھی گئیں داستانوں میں سب سے اہم داستان ملا وجہی کی "سب رس" ہے۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آتے ہی اُردو میں باقاعدہ طور پر نثر نگاری کا آغاز ہوا۔ اس کالج کا اہم مقصد بھی یہی تھا کہ مختلف زبانوں کی معتبر کتب کو ہندوستان کی زبانوں خاص طور پر اردو زبان میں آسان ترجمے کے ساتھ شائع کیا جائے تا کہ انگریزی، فارسی اور دیگر زبانوں کی نادر تخلیقات عام لوگوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے مواقع ملیں۔ فورٹ ولیم کالج کے ذریعے اُردو میں بہت سی قدیم داستانوں کا ترجمہ کیا گیا جن میں "باغ وبہار از میر امن، توتا کہانی از حیدر بخش حیدری، شکنتلا از مرزا کاظم علی جوان، نثر بے نظیر از میر بہار حسین، قصہ گل بکاولی از نہال چند لاہوری وغیرہ شامل ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں لکھیں گئیں داستانوں کے علاوہ انشا اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" بھی اُردو کی اہم داستانیں ہیں۔

ناول:

ناول اطالوی زبان کے لفظ "ناویلا" سے نکلا ہے جس کے معنی "نیا یا انوکھا" ہیں۔ یہ صنف اُردو ادب میں انگریزی ادب کے ذریعہ داخل ہوئی۔ اردو میں ابتدائی قصہ گوئی "داستان" کی شکل میں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد نہ صرف ہندوستان میں سماجی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلی آئی بلکہ ادبی طور پر بھی نمایاں

تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسی دور میں داستان کی جگہ ناول لکھنے اور پڑھنے کا شوق عام ہوا۔ اُردو میں ناول نگاری کا باقاعدہ طور پر آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ناول " مراۃ العروس" سے ہوتا ہے۔ یہ ناول انہوں نے ۱۸۶۹ء میں لکھا۔ اس کے بعد اُنہوں نے "بنات النعش، توبتہ النصوح اور ابن الوقت" وغیرہ بہت سے ناول لکھے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے یہ تمام ناول تعلیمی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے لکھے تھے، جس کا مقصد خوبصورت کہانیوں کے ذریعے پڑھنے والوں کی اصلاح کرنا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار نے "فسانہ آزاد" لکھ کر ناول نگاری کے فن کو آگے بڑھایا۔ اس طرح اُردو میں ایک کے بعد ایک خوبصورت ناول لکھے گئے جن میں مرزا ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا"، پریم چند کے ناول" گودان "عبد الحلیم شرر کے ناول "فردوس بریں"، عصمت چغتائی کے ناول" ٹیڑھی لکیر "اور قراۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" کو اہم مقام حاصل ہے۔

فنی اعتبار سے قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر کشی وغیرہ ناول کے بنیادی عناصر ہیں۔ ناول ایک ایسی طویل کہانی ہوتی ہے جس میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو پلاٹ، کردار، مکالمے، خوبصورت منظر نگاری کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ ناول میں قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر، اسلوب، وقت اور مقام کا تعین اور نقطۂ نظر یا نصب العین ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ناول میں عموماً ابتدا سے کشمکش کا آغاز شروع ہوتا ہے اور وہ اپنے نقطۂ عروج تک پہنچتے پہنچتے قارئین کو انتہائی دلچسپی لینے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ ناول کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس میں فرد وسماج کی کشمکش اور جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کی جاتی ہے۔ مختلف کرداروں کے ذریعہ زندگی کے کئی رُخ پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک کامیاب ناول نگار وہی ہوتا ہے جو ناول کے اجزائے ترکیبی کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی شعور رکھتا ہو اور سنجیدگی سے لکھنا جانتا ہو۔

ناولٹ:

ناولٹ، ناول کی ہی ایک قسم ہے۔ فنی اعتبار سے ناول کے جو بنیادی عناصر ہیں وہی ناولٹ کے ہوتے ہیں۔ ناول اور ناولٹ میں فرق صرف اتنا ہے کہ ناول پوری زندگی پر تفصیل سے لکھا جاتا ہے جبکہ ناولٹ میں زندگی کے کچھ واقعات اور پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ناولٹ کی کہانی ناول کی طرح ہی ہوتی ہے لیکن یہ ناول کے مقابلے میں مختصر جبکہ افسانے کے مقابلے بڑی ہوتی ہے۔ اس لیے اسے طویل افسانہ بھی کہا جاتا ہے۔ اُردو میں راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ "ایک چادر میلی سی اس کی خوبصورتی مثال ہے۔

افسانہ:

مختصر کہانی کو افسانہ کہتے ہیں۔ لغت کے اعتبار سے افسانے کا مطلب "جھوٹی کہانی، من گھڑت قصہ" ہے لیکن ادبی اصطلاح میں افسانہ زندگی کے کسی ایک خاص واقعے یا پہلو کی وہ خوبصورت اور فنی پیش کش ہے جو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ ناول اور افسانے میں یہ فرق ہے کہ ناول میں کسی کردار کی مکمل زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور افسانے میں زندگی کا صرف ایک رُخ یا پہلو ہی پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے کے اجزائے ترکیبی بھی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو ناول میں پائے جاتے ہیں مگر افسانے کی ایک نمایاں صفت "وحدت تاثر" ہے۔ فنی اعتبار سے ایک خوبصورت افسانے میں پلاٹ، منظر نگاری، وحدت تاثر، کردار نگاری اور مکالمے کا ہونا ضروری ہے

اُردو میں افسانے کا آغاز انیسویں صدی کے شروع میں سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند اور راشد الخیری کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ اُردو کا پہلا افسانہ کون ہے؟ اس کے بارے میں بہت سے مصنفین کے الگ الگ رائے ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سب سے بڑا نام منشی پریم چند کا ہے۔ جنہوں نے ہندوستانی گاؤں کے دبے کچلے لوگوں کی زندگی کو موضوع بنا کر بڑے خوبصورت افسانے لکھے۔ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے وابستہ مصنفین میں اہم ترین نام کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، ہاجرہ مستور اور سجاد ظہیر وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں قتل وغارت گری اور فرقہ واریت کے جو مناظر پیش آئے ان کی دردناک تصویریں اُردو افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اردو افسانہ ہر عہد کی حقیقوں کا ترجمان رہا ہے۔ نئے افسانہ نگاروں نے نئے عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق اُردو افسانے میں اضافہ کیا ہے۔ آج کی سماجی اور سیاسی پریشانیاں، بے روزگاری، نوجوانوں کی زندگی کے مسائل یہ بھی کچھ نئے افسانوں کا موضوع بنتا جارہا ہے۔

ڈراما:

ڈراما ادب کی ایک قدیم صنف ہے۔ جو یونانی لفظ "ڈراؤ" سے نکلا ہے۔ ڈرامے کے لغوی معنی کسی چیز کو کرکے دکھانا یا عملاً پیش کرنے کے ہیں۔ اس میں واقعات زندگی کو کرداروں کی مدد سے عملاً پیش کیا جاتا ہے۔ ڈراما بھی داستان، ناول اور افسانے کی طرح ایک کہانی ہی ہے لیکن یہ ایسی صنف وہ صنف ہے جو الفاظ کی محتاج

نہیں کیونکہ ڈراما الفاظ سے نہیں عمل سے بنتا ہے۔ارسطو نے "بوطیقا" میں اسے انسانی افعال کی نقل کہا ہے۔اُردو ادب میں امانت لکھنوی کا ڈرامہ "اندر سبھا" اُردو کا سب پہلا ڈرامہ کہلاتا ہے جو ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا۔ لیکن کچھ محققین نواب واجد علی شاہ کو اُردو کا پہلا ڈراما نگار اور ان کے "رادھا کنہیا' کو اُردو کا پہلا ڈراما مانتے ہیں۔ اچھے ڈراما میں قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، موضوع اور مقصد جیسے اجزا کا موجود ہونا لازمی ہے۔اُردو ڈراما نگاری میں سب سے اہم نام آغا حشر کاشمیری کا ہے جنہوں نے ۳۲ سال تک ڈرامے لکھے اور اتنی شہرت حاصل کر لی کہ اُردو ڈرامے کے شیکسپیئر کہلائے۔بقول پروفیسر آل احمد سرور:

> "آغا حشر کاشمیری نے اپنی ساری زندگی ڈرامے کے لیے وقف کر دی تھی۔اس کے ذریعہ سے انھوں نے روپیہ بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے ڈرامے کے فن کو بھی بلند کیا"۔(2)

آغا حشر کاشمیری کے بعد سب سے معتبر ڈراما نگار امتیاز علی تاج ہیں جنہوں نے بہت سے ڈرامے لکھے جن میں سب سے زیادہ شہرت ڈراما "انار کلی" کے ذریعہ ملی۔اُن کا یہ ڈراما آج بھی اُتنا ہی مقبول ہے جتنا امتیاز علی تاج کے زمانہ میں تھا۔

افسانچہ / منی کہانی:

افسانچہ یا منی کہانی اُردو افسانے کی مختصر ترین صنف ہے۔اس میں کسی خاص زماں اور مکاں میں پیش آنے والے واقعات کا دلکش بیان مختصر سے مختصر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔افسانچہ کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات کو چند سطروں یا چند لفظوں میں اس خوبصورتی سے پیش کیا جاتا ہے کہ قاری پوری کہانی کا مزہ لے لیتا ہے۔ آج کے صنعتی دور میں انسانی مصروفیات اور تنگی وقت کی وجہ سے یہ صنف پروان چڑھی ہے۔اُردو میں باضابطہ طور پر افسانچہ کی روایت منٹو سے شروع ہوتی ہے۔انہوں نے ۱۹۳۸ء میں سیاہ حاشیے" کے عنوان افسانچوں کا مجموعہ لکھا۔ جس میں سب سے پہلا افسانچہ " ساعت شریں" ہے۔اس طرح اُردو میں منٹو نے افسانے کی شکل میں ایک نئ صنف افسانچے کا آغاز کیا۔ لیکن اُس وقت کے کچھ نقادوں نے انہیں افسانے ماننے سے انکار کر دیا اور انہیں لطیفے کہہ کر مذاق بھی اڑایا۔

تمثیل نگاری:

تمثیل عربی کا لفظ ہے۔تمثیل سے مراد ایسا انداز تحریر ہے جس میں تصوراتی کرداروں کے ذریعہ تمثیل نگار کا مقصد انسان کی اخلاقی و جذباتی کمزوریوں کی اصلاح کرنا ہوتا ہے۔اس ضمن میں ملا وجہی کی "سب

رس "اور مولانا محمد حسین آزاد کی "نیرنگ خیال" کے کئی مضامین پیش کیے جاسکتے ہیں۔ "سب رس "اردو کی پہلی مکمل تمثیل ہے۔ یہ ایک طویل تمثیلی داستان ہے۔ اس داستان کے سارے کردار، انسانی جذبات یا انسانی صلاحیتیں اور قوتیں جیسے عقل، دل، حسن اور نظر وغیرہ ہیں۔ اس تمثیل میں حسن کو عشق کی بیٹی قرار دیا گیا ہے اور دل کو عقل کا بیٹا۔ ملا وجہی کے بعد اُردو ادب میں سب سے اہم کتاب مولانا محمد حسین آزاد کی "نیرنگ خیال" ہے۔ اسی کتاب سے متاثر ہو کر بہت سے ادبیوں نے تمثیلی مضامین لکھنے شروع کیے، بقول گیان چند جین:

> "اُردو کی مکمل تمثیل وجہی کی سب رس ہے جو نقش اول ہونے کے باوجود نقش آخر کی نوک پلک رکھتی ہے"۔ (3)

اُردو کے تمثیلی ادب کی تاریخ زیادہ تابناک نہیں ہے۔ "سب رس" اور "نیرنگ خیال" کے علاوہ بہت کم ایسی تصانیف ہیں جو اردو ادب میں تمثیلی رنگ میں لکھی گئی ہوں۔ کرشن چندر اور کنہیالال کپور جیسے چند ادیوں کے نام ہی سامنے آتے ہیں جنہوں نے کچھ مضامین تمثیلی رنگ میں لکھے۔ تمثیل نگاری کو چار اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں اخلاقی تمثیل نگاری، علمی تمثیل نگاری، سیاسی یا سماجی تمثیل اور طنزیہ تمثیل نگاری شامل ہیں۔ اُردو کی افسانوی نثری اصناف کا تعارف پیش کرنے کے بعد ذیل میں پاکستانی جامعات میں افسانوی نثر کے تناظر میں لکھے گئے مقالہ جات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش ہے۔

موضوع مقالہ: "اردو افسانے میں مغربی تہذیب کے عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ (2000ء تا 2016ء) "

مقالہ نگار: محمد نعیم، 2017ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی، جامعہ پشاور، پشاور

اُردو میں صنف افسانہ کی تخلیق اور روایت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ صنف کتنی مقبول اور پڑھنے والوں کے لیے کس قدر پسندیدہ ہے۔ اس کی وجہ کہانی سے ابتدائی زمانے سے ہی انسان کی دلچسپی اور رغبت ہے۔ صنف افسانہ میں مخصوص تہذیبی عناصر کی عکاسی کے حوالے سے اس دلچسپ اور منفرد موضوع پر سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہوئے تحقیقی سطح پر جانچنے کی کوشش کی گئی۔ اردو افسانے نے جہاں زمینی رشتے کے تعلق سے اپنے خطے کے واقعات اور مسائل کو اس دھرتی کے گرد و پیش، ماحول اور تہذیبی فضا کے تناظر میں پیش کیا وہاں ہندوستان میں انگریزوں کے توسط سے رواج اور شناسائی حاصل کرنے والی مغربی تہذیب کے

عناصر کی بھی خوب عکاسی کی۔ تہذیبی عناصر کی بو قلموں عکاسی کی یہ روایت یوں تو صنف افسانہ کے آغاز کے ساتھ ہی پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہے لیکن بیسویں صدی کے وسط میں اس خطے سے جاکر مغربی ممالک میں آباد ہونے والوں اور اس تہذیبی ماحول میں بسنے والوں کے تاثرات کے بعد اس میں حقیقی تصویریں اپنے اصل رنگوں کے ساتھ دکھائی دیں۔ اس مخصوص رجحان کے تحت صنف افسانہ کی تخلیق کے حوالے سے خصوصاً موجودہ صدی کی یہ دو دہائیاں بہت اہم ہیں۔ ان میں اُردو کے کئی ایسے افسانہ نگار دکھائی دیتے ہیں جن کی کہانیوں کے واقعات اور ماحول کا تعلق مغربی معاشرے اور مغربی تہذیب سے ہے۔

ان حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے مذکورہ مقالہ نگار نے اس مقالے کے لیے موضوع کے تحت ۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۶ء کا دور منتخب کیا ہے۔ اس میں ابتدائی طور پر افسانہ میں اس رجحان کے آغاز پر بات کرتے ہوئے مثالیں دی گئی ہیں، اس کے بعد اصل موضوع کے تحت اس مخصوص دور کے افسانوں سے مثالیں دیتے ہوئے بات کی گئی۔ یہ مقالہ کل چار ابواب پر مشتمل ہے، جس میں پہلا باب تہذیب کے اصول اور مبادیات سے متعلق ہے۔ بابِ مذکورہ کے متعلقہ موضوع کے حوالے سے تہذیب کی لغوی ساخت، تعریف، ابتداء، اصول، عناصر ترکیبی، ارتقا اور مغربی تہذیب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب پر بات کرتے ہوئے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "اسلامی تہذیب چونکہ دین اسلام کے نظام حیات کی تہذیب تھی اس لیے اس کے پھیلاؤ کا سلسلہ بھی اس کے ساتھ ہی ہوا۔ گویا دینِ محمدی دنیا کے جن جن علاقوں تک رسائی حاصل کرتا تھا وہاں اسلامی تہذیب کے عناصر جگہ حاصل کرنے لگے"۔(4)

اس مقالے کا دوسرا باب ایک طویل اور ضخیم باب ہے، جس میں صنف افسانہ کے ابتدائی دور کے حوالے سے پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش جیسے افسانہ نگاروں کے افسانوں سے مغربی تہذیب کے عناصر کی مثالیں دیتے ہوئے موجودہ منتخب دور کے کام کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ۲۰۰۰ء تا ۲۰۱۶ء کے درمیان لکھے گئے افسانوں سے مغربی تہذیب کے عناصر کی نشاندہی اور مثالیں دیتے ہوئے بات کی گئی ہے۔

مقالے کا تیسرا باب مغربی تہذیب کے نمائندہ مرد کرداروں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب کے آغاز میں افسانوی ادب اور خصوصاً صنف افسانہ میں کرداروں کی اہمیت اور کردار پر بات کرنے کے بعد اصل موضوع، مغربی تہذیب کے نمائندہ مرد کردار اپنی نفسیات، نوع اور متعلقہ موضوع کے مطابق اپنی

خصوصیات کے ساتھ اجاگر کیے گئے ہیں۔ اپنے مخصوص تہذیبی تناظر اور خصوصیات کے ساتھ ان کرداروں کی نمائندگی کی مثالیں دیتے ہوئے انہیں سامنے لایا گیا ہے۔ تیسرے باب کے برعکس باب چہارم، مغربی تہذیب کے نمائندہ نسوانی کرداروں کی نمائندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس باب میں افسانوں سے ایسی مثالیں دی گئی ہیں جن میں مغربی تہذیب کے نمائندہ نسوانی کردار اپنی ٹھوس نمائندگی کے ساتھ اجاگر کیے گئے ہیں۔ نیز ان کے کردار اور عادات واطوار سے مغربی تہذیب کے عناصر کے نقوش دکھاتے ہوئے مغربی معاشرے میں ان کے کردار اور حیثیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقالے کے آخر میں مقالہ نگار نے تحقیقی جائزے کو سمیٹتے ہوئے پچھلے ابواب کی روشنی میں "حاصل مطالعہ" پیش کیا گیا ہے۔ مغربی تہذیب کے عناصر کے مخصوص رجحان کو مختلف افسانہ نگاروں کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلو سامنے لائے گئے ہیں۔ اس موضوع پر تحقیق و تنقید سے جو باتیں سامنے آئی ہیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں مغربی تہذیب کا افسانوں کے مطالعے کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔

موضوع مقالہ: "اردو ناول پر ادبی تحریکوں کے اثرات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: عدنان احمد، 2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر پروین کلو، اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

بیسویں صدی اس اعتبار سے بڑی زرخیز ثابت ہوئی کہ اس صدی میں اردو ادب میں نئے نظریات، اصناف سخن اور نئے رجحانات داخل ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے بھی ایسی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کی بدولت برصغیر کے حالات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اردو ناول کی تاریخ تقریباً ڈیڑھ سو سال کو محیط ہے، بیسویں صدی میں اس صنف نے تیزی سے ترقی کی۔ موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور یہ میڈیم خیالات کی ترسیل کا آسان اور جامع ذریعہ بنا، بلا شبہ اردو ناول اردو ادب کا ایک اہم رکن ہے۔ جن ادبی تحریکوں اور رجحانات نے اردو ناول پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں ان میں سے سرسید کی مقصدی تحریک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ناول کا آغاز بھی اسی تحریک کے مرہون منت ہے۔ اس مقالے کے حوالے سے مقالہ نگار عدنان احمد لکھتے ہیں:

> "اس مقالے میں اردو ناول کی ابتدا سے اردو ناول نگاروں نے جن ادبی تحریکوں سے اثرات لیے، ان تحریکوں اور ان کے اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں

تحریکوں کا تعارف اور عمومی بحث میں چند منتخب ناول نگاروں پر ان ادبی تحریکوں
کے اثرات اور خصوصی بحث میں منتخب ناولوں پر ان تحریکوں کے اثرات کو پیش
کیا گیا ہے"۔(5)

مذکورہ بالا مقالے میں اردو ناول کا جائزہ ادبی تحریکوں کے حوالے سے لیا گیا ہے تاکہ بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر میں جن ادبی تحریکوں نے جنم لیا تھا ان تحریکوں سے وابستہ اور ان سے متاثر ناول نگار اپنے ناولوں میں ان رجحانات کو کس طرح پیش کرتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ اس تحقیقی مقالے کے لیے بنیادی مآخذ کو ترجیح دی گئی ہے اور حسب ضرورت ثانوی مآخذ بھی تصرف میں لائے گئے ہیں۔ عدنان احمد نے اپنے مقالے "اردو ناول پر ادبی تحریکوں کے اثرات (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)" کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "برصغیر کا سیاسی و سماجی اور ادبی منظر نامہ" کے نام سے ہے۔ اس میں برصغیر کے سیاسی اور سماجی حالات اور اس عہد میں اردو ادب کی صورت حال اور اردو کی ترویج میں انگریزوں اور مقامی ادیبوں کی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا باب "اردو ناول پر علی گڑھ تحریک کے اثرات" کے نام سے ہے۔ اس باب میں علی گڑھ تحریک کے حوالے سے اردو ناول پر مرتب ہونے والے اثرات کا تجزیہ لیا گیا ہے جس میں منتخب ناول نگاروں اور چند منتخب ناولوں "ابن الوقت، شریف زادہ صبح زندگی، شام زندگی اور یاسمین" پر علی گڑھ تحریک کے اثرات تلاش کیے گئے ہیں۔

تیسرا باب "اُردو ناول پر رومانوی تحریک کے اثرات" کے نام سے ہے۔ اس میں رومانوی تحریک کی ابتدا اور اردو ناول نگاروں اور چند منتخب ناولوں "فسانہ آزاد، فردوس بریں، شہاب کی سرگزشت، نگری نگری پھرا مسافر اور آبلہ پا" پر اس ادبی تحریک کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ چوتھا باب "اردو ناول پر ترقی پسند تحریک کے اثرات" کے نام سے ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر محرکات اور اس کا اردو ناول نگاروں اور خصوصی طور پر چند منتخب ناولوں "گئودان، لندن کی ایک رات، شکست، ٹیڑھی لکیر اور خدا کی بستی" پر اس تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب اردو ناول پر حلقہ ارباب ذوق و ذیلی تحریکوں کے اثرات کے نام سے ہے۔ اس باب میں حلقہ ارباب ذوق کی تحریک کے آغاز وارتقا اور اس تحریک کے زیر اثر پیدا ہونے والی جدیدت کی تحریکوں، پاکستانی ادب کی تحریک، ارضی و ثقافتی تحریک اور اسلامی ادب کی تحریک کے اردو ناول نگاروں اور اس تحریک کے منتخب ناولوں "آگ کا دریا، سنگم، اداس نسلیں بستی اور راکھ" پر ان تحریکوں کے اثرات تلاش کیے گئے ہیں۔ چھٹا باب "اردو ناول پر متفرق تحریکوں کے اثرات" کے نام

سے ہے۔ اس باب میں متفرق تحریکوں "وجودیت، علامتیت، تجریدیت" کے اردو ناول نگاروں اور منتخب ناولوں "خوشیوں کا باغ، دیوار کے پیچھے، جنم کنڈلی اور غلام باغ" پر ان تحریکوں کے اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں "ماحصل" ہے۔ اس میں مقالے کا محاکمہ کیا گیا اور اردو ناول کی تحقیق کے حوالے سے سفارشات پیش کی گئیں ہیں۔

موضوعِ مقالہ: " واجدہ تبسم کے افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: غنچہ بیگم، 2019ء

نگرانِ مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین، شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، پشاور

واجدہ تبسم کی زندگی میں اُن پر ایسی کوئی کتاب، یا تنقید یا تبصرہ شائع نہیں ہوا کہ جس میں اُن کے ادبی کارناموں پر بے لاگ اور منصفانہ تبصرہ کیا گیا ہو۔ اس مقالے میں غنچہ بیگم نے اُن کی تقریباً تمام جملہ تخلیقات کو پیشِ نظر رکھ کر اُن کے ادبی مقام و مرتبے کے تعین کی سعی کی ہے جس سے اس مقالے کی اہمیت اس لحاظ سے بڑھ گئی کہ یہ واجدہ تبسم پر پی ایچ ڈی سطح کا پہلا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "واجدہ تبسم: حیات اور تصانیف کا تعارف" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں واجدہ تبسم کے حالاتِ زندگی، ان کی ادبی زندگی کا آغاز اور تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب واجدہ تبسم کے فکر و فن کی تفہیم میں معاونت بھی کرتا ہے۔ دوسرا باب "واجدہ تبسم کی کہانیوں کا فکری مطالعہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں واجدہ تبسم کی کہانیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ غنچہ بیگم نے اس باب کو تین فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اوّل: واجدہ تبسم کے افسانوں کا مطالعہ ہے۔ فصل دوم: ناولوں کا تنقیدی جائزہ اور فصل سوم میں: واجدہ تبسم کے ناولٹوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب "واجدہ تبسم کی کہانیوں میں دکنی تہذیب و تمدن کی عکاسی" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں دکنی تہذیب و تمدن کے عناصر واجدہ تبسم کی کہانیوں میں تلاش کیے گئے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ نہ صرف ادب کے طالب علموں کے لیے سودمند رہے گا بلکہ اس سے سماجی اور معاشرتی علوم کے طلبا بھی استفادہ کر سکیں گے۔ چوتھا باب "واجدہ تبسم کی کہانیوں کا فنی جائزہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں واجدہ تبسم کی فنکارانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اُن کے افسانے، ناول اور ناولٹ اپنے فنی عناصر اور لوازم پر کس قدر پورے اترتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کے فن میں کمزوری نظر آئی ہیں اُس کی بھی نشاندہی کر دی گئی ہے تاکہ مقالہ صرف تعریفوں کا پلندہ ہی نہ رہے۔ پانچواں باب: "حاصلِ تحقیق" کے عنوان سے

ہے۔ اس باب میں واجدہ تبسم کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعین کی سعی کی گئی ہے۔ آخر میں نتائج و سفارشات بھی مرتب کیے گئے ہیں۔

موضوع مقالہ: " انیسویں صدی میں اُردو ناول میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ"

مقالہ نگار: جویریہ انور، 2014ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نسیمہ رحمٰن، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

متوسط طبقہ (Middle Class) کی اصطلاح مغرب سے درآمد شدہ ہے۔ یورپ میں یہ ایک سے زیادہ معنوں میں استعمال ہوتی رہی ہے لیکن متفقہ طور پر اسے اشرافیہ اور کسانوں کے درمیانی طبقہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ معاشرے کا وہ طبقہ جو بلحاظ آمدن، تعلیم اور معیار زندگی میں درمیانے درجے پر فائز ہوتا ہے چھوٹی یا درمیانے درجے کی جائیداد کا مالک ہوتا ہے اور روز مرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسے مزدوری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ متوسط طبقے نے ہر دور میں ہر ملک میں انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ روس کے انقلاب میں متوسط طبقے کا کردار انتہائی اہم رہا۔ کارل مارکس انقلاب روس میں متوسط طبقے کے کردار کو کلیدی قرار دیتا ہے۔ اس کے خیال میں روسی معاشرے کے اندرونی دشمن جو ناانصافی اور استحصال کے علمبردار تھے۔ ان کے خلاف متوسط طبقہ ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور انقلاب روس کی کامیابی کی ضمانت بنا۔ انقلاب فرانس میں بھی متوسط طبقے نے عملی اور مسلح بغاوت میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ انہی وجوہات کی بناء پر اُنیسویں صدی کو یورپ میں متوسط طبقے کی صدی قرار دیا گیا۔ ”انیسویں صدی میں اُردو ناول میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ“ کے عنوان سے تحریر کیے گئے مقالے کو جویریہ انور نے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول کا عنوان "متوسط طبقہ: تعارفی مباحث" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے متوسط طبقے کی تعریف و مفہوم بیان کیا اور دنیا کے مختلف مکاتب فکر میں متوسط طبقے کے حوالے سے تشریحات بیان کی ہیں۔

مقالے کا باب "دوم انیسویں صدی میں اُردو ناول کی روایت" کے نام سے ہے۔ اس باب میں انہوں نے انیسویں صدی میں ناول کے ارتقا اور آغاز کے حوالے سے بحث کی ہے۔ باب سوم میں "ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ" لیا گیا ہے۔ انہوں نے اس باب میں اُردو زبان کے پہلے

ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا ور ان ناولوں میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا بطریق احسن جائزہ لیا ہے۔باب چہارم "رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں اُردو ناول نگاری کے میدان میں نمایاں خدمات سرانجام دینے والے رتن ناتھ کے ناولوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ناول نگار نے متوسط طبقے کے مسائل کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ عبدالعلیم شرر کا شمار بھی اُردو کے معروف ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔جویریہ انور نے اپنے مقالے کے باب پنجم میں عبد لعلیم شرر کے ناولوں میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ لیا ہے۔مقالے کا باب ششم "مرزار سوا کے ناولوں میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ" پیش کرتا ہے جبکہ مقالے کے ساتویں باب میں اُنیسویں صدی کے اُردو ناول میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا مطالعہ متفرق ناولوں کو سامنے رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے مقالے کے آخر میں محاکمہ اور کتابیات کی فہرست بھی دی۔جویریہ انور اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

> "ہندوستان میں متوسط طبقے کی نمو اُنیسویں صدی کے آغاز میں ہی شروع ہو گئی تھی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوط کرنا شروع کیے لیکن انقلاب ۱۸۵۷ء کے واقعے نے تیزی کے ساتھ متوسط طبقے کو قومی دھارے میں شامل کیا۔ متوسط طبقہ (Middle Class) کی اصطلاح جیمز براڈشا (James Bradshaw) نے باقاعدہ طور پر تب استعمال کی جب اُس کا پمفلٹ Scheme to Prevent Runing Irish شائع ہوا"۔(6)

مذکورہ بالا مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بدلتے سماجی، سیاسی، اقتصادی حالات نے بھی متوسط طبقے کی نمو میں اہم کردار ادا کیا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہی اُردو ناول کا آغاز ہوا تو نئی صنف نے عوام کے مسائل کا بیڑا اٹھایا۔انیسویں صدی میں ناول کی روایت کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں عباس حسین ہوش، نواب محمد آزاد، رشیدہ النساء، محمد علی طبیب اور علامہ راشد الخیری اہم ہیں۔

موضوع مقالہ: " 1947ء کے بعد اردو کے نمائندہ افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا کا تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: انتل ضیاء، 2016ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین، شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، پشاور

ادب کا تخلیقی عمل عمومیت کا حامل ہوتا ہے اس لئے اس کے خصوصی تجزیے کے لئے تحقیق و تنقید کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح تخصیص کے عمل کے نتیجے میں ادب کی افادیت، وقعت اور حقیقی نوعیت سامنے آتی رہتی ہے۔ ادب اور تحقیق معاشرے کو نئے سرے سے متشکل کرنے کا سلسلہ ہے اس لئے دورِ حاضر میں خصوصی علوم اور مطالعات کے تناظر میں اس کی افادیت اجاگر کرنے کا سلسلہ چل نکلا ہے جو نتائج کے اعتبار سے معقر ہے۔ انتل ضیاء نے اسی احساس کے پیش نظر پی ایچ ڈی کی سطح پر "۱۹۴۷ء کے بعد اردو کے نمائندہ افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)" کا انتخاب کیا۔ اس مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کا تعین صرف تاریخی تعین ہے کیونکہ موضوعات حادثاتی طور پر اچانک جنم نہیں لیتے یا کوئی نفسیاتی مسئلہ اتفاقی طور پر ایک لمحے میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ ماضی میں اس کی جڑیں اور عوامل موجود ہوتے ہیں جس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

افسانہ جدید ادب کی مقبول صنف ہے اور ناسٹلجیا دورِ حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ۔ دونوں کو اکائی بنا کر موضوعاتی سطح پر ابھارنا مقالہ نگار کا اہم کارنامہ ہے ۔ مقالہ نگار نے اس مقالے میں نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص طور پر ان افسانوں کا انتخاب کیا ہے جو ناسٹلجیا کے حوالے سے اہم ہیں۔ ناسٹلجیا کا ذکر کسی نہ کسی طور پر ادب کی ہر دو اصناف نثر اور نظم میں موجود ہے۔ تقسیم ہند کے سانحہ نے اردو ادب پر اپنے دور رس اثرات مرتب کئے اور ہجرت کی شکل میں اپنا گھر بار چھوڑنے والے ادیبوں میں وطن سے دوری کا احساس اور ایک نئے ماحول میں آباد ہونے کی کوشش میں درپیش مسائل نے ادیب کو ناسٹلجیائی فضا میں داخل ہونے کی ترغیب دی اور اس موضوع پر لکھنے کی طرف مائل کیا۔

تقسیم ہند کے بعد زمین سے بے دخلی محض زمین سے رشتے کا انقطاع نہیں بلکہ ایک پوری تہذیب و ماحول اور اپنے اقدار سے کٹ جانا تھا، جبکہ فطرت کا اصول ہے کہ انسان اپنے گزرے ہوئے لمحات، ماضی کے تجربات اور جغرافیائی حوالوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس عہد کا کردار اپنے اس حصے کی بازیافت میں مصروف نظر آتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اس کردار کے وجود سے کٹ چکا ہے تحریک آزادی میں اپنا گھر بار اور تہذیب و کلچر چھوڑ کر جو لوگ ہجرت کر آئے اُن لوگوں کا ایک مخصوص ذہنی سرمایہ یادوں اور احساس ماضی کی صورت میں ان کے ساتھ سفر کرتا رہا۔ اس صورت حال میں جو ادب تخلیق ہوا وہ ماضی کی ان یادوں کو کسی نہ کسی صورت پیش کرتا ہے۔ " 1947ء کے بعد اردو کے نمائندہ افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا کا تنقیدی

جائزہ" میں انتل ضیا نے اس اہم جہت کو تحقیقی مقالے کا موضوع بنا کر اس حوالے سے نئے پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

باب اول میں ناسٹلجیا کیا ہے ؟ اس کے اصطلاحی معنی کے ساتھ ساتھ ناسٹلجیا کی مختلف اقسام اور رجحانات بیان کرتے ہوئے اس فضا پر بات کی گئی ہے جس سے افسانے میں ناسٹلجیا نے جنم لیا۔ کردار کا تعارف کرتے ہوئے افسانے میں ناسٹلجیائی کردار کی تعریف کے ساتھ ادیب کے ناسٹلجیا پر بھی بات کی گئی ہے۔ باب دوم میں افسانے کی روایت میں ناسٹلجیا کے اُن فکری عوامل کا تجزیہ کیا گیا جن کی بدولت ناسٹلجیائی فضا نے جنم لیا جیسا کہ ہجرت کا کرب، عصری صورت حال کی تلخی، مسرت و سکون کی تلاش، انسانی رشتوں کا انہدام، خوابوں کے ٹوٹنے کا عمل، جغرافیائی وابستگی، دیہی و شہری زندگی کا تضاد، بے تعلقی اور بے یقینی کا احساس وغیرہ۔ یوں انہوں نے مختلف فکری جہتوں کا تجزیہ کر کے ناسٹلجیائی کردار اور ادیب کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

مقالہ نگار نے باب سوم میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے افسانہ نگاروں کے ہاں موجود اُن مختلف عوامل کا مطالعہ کیا جن کی وجہ سے ناسٹلجیا نے کرداری یا موضوعاتی سطح پر جنم لیا اور پھر اُن کے نمائندہ افسانوں میں کرداری ناسٹلجیا کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ باب چہارم میں ۱۹۷۱ء تا ۲۰۰۱ء تک کے نمائندہ افسانہ نگاروں کے تخلیقی عمل میں ناسٹلجیا کا مطالعہ اور مختلف کرداروں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں اُن معاشرتی، تہذیبی، جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیوں کی وجوہات اور اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے جن کی بدولت ادیب کے ہاں ناسٹلجیا اور ناسٹلجیائی کردار نے جنم لیا۔ باب پنجم میں ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۵ء کے نمائندہ افسانہ نگاروں کا خصوصی مطالعہ ناسٹلجیا کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ " ۹/۱۱" کے بعد پاکستانی معاشرے میں بیرونی اثرات کی بدولت مختلف تبدیلیاں رونما ہوئیں، فردِ واحد بے یقینی اور خوف کی کیفیت میں مبتلا ہوا اور اندرونی ہجرتوں کا ایک مسلسل سلسلہ شروع ہوا جس نے سماج کو اقتصادی، معاشرت اور تہذیبی بے چینی میں گرفتار کیا۔ یہاں ایک مختلف قسم کے ناسٹلجیا نے جنم لیا۔ اس باب میں انہوں نے ان اندرونی و بیرونی حالات و واقعات کے تناظر میں اس دور کے ناسٹلجیائی کردار کا تجزیہ کیا ہے۔ اس دور کے کردار کے ہاں عصری کرب بھی ہے اور ماضی سے جڑے ہوئے کرب کا تسلسل بھی، جو ۱۹۴۷ء سے شروع ہوا تھا۔ مذکورہ باب میں ان سارے عوامل کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب ششم میں ۱۹۴۷ء تا ۲۰۱۵ء تک اردو افسانے میں جو

نمائندہ کردار ناسٹلجیا کے حوالے سے سامنے آئے ہیں ان کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ میں ادیب کی فکر پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا تذکرہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں تحقیق کا حاصل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو ناول میں تہذیبوں کے درمیان مکالمہ "

مقالہ نگار: ریاض حسین،2016

نگران مقالہ: ڈاکٹر عقیلہ شاہین، شعبہ اُردو و اقبالیات، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

تہذیب فہمی دراصل انسان اور انسانی ضرورتوں کا درست مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کا نام ہے۔ تہذیب ان اسباب کا مجموعہ ہے جن سے انسان کرہ ارض پر ایک خاص حیثیت سے سرفراز ہوا ہے، یہ اجتماعی زندگی کا بہترین ثمر ہے۔ انسان کی تمام مذہبی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی اقدار کی پرورش و پرداخت تہذیبوں نے کی ہے۔ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے حصول خوراک کی سعی قدیم ہو یا تسخیر کائنات کا جنون جدید، مظاہر فطرت کی پوجا ہو یا ایک خدا کی بندگی، فلسفہ لا الہ ہو یا تصور تثلیث، اصول ویدانت ہوں یا ضابطہ ہائے شریعت کسی اوتار کا گیان ہو یا کسی پیغمبر کا الہام، بھکتی و نروان ہو یا نجات و عرفان، تمدن گذشتہ کے کھنڈرات ہوں یا عہد حاضر کی فلک بوس عمارتیں، ہل کی انی کی ایجاد ہو یا پہیے کی، کمپیوٹر کی ہو یا راکٹ کی، ڈائنوسارس کی دریافت ہو یا وائرس اور بیکٹیریا کی، تسخیر آتش و برق کی ہو یا طوفان و تحیر سے معمور سمندر کی، تلسی کی رامائن ہو یا دیوان غالب، انسان اور کائنات کے باہمی رشتوں کو استوار اور متوازن رکھنے والے یہ تمام وظائف تہذیب ہے۔ یہ وظائف سینکڑوں انسانی نسلیں ادا کر چکی ہیں اور ابھی کچھ اور نسلوں نے ادا کرنے ہیں۔

مقالہ بحوالہ عنوان بالا کے پانچ ابواب ہیں، پہلا باب تہذیب کے فکری و نظری مباحث پر مشتمل ہے جس میں پہلے تہذیب کے بنیادی عوامل کی وضاحت کی گئی ہے بعد ازاں باری باری ویدک، مغربی اور اسلامی تہذیب کے آغاز و ارتقا اور ہر تہذیب کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، دوسرے باب میں مقالہ نگار نے اردو داستان کے تہذیبی جائزے اور ناول کی مبادیات کو پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ مقالہ نگار نے یہ بتائی ہے کہ اردو داستان معاصر ہند اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اس عہد کے تمام مروجہ علوم و فنون، معاشرتی آداب اور طبقہ عالیہ کی مجلسی زندگی کے بہترین نقوش داستانوں میں پائے جاتے ہیں، دوم یہ کہ موضوع و مواد اور پیش کش کے اعتبار سے اردو ناول داستان کی شاندار روایت کا مرہون منت ہے۔ تیسرے باب میں مقالہ

نگار ریاض حسین نے اردو ناول کی روایت کو سامنے رکھ کر اس کے بین التہذیبی بیانیوں کو سامنے لایا ہے۔ چوتھے باب میں ان ناول نگاروں کو اس مکالمے میں شریک کیا گیا ہے جن کے ہاں سب سے زیادہ تہذیبی تنوع پایا جاتا ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں اس سارے کام کو سمیٹ کر محاکمے کی صورت دے دی گئی ہے۔ مقالہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے یہ کام غیر جانبداری سے کیا ہے اور تہذیبوں میں کسی قسم کی درجہ بندی سے بھی اجتناب برتا ہے۔

مذکورہ مقالے میں تہذیبی مکالمہ سے مراد ان تہذیبی رویوں کی نشاندہی کرنا ہے جو تمام تہذیبوں میں مشترک ہیں اور جن کی موجودگی سے تہذیبوں کے درمیان ہم آہنگی کا امکان ہمیشہ رہا ہے۔ جب اس نقطہ نظر سے اردو ناول کا مطالعہ کیا جائے تو اردو ناول کے ماجرے میں یہی تہذیبی ہم آہنگی نظر آتی ہے، جس کی بنیاد پر مختلف مذاہب اور طبقوں کے درمیان کچھ انفرادی شناختوں کے باوجود برصغیر کا معاشرہ صدیوں تک ایک مشترک سماجی نظام پر قائم رہا۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں کچھ صداقتیں ایسی ہیں جن کی تصدیق صرف اسی تہذیب کے قائم کردہ معیارات سے ہی ہو سکتی ہے اور کچھ ایسی آفاقی قدریں بھی ہیں جن کی تصدیق انسانیت کے پیمانوں سے ہوتی ہے۔ اردو ناول کا عمومی رجحان انسانی زندگی کی انہی آفاقی قدروں کی طرف رہا ہے کیونکہ ناول انسان کے انفرادی اور اجتماعی آفاقی رویوں اور انسانی زندگی کا مکمل ادبی بیانیہ ہے اس لیے ناول میں جس زندگی کو پیش کیا جاتا ہے وہ کسی بھی طبقے کی طرف سے وضع کی گئی سچائیوں سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ اس مقالے کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تہذیب انسانی جبلتوں کو حد اعتدال میں رکھتی ہے، کسی بھی جبلت کا تجاوز کرنا حیوانیت کو فروغ دینا ہے۔ جبلت کا ضابطہ اخلاق و قانون میں رہنا، نہ صرف اجتماعی زندگی کے لئے ناگزیر ہے بلکہ اس کا حسن بھی ہے۔ حمورابی کا قانون، مقدس وید، عہد نامہ قدیم وجدید، تری پٹک اور قرآن مجید انسانی زندگی کے ضابطوں کی جزوی اور کلی صورتیں ہیں۔ ان کتابوں میں افتراق و امتیاز جغرافیائی اور زمانی ہے، جہاں زمانہ اور جغرافیہ کے تقاضوں کے مطابق انسانی فطرت اور اخلاقی ضرورت میں توازن کا یکساں خیال رکھا گیا ہے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> " انسانی ضرورتوں کی طرح انسانی اوصاف میں بھی اختلاف سے زیادہ اشتراک پایا جاتا ہے۔ بقائے باہمی کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے، اپنی شناخت کو قائم رکھنا، گروہوں میں انفرادی یا اجتمائی مفاد کا پیش نظر رہنا، سماج میں انضباط قول و فعل کا

قانون و شریعت میں ڈھل جانا یہ تہذیبوں میں ہوتا رہا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے"۔(7)

مقالہ نگار نے اس بات پر زور دیا کہ کلچر ایک ترقی یافتہ زبان کے بغیر بھی معرض وجود میں آسکتا ہے لیکن کسی تہذیب کی پرورش و پرداخت کے لیے ایک ترقی یافتہ زبان کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ اہرام مصر کی دیواروں پر کندہ تصویری رسم الخط کلچر ہے، اجنتا کے غاروں کی تصویر کاری کلچر ہے، رقص، موسیقی اور صنم تراشی کلچر ہے، آلات حرب و ضرب اور کاشتکاری و دست کاری کلچر ہے مگر وید مقدس تہذیب ہے۔ حمورابی کا قانون تہذیب ہے، عہد نامہ عتیق و جدید تہذیب ہے اور قرآن مجید تہذیب ہے۔ یہ وہ تہذیبی ضابطے ہیں جو اجتماعی زندگی کے ضامن تھے اور آج بھی ہیں۔ ان تمام ضابطوں کا وجود زبان کا مرہون منت ہے۔ انسانی ضروریات میں تحدید و تنوع بالترتیب انسان کو سادگی سے پیچیدگی کی طرف لے جاتا ہے۔ ان ہر دو صورتوں میں زبان ہی تہذیب کو زندہ رکھتی ہے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اُردو ناول میں مزاحمتی رجحانات "

مقالہ نگار: محمد کامران شہزاد، 2019ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر آصف اعوان، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

مزاحمت، کسی بھی حرکت و عمل سے اختلاف کرنا اور طاقت کا استعمال کرنا، رکاوٹ کرنا، روکنے کے لیے موثر اقدامات کرنے کا نام ہے ۔ مقالہ نگار نے مذکورہ مقالے میں پاکستان میں لکھے جانے والے ناولوں میں مزاحمتی رجحانات کا جائزہ لیا تا کہ یہ دیکھا جاسکے کہ پاکستان کی جمہوری اور فوجی حکومت کی پالیسوں، سماجی مسائل اور مذہبی بنیادوں پر جو مزاحمتی رجحان پروان چڑھا، اس رویے کو پاکستانی ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کس انداز میں پیش کیا ہے، مقالہ نگار محمد کامران شہزاد مزاحمت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "مزاحمت کا لفظ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس وقت استعمال ہوا، جب یورپ کے متعدد ممالک پر جرمنی نے قبضہ کر لیا تھا۔ کئی افراد نے خفیہ طور پر غاصب جرمن افواج کے خلاف جدوجہد شروع کر دی، جس کے نتیجے میں مزاحمتی تحریک نے جنم لیا"۔(8)

مقالہ نگار نے اپنے مقالے کو موضوع کی مناسبت سے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول " مزاحمت: روایت اور بنیادی مباحث " کے عنوان سے ہے۔ اس میں مزاحمت کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم،

اقسام، مزاحمت کے جواز کی ممکنہ بنیادیں، مزاحمت کا دائرہ کار اور اثرات متعین کرنے کی سعی کی گئی ہے اور مزاحمت کا بطور ادبی اصطلاح استعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو ادب میں مزاحمت کی تاریخ اور قیام پاکستان سے قبل اُردو ناول میں مزاحمتی رویوں کو پرکھا گیا ہے۔ باب دوم بعنوان "پاکستانی اُردو ناول میں سیاسی مزاحمت" کو انہوں نے پانچ فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں تقسیم ہند اور فسادات، مارشل لا، سقوط ڈھاکہ، نائن الیون اور بلوچستان میں اُردو ناول اور مزاحمت کے عنوانات شامل ہیں۔ باب کی ہر فصل میں عنوان کے مطابق زمانی ترتیب سے ناولوں میں مزاحمتی رجحانات کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ باب سوم "پاکستانی اُردو ناول میں سماجی مزاحمت" کے عنوان سے ہے۔ مذکورہ باب میں بھی زمانی ترتیب سے پاکستانی اُردو ناول میں معاشرے میں رونما ہونے والے سماجی مسائل کے حوالے سے ناول نگاروں کے مزاحمتی رویے کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم "پاکستانی اردو ناول میں مذہبی مزاحمت" کے عنوان سے ہے، جس میں بعد از قیام پاکستان لکھے جانے والے ناولوں میں مذہبی انتہا پسندی، ملا ازم، افغانستان جنگ اور جہاد کشمیر کے حوالے سے مزاحمتی اور احتجاجی رویوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ باب پنجم کا عنوان "پاکستانی اُردو ناول میں تاریخی مزاحمت" ہے۔ مذکورہ باب میں تاریخی مزاحمت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ اس میں ایسے ناولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، جن کا بنیادی یا ثانوی موضوع تاریخ ہے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اُردو ناولوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ: 1971ء کے بعد "

مقالہ نگار: محمد فرید احمد، 2015ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شبیر احمد قادری، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

مذکورہ مقالہ بعنوان "پاکستانی اردو ناولوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ چار ابواب پر منقسم ہے۔ اس مقالے کے پہلے باب میں اردو ناول کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب "پاکستانی اردو ناول کے موضوعات اور رجحانات پر مشتمل ہے۔ تیسرا باب پاکستانی اردو ناول کے اسالیب کے حوالہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مقالے کا چوتھا باب پاکستانی اردو ناول کی کردار نگاری سے متعلق ہے۔ مقالے کے آخر میں " ماحصل" کے عنوان کے تحت مقالہ میں پیش کیے گئے خیالات کا مجموعی جائزہ مختصراً پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار محمد فرید احمد نے پہلے باب کو تین ذیلی عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں آزادی سے قبل اردو ناول کی روایت کو ہندوستان کے تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ مولوی نذیر احمد، مولوی عبدالکریم، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری اور مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کے اہم پہلوؤں کا

احاطہ کیا گیا ہے۔ اس باب کے دوسرے حصے میں قیام پاکستان کے بعد اردو ناول کو پاکستانی سیاسی و سماجی پس منظری مطالعہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستانی اردو ناول کی بدلتی جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

دوسرے باب "پاکستانی اردو ناول کے موضوعات و رجحانات" میں اردو ناول کو مختلف رجحانات کے تحت اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اردو ناول کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی نقوش ابھرتے نظر آسکیں۔ آزادی سے قبل اردو ناول پر ناصحانہ اور تاریخی چھاپ کے گہرے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ تقسیم کے بعد یہی رجحانات حقیقت پسندی کا روپ دھار لیتے ہیں جن کا احاطہ اس ناول کے دوسرے باب کے ذیلی عنوان "تقسیم کے بعد اردو ناول کے رجحانات" کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخری حصہ میں مشرقی پاکستان کے موجودہ پاکستان سے "بنگلہ دیش" کی صورت میں جدا ہو جانے کے بعد جو بے یقینی اور اپنی اصل سے کٹ جانے کا احساس نمایاں طور پر پاکستانی اردو ناول میں منظر عام پر آیا، اس صورتِ حال کا جائزہ ایسے ناولوں کے تناظر کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اردو ناول کی ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک ناول کے بدلتے ہوئے متنوع موضوعات کا احاطہ بھی اسی باب کے ذیل میں شامل ہے۔ تیسرے باب کے تحت اردو ناول کے اسالیب کو زیر بحث لایا گیا اور "پاکستانی اردو ناول کا اسلوبیاتی مطالعہ" کے حوالہ سے اردو ناول کی روایت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک بدلتے ہوئے اسالیب کو موضوعاتی، سماجی اور اقتصادی اثرات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب اور اسالیب کے فرق کو واضح کرتے ہوئے ہر دور کے حوالے سے ان اسلوبیاتی تبدیلیوں کو بھی بیان کیا گیا ہے جو سماجی اور موضوعاتی حوالے سے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ آزادی سے قبل، قیام پاکستان کے بعد اور سقوطِ ڈھاکہ سے لے کر موجودہ دور تک اردو ناول میں تبدیل ہوتے ہوئے اسلوب کی وجوہات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

محمد فرید احمد نے اس مقالہ کے چوتھے باب میں پاکستانی اردو ناول (۱۹۷۱ء کے بعد) کے کرداری مطالعہ کو زیر بحث لایا ہے۔ اس باب کی ابتدا میں کردار نگاری کی تاریخ اور فنی تقاضوں سے متعلق وضاحت دی گئی ہے۔ اس باب کو بھی انہوں نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں مولوی نذیر احمد سے لے کر قیام پاکستان تک کے ناولوں کا کرداری مطالعہ ہندوستان کے سیاسی و سماجی پس منظر اور موضوع کے تقاضوں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ آغاز سے تاحال اردو ناول میں کردار نگاری کے حوالہ سے بہت سے تجربات کیے گئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد، رشیدۃ النسا اور راشد الخیری کے مثالی کرداروں سے شروع ہوتا ہوا یہ سلسلہ "شعور

کی رو" تک کا سفر کرتے ہوئے موجودہ دور کی حقیقت پسندی کو بیان کرتا ہے۔ ان تمام تر کرداری نوعیت کی تبدیلیوں کا ذکر مذکورہ باب میں کیا گیا ہے۔ مقالے کا آخری حصہ "ما حصل" پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں انہوں نے مقالے کے تمام ابواب کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اس حصے میں موضوع سے متعلق تمام تر نکات کو زیر بحث لایا جائے۔

موضوع مقالہ: "اردو افسانے میں معاشرتی ناانصافیوں کا تجزیاتی مطالعہ: 1960ء سے تا حال "

مقالہ نگار: طاہر محمود، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

آج کے جدید دور میں دن بھر کی مصروفیات نے زندگی کو کئی طرح کی پریشانیوں سے پُر کر رکھا ہے جس سے زندگی کسی طوفان سے کم نہیں ہے۔ ایسے میں ادب کی خدمت کرنے والے قابل ستائش ہیں افسانہ اُردو کے افسانوی ادب کی اہم صنف ہے۔ افسانہ انگریزوں کی آمد کے بعد اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس نے ابتدا ہی میں معاشرتی ناانصافیوں کو بیان کرنا شروع کر دیا تھا۔ کبھی حقوق نسواں کا غلغلہ ہوا، کبھی حقیقت نگاری کا پرچار اور پھر "انگارے" جیسے مجموعے نے تنقید کے ایسے تیر چلائے کہ ماجد دریا آبادی جیسے مفکرین کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ ان انگاروں کو یا تو آگ کے لپکتے انگاروں میں جلا دینا چاہیے یا پھر فضلے کے ڈھیر پر پھینک کر ان کو ختم کر دینا چاہیے۔ وقت گواہ ہے کہ اس مجموعہ ہی نے آگے بڑھ کر ایسے لکھنے والے پیدا کیے جنھوں نے ترقی پسند تحریک جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی اور یہ تحریک پہلی باقاعدہ تحریک تھی جس کا منشور بھی طے کیا گیا تھا ثابت کر دیا کہ حقیقت نگاری سے بڑھ کر اب کچھ تقاضے اور بھی ہیں ۔ مزدور اور محنت کش کی ہمدرد اس تحریک نے ہندوستان میں موجود لوگوں کو اپنی زندگی میں مثبت تبدیلیاں لانے پر غور و فکر کی دعوت دی۔ قیام پاکستان کے بعد فسادات اور پھر ملکی صورت حال نے بہت سے افسانہ نگاروں کو بہت کچھ دکھایا اور بہت سے نئے موضوعات اس میں شامل ہونے لگے۔ اظہار پر پابندی لگی تو علامت نگاری کی تحریک نے زور پکڑا اور ایسے افسانہ نگار کثیر تعداد میں سامنے آئے پھر جدیدیت اور پس جدیدیت کے بحثیں شروع ہوئی اور افسانہ میں فرد کی تنہائی اور ورلڈ آرڈر کی حقیقت جیسے موضوع کے باعث افسانہ مقامی ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی بن گیا۔

زیر مطالعہ مقالے میں مقالہ نگار طاہر محمود نے اُردو افسانے میں معاشرتی ناانصافی جیسے منفرد موضوع پر تحقیق کی ہے۔ اُن کا یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان "معاشرتی ناانصافی: مفہوم و تاریخی

پس منظر (ابتدا تا1930)" ہے۔اس باب میں انہوں نے معاشرے کی تعریف،ناانصافی کا مفہوم اور تاریخ و پس منظر سے آگاہی فراہم کی ہے۔اُن کے مقالے کا دوسرا باب "اُردو افسانے میں معاشرتی ناانصافیوں کا تجزیاتی مطالعہ (1930ء تا1960ء)" ہے۔اس میں انہوں نے 1930ء سے 1960ء تک کے دورانیے میں لکھے گئے نمایاں افسانوں میں معاشرتی ناانصافیوں کا تجزیہ کیا ہے۔اپنے مقالے کے باب سوم میں انہوں نے 1960ء کے بعد افسانے میں ہونے والی فکری تبدیلیوں اور سیاسی و سماجی پس منظر پر بحث کی ہے۔باب چہارم کا عنوان "سماجی ناانصافیاں اور اُردو افسانہ" کے عنوان سے ہے۔باب پنجم میں "سیاسی ناانصافیاں اور اُردو افسانہ" میں سیاسی انصافیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جبکہ مقالے کے آخری باب ششم میں مقالے کا مجموعی جائزہ "ماحصل" کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ مقالہ نگار کے مقالے کا موضوع معاشرتی ناانصافی پر مبنی ہے۔معاشرتی کا لفظ "معاشرہ" سے نکلا ہے۔ "معاشرہ" افراد کے ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے جو ایک طویل عرصے سے ایک جگہ رہ رہا ہو۔ جس معاشرہ میں انصاف نہیں ہوتا وہ ظالم معاشرہ کہلاتا ہے کیونکہ عدل کی ضد ظلم ہے اور ناانصافی اصل میں ظلم ہی کے مترادف ہے۔ انصاف کی اقسام " معاشرتی، قانونی، سیاسی، معاشی و مذہبی" وغیرہ ہیں۔ گویا اگر ان صورتوں میں معاشرہ میں موجود افراد کسی فرد سے یا کچھ افراد سے ناانصافی کریں تو ایسی ناانصافی معاشرتی ناانصافی کے زمرے میں آئے گی۔موضوع کی مناسبت کے اُن کا یہ مقالہ ایک اہم کاوش ہے جس سے معاشرے میں سیاسی و سماجی میدانوں میں ہونے والی ناانصافیوں کو سمجھنے اور اُن کا تدارک کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اردو ناول میں مظلوم طبقوں کی عکاسی "

مقالہ نگار: شگفتہ پروین،2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نسیمہ رحمان،جی سی یونیورسٹی،لاہور

جس زمانے میں اردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز ہوا، اُس وقت ہندوستان ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ظہور پانے والی انتشاری اور متشدد فضا کی لپیٹ میں تھا۔ چنانچہ اس واقعہ سے لے کر معاصر دور تک کا طاہرانہ جائزہ لیا جائے تو باور ہوتا ہے کہ سیاسی تاریخ کا یہ دور خاصا ہنگامہ خیز رہا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی حالات و واقعات چنداں ساز گار نہ تھے۔ ایک آدرشی معاشرہ کی تشکیل کی بجائے ذاتی خود غرضیاں، منافقت، لوٹ

کھسوٹ، جھوٹ، مکر، فریب اور لا قانونیت سماج کی شناخت قرار پائے اور انتظام سلطنت میں بھی غیر آئینی اقدامات کو فروغ ہوا، ان حالات وواقعات نے اجتماعی زندگی کو خاصا مغموم رکھا تھا۔

ایک ادیب اپنے افکار وخیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے لیے خانگی اور خارجی حقائق ہی سے مواد ترتیب دیتا ہے۔ ناول چونکہ پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اس لیے اُس میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جس عہد میں وہ ناول تخلیق ہوا ہو۔ تاریخ ادب شاہد ہے کہ خواہ کسی عہد کا ادیب ہو وہ اپنے عصر کی ناہمواریوں، سفاکیوں اور انسانیت کش قوتوں کے خلاف سپر آزما ہوا اور انسانی اقدار کی بقاو تحفظ کے حق میں آواز بلند کی۔ لہٰذا مظلومیت کے حوالے سے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ خاصا فکر انگیز ہے۔ مذکورہ مقالے کے تجزیاتی مطالے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضوع ادبی تناظر اور سماجی نقطہ نگاہ ہر دو حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے پہلے مظلومیت کے تناظر میں ناولوں کا جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اس اہم موضوع پر بھی کام کیا جائے۔

پاکستانی اُردو ناول میں مظلوم طبقوں کی عکاسی کو منضبط انداز سے بیان کرنے کے واسطے مقالہ نگار نے اس مقالے کو چار ابواب اور محاکمہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول "مظلومیت تعارف، تصورات وتوجیہات "میں مظلومیت کا تعارف لغات، تصورات، دائرۃ المعارف اور سماجی علوم کی کتب کے مطالعے سے اخذ شدہ نتائج کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ظلم کے سماجی اور نفسیاتی محرکات بھی سامنے لائے گئے ہیں اور اسلامی تصورات کے تحت بھی اس موضوع کو جانچا گیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے برصغیر کی تاریخ کے تناظر میں بھی ظالمانہ اقدام کا مختصر خاکہ مرتب کیا ہے۔ اسی باب میں لفظ ""طبقہ "کے مختلف تصورات کی وضاحت کے بعد یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس مقالہ میں اس کا کیا مفہوم لیا گیا ہے اور اردو ناول میں مظلومیت کی مختلف اشکال بھی سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔ باب دوم "قیام پاکستان سے قبل مظلوم طبقوں کا اظہار "میں پس منظری مطالعہ کی حیثیت سے قیام پاکستان سے قبل لکھے جانے والے ناولوں میں مظلوم طبقات کی عکاسی کا منضبط جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں وہ ناول نگار شامل ہیں جنہوں نے مظلومیت کے پس منظر میں ناول تخلیق کیے ہیں۔ اس باب میں اس دور میں سیاسی اور عالمی سطح کی تبدیلیوں کے پیش نظر جو نئی استحصالی اشکال بن رہی تھیں انہیں بھی روشن کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے اہم ترین ناول نگاروں کی تخلیقات کا مجمل جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے مقالے کے باب سوم میں قیام پاکستان کے بعد تخلیق شدہ ناولوں میں مظلوم طبقات کی عکاسی کا تفصیلی مطالعہ حوالہ قرطاس کیا ہے۔ انہوں نے موضوع کے تنوع کے پیش نظر ذیلی

عنوانات بھی دیے ہیں جن میں "جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ نظام اور مظلوم طبقہ، ہجرت و فسادات اور مظلوم طبقہ، خواتین کی مظلومیت، مذہب اور مظلوم طبقہ اور بچوں کی مظلومیت" کے ذریعے ناولوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس جائزے میں یہ دیکھنے کی سعی کی گئی ہے کہ آزاد مملکت پاکستان میں مظلومیت کے روایتی تصورات کیا ہیں؟ اور نئے تصورات کون کون سے ہیں؟ اور ان نئی اشکال کی کیا توجیہات ہیں؟۔ اسی باب کے اندر یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ کون سے ناول نگار نے کس رجحان کے تحت زیادہ لکھا ہے۔ باب چہارم بعنوان "اہم ناول نگار" میں صرف موضوع کے لحاظ سے اہم ناول نگاروں کی ناول نگاری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مقالہ نگار کے پیش نظر یہ باتیں تھیں کہ صرف انہی ناول نگاروں کو شامل کیا جائے جنہوں نے اپنے ناولوں میں مظلومیت کو زیادہ بیان کیا ہے اور انھوں نے ایک سے زیادہ ناول اس موضوع کے تحت لکھے ہیں۔ مقالے کے "محاکمہ" میں ناولوں کے مطالعے سے اخذ شدہ نتائج کو جامعیت سے قلمبند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس مقالے میں ظلم اور ظالم کی تعریف کرتے ہوئے مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

> "ظلم کرنے والے کو ظالم کہا جاتا ہے اور جس پر ظلم ہوتا ہے اسے مظلوم کہتے ہیں۔ اب یہ دیکھنا کہ مظلومیت کیا ہے؟ کون کون سے افعال و اعمال یا کیفیات میں مبتلا انسان، مظلوم کہلاتا ہے؟"۔(9)

ان استفسارات کے جوابات کی تصریحات انہوں نے اس طرح دی ہیں کہ پہلے یہ واضح کیا جائے کہ ظلم کیا ہے؟ مظالم کے کیا کیا انداز ہیں؟ ظلم کی کون کون سی صورتیں عام فہم ہیں اور کون سے پہلو ہیں جو ظلم کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں مگر ان کی سنگینی کا ادراک نہیں کیا جاتا۔ ظلم کے مترادفات "ستم، جبر، زیادتی، جفا، آفت، مصیبت، استبداد اور تشدد مستعمل ہیں۔ ظلم کے دو نمایاں پہلو بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک ظاہری پہلو مثلاً جسمانی تشدد، قتل و غارت، کسی کے مال، دولت پر ناجائز قبضہ کر لینا۔ دوسرا پہلو ایسے کام انجام دینا یا ایسی گفتگو کرنا جن سے دوسرں کے جذبات مجروح ہوں۔

موضوعِ مقالہ: "اردو افسانے میں واحد متکلم کا کردار: تجزیاتی مطالعہ "

مقالہ نگار: رابعہ مقدس، 2013ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر شفیق انجم، نمل، اسلام آباد

داستان سے ناول اور ناول سے افسانے کی طرف کہانی کا جھکاؤ ایک طرف کل سے جزو کی طرف زندگی کے جھکاؤ کا عکاس ہے تو دوسری طرف یہ ماورائیت سے حقیقت کی طرف سفر کا اعلان نامہ بھی ہے۔ مختصر

افسانے کی بنیادی خصوصیت زندگی کی کسی ایک حقیقت، تاثر یا کیفیت کو گرفت میں لانا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی افسانے میں واقعات، تصورات اور مناظر و ماحول کی طرح کردار بھی اپنی کسی ایک حقیقت ہی کو سامنے لا پاتے ہیں۔ اردو افسانے میں آغاز ہی سے واحد متکلم کا کردار نمایاں ہوا اور بعد میں اس تکرار اور تسلسل سے اسے اختیار کیا گیا کہ یہ افسانوی ادب کا ایک کلیدی کردار بن گیا۔ آغاز سے اب تک اس کردار کی متنوع صورتیں سامنے آچکی ہیں۔ ہر عہد، علاقے اور ہر افسانہ نگار کے ہاں اس کی ہیت ترکیبی اور خصوصیات میں فرق بھی ہے اور مماثلتیں بھی۔ یہ کردار ایک طرف کسی فرد کا قائم مقام ہے تو دوسری طرف ایک طبقے کا نمائندہ بھی۔ اس کے عمل ورد عمل، سوچ، خوابوں، خواہشوں، تمناؤں اور نظریات و تصورات کا مطالعہ محض ایک فرد کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ اس سماجی اکائی کا مطالعہ بھی ہے جس کی وہ نمائندگی کر رہا ہے۔

اس مقالے کا باب اول "واحد متکلم کا کردار: تعارف اور معنوی حدود" پر مشتمل ہے۔ اس باب میں واحد متکلم کے تعارف کے علاوہ افسانوی ادب میں اس کی اہمیت اور اس کے آغاز وار تقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم اردو افسانہ کے ابتدائی دور اور واحد متکلم کے کردار کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کی افسانہ نگاری کے رجحانات اور واحد متکلم کے استعمال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے افسانوں میں واحد متکلم کے کردار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں "انگارے" کے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، عزیز احمد اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں واحد متکلم کردار کی انفرادیت اور ضرورت سے بحث کی گئی ہے۔

چوتھا باب قیام پاکستان سے 1960ء تک کے افسانوں میں واحد متکلم کے کردار کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں ممتاز مفتی، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، اختر جمال اور غلام الثقلین نقوی شامل ہیں۔ ان اہلِ قلم کے افسانے نئے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کہیں شناخت اور عدم شناخت کے حوالے سے واحد متکلم کا کردار اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ باب پنجم معاصر افسانہ پر مشتمل ہے۔ اس میں انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، منشایاد، احمد جاوید، مظہر الاسلام، اسد محمد خان اور مرزا حامد بیگ شامل ہیں۔ یہ دور اردو افسانے کی پاکستانی شناخت اور آمریت کے خلاف مزاحمت کا دور ہے اس حوالے سے واحد متکلم کردار کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب ششم مجموعی جائزے اور نتائج پر مشتمل ہے۔ افسانہ مختلف ادبی اور سماجی رجحانات کا عکاس رہا ہے۔ اردو افسانے پر مختلف حوالوں سے تحقیقی و تنقیدی کام کیے گئے ہیں اور ابھی ایسے مزید امکانات موجود بھی ہیں۔ زیر نظر مقالہ افسانے میں واحد

متکلم کردار کی اہمیت، افادیت اور ضرورت کے پیشِ نظر لکھا گیا۔ واحد متکلم کردار کہانی کے اندرون سے قاری کے اندرون تک کا سفر کرتا ہے۔ اس طرح قاری خود کو بھی افسانے میں شامل سمجھتا ہے۔

زیر نظر مقالے کا مقصد کہانی میں اسی تسلسل کا تجزیہ کرنا ہے۔ مقالہ نگار نے اس بات پر بحث کی ہے کہ افسانہ نگار کسی افسانے میں واحد متکلم کر کردار کیوں چنتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے اس عمل سے موضوع کو کیسے سنبھالا دیتا ہے اور تیسرے یہ کہ وہ قاری پر اس حربے سے کیا اثرات چھوڑنا چاہتا ہے۔ واحد متکلم کا کردار کہانی کی بنت اور اس کے اثرات کے حوالے سے خصوصی مطالعے کا مستحق ہے۔ اس کے ذریعے اردو کہانی کی تفہیم زیادہ بہتر طور پر کی جاسکتی ہے۔ اس مقالے میں ان سطحوں کو مد نظر رکھ کر ہی مقالہ نگار نے تحقیقی عمل کو آگے بڑھایا ہے۔ اردو افسانے کی تحقیق میں یہ زاویہ یقیناً ایک نیا در وا کرے گا۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اُردو ناول میں مثالیت پسندی: کرداروں کے خصوصی حوالے سے "

مقالہ نگار: محمد رفیق،2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد سعید، جی سی یونیورسٹی، لاہور

انگریزی زبان و ادب میں مثالیت پسندی کے لیے Idealism کی اصطلاح مستعمل ہے جو فلسفیانہ تعلیم میں استعمال ہوتی ہے۔ اردو زبان و ادب میں Idealism کے لیے مختلف اصطلا میں رائج ہیں ان میں "عینیت، آدرش، مثالی" وغیرہ زیادہ استعمال کی جاتی ہیں۔ لفظ Ideal کے معانی کسی چیز کا کامل نمونہ کے ہیں۔ یہ وہ نمونہ ہے جو معیاری اور مثالی ہونے کے باوجود مکمل طور پر واضح نہیں ہے۔ عینیت، آدرش پرستی، حقیقت کو مثال کے ذریعے سمجھنے یا پیش کرنے کا رویہ، مجاز پسندی، کامل بینی، کمال بینی، کمال نمائی یا مثالیت پسندی کہلاتا ہے۔ دوسری جانب فلسفے کی رو سے مثالیت پسندی سے مراد یہ ہے کہ مادہ حقیقی نہیں بلکہ خیال یا ذہن ہی حقیقی ہے اور مادہ تو اس کا عکس ہے یا یہ کہ مادی کائنات ذہن ہی کی پیداوار ہے اور ذہن سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مادے کا تعلق سائنس سے ہے جبکہ مثالیت کو عموماً مذہب سے جوڑا جاتا ہے۔ مثالیت پسندی کی بنیاد افلاطون نے ڈالی، افلاطون کے نظریات میں منطق عرفان اور عقلیت اور باطینت موجود ہیں۔ افلاطون نے سقراط، فیثا غورس، پارمی نائدیس اور ہریقلیس کے افکار و نظریات میں مطابقت پیدا کی اور پھر اپنا نظام فلسفہ مرتب کیا جسے Idealism یا مثالیت پسندی کہا جاتا ہے۔

مقالہ نگار محمد رفیق کا مقالہ بعنوان "پاکستانی اُردو ناول میں مثالیت پسندی: کرداروں کے خصوصی حوالے سے " پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب " مثالیت پسندی: بنیادی مباحث " ہے جس میں مثالیت

پسندی کے نظریے کی مختلف حوالوں سے وضاحت پیش کی گئی ہے۔ سقراط، افلاطون، ہیگل، کانٹ، دیکارت، میلان کنڈیرا، علی عباس جلالپوری اور مختلف فلسفیوں کی آرا کو مد نظر رکھتے ہوئے مثالیت پسندی کی تعریف متعین کی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف لغات، انسائیکلوپیڈیاز اور اصطلاحات کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ ناول میں مثالیت پسندی کی مغربی روایت کے حوالے سے مغربی ناول نگاروں کے مثالیت پسند کرداروں سے مدد لی گئی ہے۔ دوسرے باب کا موضوع قیام پاکستان سے پہلے لکھے گئے ایسے ناول ہیں جن میں مثالیت پسندی اور مثالی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں پر عذاب نازل ہونا شروع ہوا۔ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی علمی و عملی طور پر فلاح کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر اور پریم چند وغیرہ نے مختلف موضوعات پر جو ناول لکھے اور اُن میں مثالی کرداروں کو پیش کیا۔ اس باب میں ان کرداروں اور ناولوں پر بحث شامل کی گئی ہے جنھوں نے اپنے موضوعات کی حدود میں رہ کر ہندوستانی عوام کی بھرپور نمائندگی کی ہے، ایک مثالی انسان اور مثالی معاشرہ کے ضمن میں اپنا کردار عمدہ انداز میں نبھایا ہے۔ انہوں نے اس باب میں ان مثالی کرداروں کے انفرادی مقام و مرتبے کو متعین کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ تیسرے باب میں قیام پاکستان کے بعد مثالیت پسند ناول اور کرداروں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ جو ناول اور کردار مثالی انداز اپنائے ہوئے اُردو فکشن کا حصہ بنے اور انھوں نے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لانے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ یہ مختلف افکار سے تعلق رکھنے والے کردار ہیں جو خدا کی کائنات میں انسان کو اشرف المخلوقات ثابت کرنے کے لیے خود کو پیش کرتے ہیں۔ ان کرداروں میں "گوتم، حسین بن منصور، کنول کماری، نعیم، مسلم، ذاکر، پروفیسر، سروسانسی، کبیر وغیرہ جیسے کردار ہیں۔ چوتھا باب خواتین ناول نگاروں کے پیش کردہ مثالی کرداروں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس التزام کی وجہ انفرادی اور امتیازی فکر کو واضح کرنا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد خواتین کے نمائندہ ناولوں اور اُن کے مثالی کرداروں کو زیر بحث لایا ہے۔

خواتین نے بھی مرد ناول نگاروں کی طرح ہر موضوع کو اپنایا لیکن قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی وغیرہ کے ناولوں میں تصوف اور روح کے معاملات کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق اس باب کو اس لیے الگ کیا گیا ہے کہ مرد اور خواتین کے ناولوں میں موجود فکر اور شعور میں امتیاز کیا جاسکے کہ خواتین کے نزدیک مثالی انسان کی تعریف کیا ہے؟۔ پانچواں باب ناولوں کے متفرق مطالعہ اور تقابل پر محیط ہے۔ اس میں مرد و خواتین کے کرداروں کو مشترک صورت میں پیش کیا گیا ہے اور مختلف ناقدینِ ناول کی کرداروں کے

حوالے سے آرا کو سامنے رکھتے ہوئے کرداروں کی مثالیت پسندی کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالے میں مقالہ نگار نے واضح کیا ہے کہ مثالیت پسند کردار کس طرح انسان اور کائنات کا خدا سے رشتہ مضبوط کرنے میں تگ و دو کرتے ہیں۔ مقالے کے آخر میں ان کتب، رسائل و جرائد، لغات، انگریزی کتب اور ویب سائٹس کی فہرست ہے جو اس موضوع تحقیق کو سمیٹنے میں کار آمد ثابت ہوئیں۔

موضوع مقالہ: "اُردو میں سوانحی دستاویزی ناول نگاری "

مقالہ نگار: محمد زاہد عمر، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر فہمیدہ تبسم، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

انسان ازل سے تلاش ذات میں سرگرداں ہے۔ فلسفہ، مذہب، سائنس کے ساتھ ساتھ ادب بھی انسان کو آگہی کی منازل طے کرنے میں معاون و مددگار رہا ہے۔ شعرا اور ادبا زندگی کی حقیقت سے متعلق سوالات اور استفسار کے ذریعے ہمارے اجتماعی شعور کو بلند کرنے میں سرگرم ہیں۔ ہر عہد اپنے نئے تقاضوں، نئے رجحانات اور نئے سوالات کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے جس سے ادب میں تلاش ذات، شعور ذات اور اظہار ذات کے نئے نئے طریقے وضع ہوتے چلے جاتے ہیں اور نئی نئی اصناف جنم لیتی ہیں۔ اسی سفر کو مزید آگے بڑھانے کے لیے ادب میں ایک نئی صنف متعرف ہوئی جسے ناول کہتے ہیں۔ ناول کیونکہ پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوتا ہے اس لیے اسے دیگر اصناف پر برتری حاصل ہے۔ اردو ناول دراصل مغرب کی دین ہے۔ اردو ادب پر مغرب اور خاص طور پر انگریزی ادب کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ برصغیر پاک وہند کا بہت عرصے تک برطانیہ کی "نوآبادی" ہونا بھی ہے۔ اس دوران اُردو ادب براہ راست انگریزی ادب سے اثر قبول کرتا رہا ہے۔ مغربی ادب نے اردو ادب کو بہت سی اصناف سے بھی روشناس کروایا جن میں سے ایک ناول بھی ہے۔ مغربی ناول اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آج جس مقام پر کھڑا ہے اردو ناول کو وہاں تک پہنچنے میں ابھی بہت سے نشیب و فراز سے گزرنا ہوگا۔

مغرب میں جدید علوم اور عصری تقاضوں کی بدولت ادب بھی نئے رنگ وروپ اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے اور وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اہل مغرب کے ہاں جدید رجحانات کو قبول کرنے اور ادب میں آزمانے میں وہ پس و پیش نظر نہیں آتی جو ہمارے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ مشرقی ادب آج بھی مغربی ارتقائی بلندیوں سے بہت پیچھے ہیں، سوانحی ادب میں بھی قرۃ العین حیدر اور دیگر بڑے قلم کار اکثر اس بات کا گلہ کرتے رہے ہیں کہ ہمارے ہاں روایتی انداز سے ہٹ کر کوئی نئی چیز قابل قبول ہی نہیں ہے۔ لوگ

خود سوانحی ناول، فیملی ساگا، دستاویزیت، نان فکشن، فکشن، جیسی اصطلاحات سے واقف ہی نا تھے۔ جب کہ مغرب میں اس حوالے سے بہت کچھ لکھا جا رہا تھا۔ "کارِ جہاں دراز ہے" میں قراۃ العین حیدر اسی دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"مغرب میں کسی ادیب یا شاعر کا نام لے لیجیے۔ ہربرٹ ریڈ، ورجینا وولف، شان او کیسی، ولیم پلومر، سر اوزبرٹ سٹ ویل، ایلزبتھ بودن، اسپنڈر، اشر ووڈ، سارتر، سیمون دوبووا، (جوزف ہون، ہیکتھ پیرسن، ہربرٹ گورمین وغیرہ پروفیشنل سوانح نگاروں سے قطع نظر) اور ان کے لکھے ہوئے سوانحی ادب کا انبار آپ کو مل جائے گا"۔(۱۰)

اردو میں سوانحی ادب کا وہ انبار تو نہیں ملتا جو مغرب میں ہے پھر بھی آپ بیتیوں کے حوالے سے خاطر خواہ مواد موجود ہے مگر سوانحی ناول یا ناول میں دستاویزی رجحان کی بات کی جائے تو یہ معیار اور مقدار دونوں حوالوں سے مغرب سے بہت پیچھے ہے۔ دیگر وجوہات کے ساتھ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سوانحی ادب پر تنقید بہت کم ملتی ہے۔ اردو ناول میں نیچیرل ازم، سوانحی، دستاویزی، نان فکشن، فکشن اور دیگر جدید رجحانات کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ان پر معیاری تنقیدی کام بھی سامنے آئے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ تخلیقی لحاظ سے بھی خاندانی، سوانحی، تاریخی، معاشرتی، تہذیبی اور دستاویزی معلومات کو افسانوی اسلوب کے ذریعے ناول میں گوندھنا مشکل امر ہے۔ ایسے ناول پر فنی گرفت قائم رکھنا ہر ناول نگار کے بس کی بات نہیں۔ تخیل اور صداقت کی یکجائی کوئی آسان کام نہیں مگر جدید عصری تقاضوں کے پیش نظر اس طرف بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ناول حقیقی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس لیے یہ حقیقت سے جتنا قریب ہو گا اس کی اثر انگیزی اور دلچسپی میں اتنا ہی اضافہ ہو گا۔

سوانحی دستاویزی ناول دیگر اصناف کی نسبت زیادہ دلچسپ اور سود مند ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ سوانحی ناول، سوانح اور ناول کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ کسی سوانح کو جب افسانوی رنگ دے کر پیش کیا جائے تو اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور اس کے اثرات بھی دوررس ہوتے ہیں۔ سوانحی دستاویزی ناول میں تاریخیت اور دستاویزیت میں ملفوف زندگی ہمارے اجتماعی شعور کی بالیدگی کا باعث بنتی ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو میں سوانحی دستاویزی ناول نگاری اس مقام پر ہے جہاں اسے ہونا چاہیے؟ جب تاریخ، سوانح نگاری، ناول نگاری، ڈاکیومینٹری جیسی اصطلاحات موجود تھیں تو سوانحی دستاویزی ناول جیسے نئے تخلیقی تجربے اور اصطلاح

کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ سوانحی دستاویزی ناول کیا ہے؟ حقیقت اور تخیل کا امتزاج ناول میں فرد کے ساتھ ساتھ تہذیب کی عکاسی کس طرح سے کرتا ہے؟ دستاویز کس طرح افسانوی قالب میں ڈھل کر سوانحی دستاویزی ناول کا تانا بانا بنتی ہے؟ اس مقالے میں محمد زاہد عمر نے انہی سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کسی بھی ناول کو عظیم بنانے میں ناول نگار کے گہرے ذاتی تجربات و مشاہدات، خاص طور پر اس کی زندگی کے غیر معمولی تجربات بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ناول مکمل زندگی کا احاطہ کیے ہوتا ہے اور تقریباً ہر ناول ہی میں مصنف کی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور دستاویزی معلومات موجود ہوتی ہیں تاہم مقالہ نگار نے اس مقالے کے دائرہ کار کو اول و آخر سوانحی دستاویزی ناول تک ہی محدود رکھا ہے۔ ناول میں دستاویزی رجحان کے مختلف زاویے ہو سکتے ہیں جیسے کوئی خاص تاریخی واقعہ، کوئی مخصوص سائنسی، تاریخی علم، جنگ، کسی علاقے اور عہد کی مخصوص تہذیب و ثقافت، فلسفہ، کوئی بڑا حادثہ، قتل کیس ہسٹری، کسی فرد کی ذاتی یا خاندانی زندگی وغیرہ۔ اردو ناول میں دیگر دستاویزی زاویوں کی نسبت سوانحی دستاویزیت کا پہلو زیادہ اجاگر ہے۔ اس مقالے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ ناول یا رجحانات شامل نہیں کیے گئے جو تاریخی ناول کی ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ وہ ناول ضرور زیر بحث لائے گئے ہیں جو تاریخی شعور کے حامل ہیں۔ تاریخ اور تاریخیت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عہد جدید میں تاریخی ناول کی اہمیت کم ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ جدید تیکنیک جیسے "شعور کی رو" وغیرہ نے جہاں ناول نگاری کو نیا انداز دیا ہے وہاں اجتماعی تاریخی شعور کو بھی وسعت اور بلندی عطا کی ہے۔ تاریخی ناول میں جمالیات بھی اہم عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔ جمالیات کے حوالے سے قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (11)

ترجمہ: یعنی وہ باری تعالیٰ ہے جس نے جو چیز بنائی حسین بنائی۔

مقالہ نگار نے اردو میں سوانحی دستاویزی ناول نگاری کے تحقیقی و تنقیدی جائزے کے پہلے باب میں سوانحی دستاویزی ناول کی تعریف انگریزی، اردو لغات اور دائرہ ہائے معارف کی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوانحی دستاویزی ناول کے چند بنیادی مباحث کی روشنی میں اس ادبی اصطلاح کے مفاہیم کی وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں مغربی ناول کی روایت میں سوانحی اور دستاویزی رجحان کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو ناول نگاری کی روایت میں سوانحی دستاویزی رجحان کے آغاز کے

بارے میں بحث کی گئی ہے اور چند ابتدائی اہم اردو سوانحی دستاویزی ناولوں کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں ان سوانحی ناولوں کو زیر بحث لایا گیا ہے جن میں مصنف نے کسی حقیقی تاریخی شخصیت کے حالات زندگی کو قلم بند کیا ہے یا ناول میں کوئی حقیقی کردار پیش کیا ہے۔ چوتھے باب میں مکمل طور پر خود سوانحی دستاویزی ناول زیر بحث لائے گئے ہیں۔ یہ وہ ناول ہیں جن میں مصنف نے اپنے ذاتی اور خاندانی حالات و واقعات کو موضوع بنایا اور اپنی داستان حیات رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پانچویں باب میں دستاویزیت کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں ان چند اہم ناولوں پر بات کی گئی جن میں تاریخ، تہذیب و ثقافت، سیاست، فلسفہ، معاشرت اور اہم واقعات سے وابستہ دستاویزات کا استعمال اور ان کے حصول کے لیے مصنف کی شعوری کوشش پائی جاتی ہے۔ آخری باب میں مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے میں جن مباحث کو موضوع بنایا گیا ہے ان کی بنیاد پر نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور "

مقالہ نگار: شیبا عالم، 2012ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری، جی سی یونیورسٹی، لاہور

ادب اور تاریخ کے اپنے اپنے اہداف، ترجیحات اور سروکار ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کا فکری اور فنی زاویہ ہی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لیکن ادب میں کہانی کی اصناف زمانے اور زندگی سے اپنے لیے تجربہ حاصل کرتی ہیں اور اس حوالے سے کہانی کی اصناف میں کرداروں کے ذہنی عمل کا رشتہ وقت کے تسلسل سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ انسانی رویوں کی تشکیل میں نسلی، قومی، علاقائی اور اعتقادات کے اثرات کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس طرح کہانی کے مزاج کا تعین کرداروں کی ساخت و پرداخت سے بھی مشروط ہوتا ہے۔ یہ وہ زاویہ ہے جہاں سے ماضی اور گزرا ہوا وقت تاریخ کے دھاروں سے اپنے عصری حقائق میں آکر مل جاتا ہے۔ اس طرح تاریخ کا عمل کسی نہ کسی حیثیت میں انسانی زندگی کے عمل میں آکر شامل ہو جاتا ہے۔ تہذیب و تمدن، ثقافت، انسانی مزاج اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ اس تاریخ کا ادب اور افسانوی ادب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہر کہانی لکھنے والا زندگی کے مزاج کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنا کوئی نہ کوئی زاویہ نگاہ ضرور بناتا ہے۔ اس کے بغیر وہ زندگی اور کائنات کو دیکھ نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی بنیادی سوال پیدا کر سکتا ہے نہ ہی رویوں کو چیلنج کر سکتا ہے۔ ناول نگار اپنے عہد کی تاریخ سے بر اور

است متاثر ہوتا ہے۔ اپنے زمانے کی سیاست، سماجی رویوں، رسوم ورواج، انداز نظر اور فکری زاویوں کی تفہیم کرتے ہوئے ایسی بصیرت پیدا کرتا ہے جو زندگی، زمانے اور انسان کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

"اُردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور" میں مقالہ نگار شیبا عالم نے ناول نگاری کی روایت اور ہندوستان کی تاریخ کو ساتھ ساتھ رکھ کر تاریخی شعور پر بحث کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد سے شمس الرحمان فاروقی تک اردو ناول کی روایت متنوع رہی ہے اور تاریخ کے سبھی ادوار کسی نہ کسی پہلو سے اپنی اپنی تعبیریں حاصل کرتے رہے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے پہلی بار مسلم اشرافیہ کے تہذیبی، معاشی اور اخلاقی پہلوؤں کو موضوع بنایا جو دہلی کی ثقافت میں تھے۔ رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا اور محمد احسن فاروقی نے لکھنو کی تہذیب کے نشیب وفراز اور زندگی کے ڈوبتے اُبھرتے زمانوں کو دیکھا۔ عبد الحلیم شرر نے اسلامی تاریخ اور تاریخی کرداروں میں تخیل کی رنگ آمیزی سے کچھ ڈرامائی مگر مخصوص سوچ کے زاویوں کو کہانی میں ڈھال دیا۔ "فردوس بریں" نے آج کے دور میں نئی تعبیر پائی۔ فضل احمد کریم فضلی نے بنگال کی غربت کے تناظر میں قحط بنگال کے آشوب کو دستاویز کیا۔ پریم چند نے طبقاتی معاشرے کی بنیادوں کے ساتھ معاشرتی، مذہبی اور معاشی تفریق سے پیدا ہونے والے تعصبات کی نشاندہی کے ساتھ ترقی پسندانہ کوششوں سے متعلق تحریکوں کا ذکر بھی کیا۔ قرۃ العین حیدر کے افکار وتصورات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انہوں نے ایک طرف تو ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کے تناظر میں بدلتے ہوئے زمانے اور اقدار کو تہذیبی اور جغرافیائی تناظر میں دیکھا تو دوسری طرف مسلم اشرافیہ کے ذہنی اور سماجی رویوں کو ان کے تضادات اور ہندوستان کی تقسیم کے حوالے سے دیکھا۔ ان سب سطحوں میں ان کے موضوعات کا کینوس بہت وسیع ثابت ہوا۔ ان کے افکار میں فنونِ لطیفہ، تہذیب وثقافت، تاریخ وتمدن کی کونج واضح سنائی دیتی ہے۔

عزیز احمد کے ہاں جدید دور کے سنگم پر زوال پذیر تہذیب کی دستک سنائی دیتی ہے جو ہندوستان کی تاریخ کے تناظر میں اپنی معنویت دے رہی ہے۔ عبد اللہ حسین کے ہاں بھی ہندوستان کی تاریخ کو انگریزی سرکار کے زمانے سے لے کر پاکستان بننے اور بعد کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا بھرپور شعور دکھائی دیتا ہے۔ ان کے موضوعات بھی متنوع اور معروضی حقیقتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں کھوئی ہوئی تہذیب اور قدروں کا آشوب نمایاں ہے۔ وہ بھی تاریخ کے تناظر میں اپنے حال کو دیکھتے ہوئے کئی زمانوں اور تہذیبوں میں جھانکتے ضرور ہیں۔ شوکت صدیقی نے پاکستان کے قیام کے بعد کراچی کو کس طرح بدلتے دیکھا وہ آج کے پاکستان کو معنویت دے رہا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اسلامی تاریخ کے کرداروں کے ساتھ اپنے زمانے

اور وقت کے فلسفوں کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ خدیجہ مستور نے قیام پاکستان کے تناظر میں خاندانی بکھراؤ اور فکری تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ انیس ناگی نے پاکستان میں بدلتے سیاسی نظاموں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے آشوب کو موضوع بنایا ہے۔ نثار عزیز بٹ کے بھی ہندوستان کی تاریخ کے تناظر میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات اور اشغال سے تہذیبی موزیک بنانے کی کوشش کی ہے۔ الطاف فاطمہ نے بہاریوں کی بنگال نقل مکانی اور پاکستان کے قیام سے بنگلہ دیش تک کے سفر کو موضوع بنایا اور انسانی آشوب کی روح فرسا جھلکیاں پیش کیں ۔ مستنصر حسین تارڑ نے بھی پنجاب کے تناظر میں تاریخی شعور کو کئی نسلوں کے آپس کے تصادم میں دیکھنے کی کوشش کی اور تہذیبوں کے مرنے کا زمانہ دکھایا۔ شمس الرحمان فاروقی نے تاریخ کی راہداریوں میں سے گم گشتہ کرداروں کو تہذیبی اشکال میں دریافت کیا۔ مرزا اطہر بیگ نے اردو ناول نگاری میں تکنیک کے نئے تجربے سے روشناس کروایا۔ مقالہ نگار شیبا عالم لکھتی ہیں:

> "ناول کا کینوس تجربہ اور مزاج دنیا کی ہر زبان میں ایک جیسا رہا ہے اور عالمی ناول نے تاریخ کو براہ راست اپنے کرداروں میں دیکھنے اور تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کے تمام زمانے اپنی جڑوں سمیت دنیا کے ناولوں میں دیکھے جاسکتے ہیں"۔(12)

ناول کی تاریخ شروع ہی ایسے زمانوں سے ہوتی ہے جو تاریخ میں پُر آشوب اور انسانی اضطراب کے زمانے تھے اس لئے ناول نگار نے اپنا تجربہ براہ راست تاریخی شعور سے حاصل کیا۔ اس طرح طے ہو گیا کہ ناول نگار کے لئے تاریخی شعور کے ساتھ تہذیبی، تمدنی، ثقافتی اور سیاسی شعور بھی بے حد ضروری ہے۔ ناول کا جغرافیائی علاقہ ہوتا ہے، زمانہ ہوتا ہے، طبقوں کا پھیلاؤ ہوتا ہے، زندگی کا اجتماعی سروکار ہوتا ہے۔ یہ سب مل کر ناول کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ناول نگار کا تخلیقی برتاؤ سامنے آتا ہے اور یہ تاریخ کو کہانی میں ایسے رچاؤ سے ہم آہنگ کرتا ہے کہ ناول نگار کا زندگی کے متعلق زاویہ واضح ہو جاتا ہے اور اس کا تاریخی شعور پیچھے رہ جاتا ہے۔ پہلے باب میں اس طرح کے مباحث سے یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تخلیق کار کا مزاج اور تاریخ دان کے مزاج میں فرق ہوتا ہے اور ادب کا خمیر جن اصولوں سے اٹھایا جاتا ہے وہ خالصتا تخلیقی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اردو ناول کی پہچان ہے کہ اس کے لکھنے والوں کی اکثریت دیانتدارانہ سوچ کی حامل تھی اور تاریخ کو تہذیبی سطح پر دریافت کرنے کا تخلیقی سلیقہ اس روایت کی سب سے بڑی شناخت ہے۔ اس مقالے کے مطالعے

سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ادب کے ناول نگار کتنا گہرا تاریخی شعور رکھتے ہیں، انہوں نے اپنی عصری تاریخ کا کوئی بھی لمحہ یا واقعہ نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے فنی اور جمالیاتی قدروں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا اور اپنے لاتعداد قارئین اس طرح پیدا کئے کہ جو ان کے ہم نوا بن گئے۔ ناول کی یہ تاریخ دراصل قارئین کی ذہنی تربیت کا زمانہ بھی ہے۔ قاری بھی ناول نگار کے ساتھ یہ سیاسی، سماجی تہذیبی اور تاریخی شعور حاصل کرتا رہا ہے جس سے ایک عہد نے جلا پائی۔ قراۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، عزیز احمد، انتظار حسین، محمد احسن فاروقی اور مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناولوں میں تاریخ کو ایک تسلسل میں دیکھنے کے لئے سو سالوں سے بھی زیادہ کے عرصے کو اپنا تجربہ بنانے کی کوشش کی۔ یہ ظاہر ہے تکنیکی اعتبار سے ایک تخلیقی مزاج کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔ ان ناول نگاروں کے بعد انفرادی سطح پر موضوعات کو تاریخی شعور کے ساتھ تجربہ کرنے والے ناول نگاروں نے بھی اپنے اپنے موضوع کا تعین پورے تاریخی عمل کو سامنے رکھتے ہوئے کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایسے سوالات پیدا کئے ہیں جو مورخ کی نظر سے اوجھل رہ گئے تھے۔ یہ وہ سوال ہیں جو صرف ایک تخلیقی فن کار اور سماجی معاشی، سیاسی اور تہذیبی تاریخ کا شعور رکھنے والا ایک کہانی کار ہی پیدا کر سکتا ہے کیونکہ اس کا سروکار انسان اور انسانی معاشرے سے ہوتا ہے جس میں کئی اور علوم و فنون "تاریخ، جغرافیہ، نفسیات، ثقافت، فلسفہ، فنونِ لطیفہ اور علم بشریات" وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

اس مقالے میں مقالہ نگار نے موجودہ عہد کے تناظر میں بتایا کہ آج نائن الیون کے بعد کی عالمی صورت حال کا بہت چرچا ہے اور عالمی ادب اس سے بہت متاثر ہو رہا ہے۔ انگریزی لکھنے والے ناول نگاروں نے اس حوالے سے افغانستان، پاکستان اور عراق و مصر کی صورت حال سے پیدا ہونے والے نیو ورلڈ آرڈر کے حوالے سے ناول لکھنے کی روایت میں حصہ ڈالا ہے۔ جن میں محسن حامد، ندیم اسلم، محمد حنیف، حنیف قریشی، کاملہ شمسی، مشرف علی فاروقی کے ساتھ کچھ اور لکھنے والے بھی شامل ہو رہے ہیں۔ یہ بھی تاریخ اور تہذیب کو ناولوں میں سمونے کے دعوے دار ہیں۔ اس رجحان کا اثر ضرور اردو کے نئے لکھنے والوں پر پڑے گا اور تاریخ 1857ء یا 1947ء سے اپنا رخ بدل کر پاکستان میں نائین الیون کے بعد کی تاریخ پر مرکوز ہو گی، کیونکہ دہشت گردی کی جنگ اور طالبان کی آمد کے بعد پاکستان کی تاریخ تبدیل ہو رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم نائن الیون کی تاریخ کو محض حال کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں گے یا اسے اس خطے کی ہزار سال کی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں گے۔

موضوع مقالہ: "اُردو ناول میں سیاسی مباحث "

مقالہ نگار: محمد ثقلین،2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر اختر علی، جی سی یونیورسٹی، لاہور

آج کی ہنگامہ خیز دنیا میں ادب کسی گوشہ تنہائی میں دبک کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اہم معاشرتی مسائل سے پہلو تہی کسی صورت میں ممکن نہیں ہے، ایک ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ سیاسی و سماجی شعور سے لبالب ہو۔ ادب اور سیاست کے تعلق کے بارے ڈاکٹر رشید امجد رقمطراز ہیں:

> "اگر ادب، ادب ہے تو اس میں ہمارا عہد بھی ہے اور اس کے تمام تقاضے جن میں سیاست بھی شامل ہے موجود ہونگے۔ ادب کسی عہد کی وہ دستاویز ہے جس میں پورے کا پورا دور سانس لیتا نظر آتا ہے"۔(13)

جدید عہد میں حکمران طبقے نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ ادیب مخصوص منظر نامے کا ہی ترجمان ہو، وہ افراد اور معاشرے کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سے پہلو تہی اختیار کیے رکھے لیکن بیسویں صدی کا آغاز متعین ادبی معیارات میں شکست وریخت کا سبب بنا۔ مزدور اور کسان استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف برسرپیکار نظر آنے لگے۔ متوسط طبقے نے بھی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے صدا بلند کی۔ یوں مزاحمتی ادب نے ادیب کو ابتذال اور بے سمتی کی وادیوں سے نکال کر عصری زندگی کا ترجمان بنادیا ہے۔ سارتر نے ایک پاکستانی ادیب سے ملنا محض اس لیے گوارا نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ہنگری کی سیاست پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں بھی ایک باشعور آدمی اپنے آپ کو سیاست سے الگ نہیں رکھ سکتا، سیاست سماجی زندگی کا محور خاص ہے اور سماج کے بالائی ڈھانچے کا اہم جزو ہے۔ ناول زندگی کے تمام اجزا کو یکجا کر کے دیکھتا ہے، ناول کو ایسی سڑک قرار دیا گیا ہے جس پر چل کر آدمی اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔

ناول اور سیاست کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ترقی پسند نظریہ ادب بھی یہی بتاتا ہے کہ عالمی سیاست کی بساط جدید نو آبادیاتی جبر اور مقامی استحصالی قوتوں کی چیرہ دستیوں کے پس منظر میں سیاست ہی کار فرما ہوتی ہے۔ کامیو، سارتر ،فاکنز، قراۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین ایسے مناظر کو ہمارے سامنے لاتے ہیں جو بیسویں صدی کی غالب سیاسی دُنیا کی پیداوار ہیں۔ مذکورہ مقالے کا موضوع تو" اردو ناول میں سیاسی مباحث "ہے مگر مقالہ نگار نے نمائندہ ناول نگاروں ہی کو زیر بحث لایا ہے کیونکہ اُن کے یہاں سیاسی مباحث زیادہ واضح صورت میں ملتے ہیں۔ اس کے باب اوّل میں ادب اور سیاست کے تعلق پر معنی خیز بحث کی گئی ہے۔ باب دوم میں برصغیر کے

سیاسی منظر نامے اور اس کے اُردو ادب پر اثرات کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے اُردو ادب پر اثرات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ باب سوم میں ڈپٹی نذیر احمد کے "ابن الوقت" کو انگریزوں کے مسلمان کلچر پر اثرات کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے۔ کرشن چندر اور پریم چند کے ناولوں میں "کولونیل" عہد سے نبرد آزما غریب کسان کی جدوجہد اور ریاستی جبر کی تصویر دکھائی گئی ہے۔ جبکہ سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات میں برطانوی عہد میں ہندوستانی طلبا کی سیاست میں دلچسپی کا احوال پیش کرنے کی کوشش کی گی۔

مقالے کے تجزیاتی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ باب چہارم اس مقالے کا اہم باب ہے۔ اس باب میں اس خطے کے اہم تاریخی و سیاسی محرکات "عالمی جنگیں، تقسیم ہند، فسادات، ملکی سیاست کا بھیانک چہرہ، سقوط ڈھاکہ اور کولونیل اثرات جنھوں نے ناول کی بنت میں اہم کردار ادا کیا کو سمیٹنے والے اہم ناول نگاروں قراۃالعین حیدر، عبد اللہ حسین، انتظار حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، مستنصر حسین تارڑ، انیس ناگی، الطاف فاطمہ، مرزا اطہر بیگ اور چند دیگر ناول نگاروں کے ناولوں میں پائی جانے والی سیاسی صورتحال پر بحث شامل ہے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اُردو افسانے میں نظریاتی مباحث "

مقالہ نگار: سنبل نسیم، 2014ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو افسانے کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ ایک صدی برصغیر پاک وہند کی تاریخ، ادبی اور سماجی زندگی میں اہمیت کی حامل ہے جس کا اظہار ادب کی ہر صنف میں ہوا ہے کیونکہ کوئی بھی ادبی تحریر اپنے معاشرے سے کٹ کر معرض وجود میں نہیں آسکتی۔ اُردو افسانے کی یہ صدی بھی ان تمام مسائل، مشکلات اور مباحث کی امین ہے جو مختلف سماجی حوالوں سے اس معاشرے کی شناخت رہے ہیں۔ انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول برصغیر پاک وہند میں کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانے میں آزادی اور انسانی حقوق کی جنگ لڑی گئی اور دنیا بھر میں اس امر کا احساس پیدا ہوا کہ ہر اندہء درگاہ طبقوں کو بھی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مقتدر طبقوں کو۔ اس احساس نے کئی ادبی تحریکوں کو جنم دیا جن سے اُردو افسانہ نگاروں نے بھی اپنی یگانگت کا بھرپور ثبوت دیا اور اُن مباحث اور نظریات کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا جو انسانی مقدر کی بازیافت، آزادی رائے، انسانی وقار کا تحفظ اور ایک

فضا میں زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری تھے۔ راشد الخیری، پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے احمد جاوید اور طاہرہ اقبال تک ان نظریاتی مباحث کی گونج اسلوب پر حاوی اور کہیں افسانے کے تار و پود میں گوندھی ہوئی ہے، مگر ہر افسانہ نگار نے معاشرتی، سماجی، سیاسی اور وجودی حوالوں سے اُن تمام مباحث کو اپنی تحریروں کی زینت بنایا ہے جو اُن کے مزاج اور فکری رویے سے ہم آہنگ تھے۔ کیونکہ مصنف اور اُس کی تحریر ایک ہی سکے کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں اور اُردو افسانے کا عمیق مطالعہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اُردو افسانے کی اس سو سال سے زیادہ کی روایت میں تمام نظریاتی مباحث اپنی تمام تر شدت کے ساتھ اپنی موجودگی کی خبر دیتے ہیں جو برصغیر کی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے ذہنی مسافت کا شاخسانہ ہے۔

مقالہ نگار نے موضوع کے مطابق پاکستانی افسانہ نگار خواتین و حضرات کو شامل تحقیق کیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کے افسانہ نگاروں کے نظریاتی مباحث پس منظر کے لیے ضروری تھے، اس لیے انہیں بھی شامل تحقیق کی گیا۔ قراۃ العین حیدر قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۱ء تک پاکستان میں مقیم رہیں۔ اُن کے اُس دور کے افسانوں کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔ ۱۹۰۰ء سے ۲۰۱۶ء کے دوران شائع ہونے والے افسانوی مجموعے تحقیق کا اولین ماخذ ہیں۔ رسائل میں سے جو افسانے شامل تھے انہیں ثانوی ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مقالے کی ابواب بندی موضوعاتی اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس مقالے کا پہلا باب "اُردو افسانے میں نظریاتی مباحث" پر مشتمل ہے۔ اس باب میں نظریہ کیا ہے؟ نظریے کی فلسفیانہ بحث اور ادب پر نظریات کا اطلاق کیونکر ممکن ہوتا ہے؟ افسانے کی روایت میں راشد الخیری اور ان کے بعد آنے والے افسانہ نگاروں کے ہاں مختلف نظریات کون کون سے تھے۔ ایک دور میں ایک ہی نظریات کے حامل افسانہ نگار موجود تھے یا مختلف نظریات رکھنے والے افسانے منظر عام پر آ رہے تھے؟ اس باب کے اہم موضوعات ہیں۔ پریم چند اور اُن کے مقلدین کے ہاں جن نظریاتی مباحث کا ادراک تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم میں ترقی پسند نظریہ ادب اور اُردو افسانے پر اس کے اثرات کو واضح کرتے ہوئے مذہب اور مذہبی نظریات کی نئی تشکیل کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ ترقی پسند نظریات کے حامل منتخب نمائندہ افسانہ نگاروں کے افسانوں میں سے مثالیں دے کر اس دور کے مباحث کو واضح کیا گیا ہے۔

مقالہ نگار نے باب سوم میں حلقہ ارباب ذوق ایک ادبی تنظیم یا تحریک کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں مختلف آرا رکھنے والے گروہوں کا حوالہ دے کر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تنظیم ترقی پسند تحریک کا ردعمل تھی یا توسیع؟ اور اس تنظیم نے کس قسم کے نظریاتی

مباحث کو افسانے کا حصہ بنایا۔ اس تنظیم کے زیر اثر پروان چڑھنے والے نظریات کے حامل نمائندہ افسانہ نگاروں کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔ باب چہارم پاکستانی افسانے میں نظریاتی مباحث کے حوالے سے اہم ہے۔ انہوں نے اسلامی ادب کی بحث، پاکستانی ادب کی بحث، پاکستان میں تہذیب و ثقافت کے حوالے سے مسائل، پاکستانیت اور اپنے تشخص سے جڑے نظریات اور مباحث کو تفصیل سے واضح کیا ہے۔ ان مباحث کو پاکستان میں موجود اُردو افسانہ نگاروں کی توانا روایت کی مدد سے واضح کیا ہے۔ باب پنجم میں علامتی افسانہ اور اس سے جڑے نظریات و مباحث کو موضوع بناتے ہوئے، علامت کیا ہے؟ علامت نگاروں کی روایت، ایسی کون سے وجوہات ہیں کہ افسانہ نگار علامت کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں، جیسے نظریات اور مباحث کو واضح کیا گیا ہے۔ باب ششم میں معاصر افسانے کے نظری مباحث پر بات کی گئی ہے۔ معاصر افسانے کے نمایاں نظریات ،سماجی، نفسیاتی، تجریدی، داخلی، جدت پسندی کے نظریات، افسانے میں کہانی کی واپسی کے حوالے سے نظریات، صارفیت، توسیع پسندی، مابعد نوآبادیاتی نظریات اور گلوبلائزیشن کے اُردو افسانے پر اثرات کی وضاحت کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے "حاصل مطالعہ" میں نتائج کو بیان کیا جس کے مطابق موجودہ دور تک نئے نظریاتی مباحث نے اُردو افسانہ نگاری کے میدان میں قدم جمانا شروع کر دیے ہیں۔ خارج اور داخل، ظاہر اور باطن کے درمیان مسلسل جنگ جاری و ساری ہے اور اُردو افسانہ ہر نئے نظریے کو اپنے اندر سمونے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

موضوع مقالہ: "پاکستانی اُردو ناول میں تصورِ انسان "

مقالہ نگار: سفیر حیدر، 2013ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شفیق عجمی، جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو ناول کی روایت میں تصورِ انسان کی باقاعدہ صورت گری کا اولین سراغ ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں ملتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے مختلف ناولوں کے مرکزی کردار جہاں اپنے عہد کے انسانوں کے زندہ مرقعے ہیں وہاں مخصوص رجحانات کے عکاس بھی ہیں۔ وہ ہمہ تن خیر یا ہمہ تن شر کے نمائندے ہیں اور لچک دار رویوں کے بجائے یک رخے اور سپاٹ ہیں۔ "ابن الوقت" غالب قوم اور تہذیب سے پرستش میں اس حد تک پہنچا ہوا ہے کہ ہر ایک کی نظر میں اسے خدا کرنا چاہتا ہے۔ "توبتہ النصوح" میں نصوح بھی متعین شخصیت کا حامل ہے۔ حالتِ رویا میں جو لرزہ خیز روحانی واردت کے بعد اپنے گھرانے کی غفلت آمیز زندگی سدھارنے کی ٹھان لیتا ہے اور ڈپٹی نذیر احمد کا سخت گیر آدرشی انسان بن کر سامنے آتا ہے اسی طرح "مراۃ العروس" کی اصغری اور

اکبری بھی اپنی اپنی طرز کے انسانوں کے نمائندہ یک سطحی کردار ہیں۔ رتن ناتھ سرشار کے یہاں خصوصاً "فسانہ آزاد" میں انسانی کرداروں کے مختلف طبقات اور ان کے نفسیاتی نقوش حقیقی زندہ انسانوں کی متحرک تصویروں کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں۔ آزاد کا کردار درحقیقت آزاد انسان کا نمائندہ ہے۔ وہ مذہب سے بیگانہ صفت لوگوں کا نمائندہ ہے اور اکثر اوقات اپنی علمی بساط اور جدت پسندی کی بیساکھیوں کے سہارے طے شدہ روایتی اور تصوراتی علم کو بیک قلم مسترد کر دیتا ہے۔ وہ خود کو عہدِ جدید کا انسان سمجھتا ہے اور دقیانوسیت سے آزاد ہونے کا دعوے دار بھی ہے۔ آزاد کا کردار "خوجی" لکھنو کے تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی زوال کے منظر نامے میں فرار اور خود فراموشی کی متلاشی نیم خوابیدہ زندگی کا مظہر ہے۔ یہ کبوتر نما انسان ہر عہدِ زوال میں بکثرت پائے جاتے ہیں جو اپنی آنکھیں بند کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو نگل جانے والی بلی صفحہ ہستی سے معدوم ہو گئی ہے۔

مقالہ نگار سفیر حیدر نے " پاکستانی اُردو ناول میں تصورِ انسان " میں عبدالحلیم شرر کے نمائندہ ناول "فردوس بریں" کے کردار حسین پر بھی بحث کی ہے۔اس بحث میں وہ بتاتے ہیں کہ اس ناول کے کردار شرر کے باقی ناولوں کے کرداروں کے برعکس نسبتاً بہتر طور پر گوشت پوست کے زندہ انسان نظر آتے ہیں نہ کہ قطعی طور پر تخیل کی پیداوار۔ حسین کا کردار بھی خیر وشر کا ایسا مجسمہ بن جاتا ہے جس سے وہ محض تخیلی استعارے کی بجائے اپنے ہر عمل کا انسانی جواز داخلی یا خارجی طور پر مہیا کر دیتا ہے۔ حسین سمیت فردوس بریں کے دیگر اہم کردار بھی انسانی خطاؤں کی بھول بھلیوں میں گم ہیں۔ حسین کے کردار کے متعلق مقالہ نگار کہتے ہیں:

> " وہ اس نفسیاتی حقیقت کی مثال ہے کہ اندھی محبت انسانی شخصیت کو اس حد تک مسمار کر سکتی ہے کہ ایک نیک مزاج تعلیم یافتہ شخص اس طرح کی مذموم حرکات کا مرتکب ہوتا ہے کہ اس کے جملہ انسانی خصائص بالکل معدوم ہونے لگتے ہیں اور وہ خونخوار بہیمیت کا سراپا بن جاتا ہے"۔(14)

فردوس بریں میں " شیخ علی وجودی" کا کردار تاریخ کے ہر دور میں ان ساحر نما پر اثر افراد کا نمائندہ ہے جو ایسی مقناطیسی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں کہ اپنے عہد میں اپنی شخصیت کی تاثیر کے یرغمالی لوگوں کی آنکھوں میں ایسی دھول جھونکتے ہیں کہ وہ دھول عقیدت کے موتی بن کر چمکنے لگتی ہے۔ پریم چند نے بھی استحصال زدہ انسانوں کے سماج کی تصویر کشی کی ہے۔ "بازار حسن" کی سمن معاشرتی جکڑ بندی کا شکار لاچار

کردار ہے جو بالآخر ایک ایسے باغی انسان کا روپ دھار لیتی ہے جس کے ارادے اور حوصلے ماحول سے متصادم ہیں۔ وہ بازار حسن پہنچ کر بھی طوائف نہیں اور اس میراث کو نہیں اپناتی جو اس بدنصیب طبقے کی قسمت ہے۔ وہ پریم چند کے ناولوں کا ایسا نمائندہ انسان ہے جو ظلم کے سامنے جھکتا نہیں ہے۔

مرزا ہادی رسوا نے اپنے شاہکار ناول "امراؤ جان ادا" کے ذریعے انسان کو معاشرے کے زوال یافتہ ماحول کے اندر تطابق اور تصادم کے مراحل میں دکھایا ہے اور انسان اور تقدیر کے باہمی تعلق کی پرتیں بھی کھولی ہیں۔ "امیرن" جو امراؤ اور پھر امراؤ جان ادا بنی اور خود کو زندانئ تقدیر قرار دیتی ہے۔ امراؤ جان ادا کے کردار انسانی فطرت کے بہتر نمائندے ہیں بہ نسبت رسوا کے دوسرے ناولوں کے مرکزی کردار کے۔ مثلاً شریف زادہ کا مرکزی کردار مرزا عابد حسین اگرچہ رسوا کا آئیڈیل ہے لیکن یکسانیت کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا ہے اور انسانی فطرت کی بوقلمونی سے یکسر عاری نظر آتا ہے۔

مقالہ نگار سفیر حیدر عزیز احمد کے ناولوں میں بھی "تصور انسان" پر بحث کرتے ہیں۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" جسے اجتماعی ناول بھی قرار دیا گیا ہے، اس میں فرد اور معاشرے کے تعلق میں فرد کی انجذابی صلاحیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسے عہد کی معاشرت کے اثرات کے انجذاب کی علامت "نور جہاں" کا کردار ہے جس کا المیہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی"، "جانگلوس" اور "چار دیواری" اُردو ادب میں حقیقت نگاری کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اُردو ادب کے اس بالزاک کا انسان بے نقاب معاشرتی حقیقتوں کو چہرے پر سجائے جلوہ فگن ہے۔ یہ انسان کوئی خوابوں کا شہزادہ نہیں بلکہ حقیقت کی ننگی سنگلاخ چٹانوں سے سر پٹختا، مشقت زدہ، محکوم اور مجبور انسان ہے۔ "خدا کی بستی" ظلم کی چکی میں پستے ہوئے انسان کی سسکی ہے۔ اس ناول کے کرداروں میں میسحیت کم اور اذیت زیادہ ہے۔ یہاں انسانوں کو دو واضح طبقات میں تقسیم کر کے دکھایا گیا ہے۔ استحصال کرنے والا طبقہ اور استحصال زدہ طبقہ۔ جابر اور مجبور، ظالم اور مظلوم بھیڑیے اور بھیڑیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنی بنیادی اپروچ "انسان پرستی" قرار دی تھی۔ "آگ کا دریا" کے اہم کردار "گوتم، نیلمبر، ابوالمنصور کمال الدین، چمپا" وجود کے مقصد کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ قراۃ العین حیدر نے خود اس تلاش کو انسان کی اس کوشش سے تعبیر کیا ہے کہ وہ بطور فرد اور معاشرے کے ایک حصے کی شکل میں صدیوں سے کرتا چلا آرہا ہے اور اس عمل میں اپنی تکلیفوں، امیدوں اور خواہشوں کے درمیان سے اپنے آپ کو اور اپنے نام کو ابھارتا آیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا انسان داخلی تنہائی کا شکار نظر آتا ہے، کہیں تو وہ شعوری طور

پر اپنی انفرادی حیثیت میں شناخت کا خواہاں ہے اور کہیں اس کے ذاتی تجربات میں اس کے لیے تعینِ ذات کا فریضہ سر انجام دیا ہے۔ انسان کی یہ لاعلاج ازلی تنہائی مرکزی کرداروں کو مسلسل اضطراب کے نرغے میں لیے ہوئے ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے ناولوں کا مرکزی انسان سیماب صفت ہے اور زندگی کے طے شدہ رستوں سے گریز اس کی سرشت میں شامل ہے۔ مادی سطح پر زندگی گزارنا اس کے لیے کار اذیت ہے۔ روحانی ارتفاع اور روشنی کی تلاش کے مسافر ان کرداروں کے لیے دنیاوی حرص و ہوس، شہرت، کشش اور بیرونی شور و غل یکسر بے معنی ہے۔ بلکہ وہ ہر لحہ ہمہ تن گوش ہو کر داخلی وجود کی صداؤں پر کان دھرے رکھتے ہیں اور ایک ذرا سی آہٹ نما سرگوشی پر ایک لمحے میں بغیر کسی تامل کے لبیک لبیک پکارتے ہوئے بھاگ اٹھتے ہیں۔ ان کرداروں کے اعمال اور پھر ان کے انجام ان کی اسی اضطراری سرشت میں پنہاں ہیں۔ جب اپنی دُنیا میں ڈوبے، اپنی لگن کے اسیر، اپنے عشق میں بچے، ماورا سے بھی ماورا جانے کے آرزو مندانِ شوق، فرید الدین عطار کے یہ پرندے اپنی ہستی کے سراغ میں "بصد سامانِ رسوائی" سر بازار نکلتے ہیں تو ان کے پاس علائق دُنیا سے دستبرداری کے علاوہ کوئی سہولت کا راستہ میسر بھی نہیں ہوتا، ان کے لیے دُنیاوی زندگی کا ہر مرحلہ راستے کا پتھر یا نظر انداز کر دیا جانے والا عارضی پڑاؤ ہے، وہ کسی دائمی منزل کے تمنائی، اسی پر نظریں چپکائے رکھتے ہیں اور وہ منزلیں منتخب کرتے ہیں کہ جن کے لیے ظاہری رسوم و قیود کو توڑنا لازمی ٹھہرتا ہے۔ سفیر حیدر کا مقالہ "تصور انسان" کے حوالے سے اہم اضافہ ہے۔

غیر افسانوی نثر:

اُردو کے نثری ادب میں افسانوی ادب کے علاوہ غیر افسانوی ادب کی صنف بھی اہمیت کی حامل ہے۔ غیر افسانوی ادب میں انشائیہ، تذکرہ، تنقید، تحقیق، مضمون، مکتوب نگاری، سوانح، آپ بیتی، سفر نامہ، سیرت النبی ﷺ، شخصیت نگاری، خاکہ نگاری، وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں ان غیر افسانوی اصناف کا تعارف پیش ہے۔

انشائیہ:

انشائیہ عربی زبان کا لفظ ہے جو لفظ "انشا" سے بنا ہے جس کے معنی "کسی بات سے بات پیدا کرنے" یا "بات پیدا کرنے" کے ہیں۔ انشائیہ نگاری بظاہر ہلکی پھلکی صنف ادب ہے لیکن اس میں باتوں باتوں میں بڑی

گہری اور پتے کی بات کہہ دی جاتی ہے۔ انگریزی زبان میں انشائیہ "پرسنل ایسے" یا "لائٹ ایسے" کو کہا جاتا ہے۔ انشائیہ کے بارے میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

> "لفظ انشائیہ انگریزی کے لائٹ ایسے کا متبادل ہے اور ایسے کا لغوی مفہوم ہے " کوشش۔ رابرٹ لنڈ نے اس کوشش کی جہت کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ انسانی فطرت کے کسی نیم تاریک گوشے کو منور کرنے کی ایک سعی ہے، بنیادی طور پر اس کا مقصد روشنی کی تحصیل ہے لیکن یہ روشنی کسی فلاسفر کا پھیلا ہوا نور نہیں بلکہ ایک خوش باش انسان کا اظہارِ ذات ہے"۔(15)

انشائیہ میں کیف و مستی اور ظرافت پائی جاتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے ذاتی خیالات، مشاہدات اور تجربات کو ہنسی مذاق کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے زور قلم سے معمولی سے معمولی بات کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے اور اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایسی زبان کا استعمال کرتا جو قاری کو اپنی طرف مائل کرے۔ انشائیہ میں کسی موضوع کے تعلق سے جو خیالات جس انداز اور جس ترتیب سے ذہن میں آتے ہیں انشائیہ نگار انھیں تحریر کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر اظہار خیال کر سکتا ہے چاہے وہ تنکے سے لے کر ہمالیہ تک ہو مگر عام مضمون نگار اُس وقت تک قلم نہیں اُٹھاتا جب تک اس کے پاس اُس موضوع کے تعلق سے معلومات نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک موضوعاتی مضمون نگار اگر "اُلو" پر مضمون لکھے گا تو "اُلو" کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لینے کے بعد لکھے گا۔ جیسے یہ پرندہ کس نسل سے ہے، اس کی عادات کیا ہیں، اس کی غذا او غیرہ کیا ہے۔ مگر ایک انشائیہ نگار جب اسی موضوع "اُلو" پر قلم اُٹھائے گا تو بتائے گا کہ اُلو کو عام طور پر منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اسے حماقت اور بیوقوفی کی علامت قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو دانائی اور دور اندیشی کی تفسیر ہے۔ اُلو کی زندگی ایک درویش کی زندگی کے مماثل ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ "ہوہوں" کی آواز کرتا ہے اور یاد الٰہی میں مشغول رہتا ہے۔

انشائیہ نگار مختلف موضوعات پر عام روایات سے ہٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور کسی بھی خشک موضوع کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ اُردو ادب میں "سجاد حیدر یلدرم، رشید احمد صدیقی محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شر، نیاز فتح پوری، میاں بشیر احمد، مہدی افادی، مشتاق احمد صدیقی اور مجتبٰی حسین" کے انشائیے مشہور ہوئے لیکن ان میں بیشتر ادیب ایسے ہیں جن کے زمانے میں لفظ انشائیہ مقبول نہ تھا۔ بلکہ ان کے لکھے

بہت سے مضامین میں انشائیے کی خصوصیات ہونے کے سبب انہیں انشائیہ کے زمرے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اُردو کے جدید دور میں ڈاکٹر وزیر آغا کو انشائیہ میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

مضمون نویسی:

کسی موضوع کو ذہن میں رکھ کر اس کے متعلق اپنے خیالات کو خوبصورت اور آسان الفاظ میں اس طرح بیان کرنا کہ پڑھنے والا اس کو اچھی طرح سمجھ جائے "مضمون نویسی" کہلاتا ہے۔ مضمون کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی پھر بھی مضمون لکھنا ایک فن کہلاتا ہے۔ ایک اچھا مضمون نگار بننے کے لیے ذخیرہ معلومات اور وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ لکھنے کی مشق بھی ضروری ہے۔ ہم کسی بھی مضمون کے لیے مختلف لائبریریوں، خبارات، رسالوں اور انٹرنیٹ کی مدد سے مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مضمون نویسی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے چند خاص خاص باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ جیسے جس موضوع پر مضمون لکھنا ہے اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لینی چاہیے اور مضمون لکھنے سے پہلے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا ایک خاکہ ذہن میں بنالینا چاہیے۔ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے آسان اور پُر اثر زبان کا استعمال کیا جائے۔ اگر تحریر میں اُلجھاؤ ہے یا پھر مضمون کو بڑھانے کے لیے غیر ضروری باتیں شامل کر دی گئیں ہیں تو مضمون پر اثر نہیں رہے گا۔ ضرورت کے مطابق مضمون کو پیراگرافوں میں بانٹنا چاہیے۔ پورا مضمون ایک ہی پیراگراف میں لکھ دینا ٹھیک نہیں۔ مضمون مکمل ہونے کے بعد اسے ایک بار ضرور دہرالینا چاہیے۔ مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں" ابتدائی، درمیانی، اختتامی۔

مضمون کے ابتدائی حصے میں مضمون کے مقاصد پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ مضمون کا بہت اہم حصہ ہوتا ہے اس لیے کوئی بھی مضمون ایسے الفاظ سے شروع کرنا چاہئے کہ پڑھنے والا فوراًاُس کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس میں دلچسپی لینے لگے۔ اگر شروع میں ہی مضمون دلچسپ نہ ہوگا تو کوئی بھی قاری اسے پڑھنے میں دلچسپی نہیں لے گا۔ مضمون کے درمیانی حصہ میں موضوع کے متعلق تفصیل سے ذکر کرنا چاہیئے۔ چونکہ یہ حصہ طویل ہوتا ہے اس لیے اس کو کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھنا چاہیے۔ اپنی تحریر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ مضمون پڑھنے والے پر اثر کرے۔ مضمون کا اختتامی حصّہ بہت اہم ہوتا ہے۔ مضمون نگار نے ابتدائی اور درمیانی حصہ میں جو بات کہی ہے اِس حصے میں اُس بات کا نچوڑ ایسے الفاظ میں لکھنا چاہیے کہ

پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مضمون کئی طرح کے ہوتے ہیں جیسے ہلکے پھلکے مضامین، سنجیدہ مضامین اور موضوعاتی مضامین۔ ہلکے پھلکے مضامین کے لیے انشائیہ کا لفظ موزوں سمجھا جاتا ہے اور باقی دونوں قسموں کے لیے مضمون ہی کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اُردو میں مضمون نگاری کے بانی سر سید احمد خاں ہیں، انہوں نے ہی اپنے رفقا کے ساتھ مل کر مضمون نگاری کی داغ بیل ڈالی۔

مکتوب نگاری / خطوط نویسی:

مکتوب نگاری یا خطوط نویسی ایک دوسرے سے دور رہنے والے لوگوں کے درمیان تحریری گفتگو کا نام ہے۔ خط لکھنے والے کو "کاتب" اور جو عبارت خط میں لکھی جاتی ہے اسے "مکتوب" کہتے ہیں، جسے خط لکھا گیا ہے اُسے "مکتوب الیہ" کہا جاتا ہے ۔ چین، عرب، یونان اور ہندوستان کی قدیم تاریخ میں خطوط لکھنے کے رواج کا پتا چلتا ہے۔ عربوں میں اسلام کی آمد سے پہلے بھی مکتوب نگاری کا رواج تھا لیکن اُس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ اسلام کی آمد کے بعد باضابطہ خطوط لکھے جانے لگے۔ خود پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خطوط لکھے جو آج بھی محفوظ ہیں۔ اسی طرح مختلف صوفیا کرام نے اپنی خانقاہوں سے فارسی زبان میں بے شمار خطوط لکھے۔ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک ابوالفضل کے لکھے خطوط اپنے زمانے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے مگر یہ آدھی ملاقات پر لطف، پر اثر، بے تکلف اور کامیاب جب ہی ہو سکتی ہے جب خط میں آسان و موزوں الفاظ مختصر مضمون اور دلچسپ عبارت کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ اسی طرح القاب و آداب مختصر ہوں۔ رسمی اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا جائے۔ بزرگوں کے لیے اُن کی بزرگی کے شایانِ شان الفاظ اختیار کیے جائیں۔ جیسے محترمی بکرمی یا قبلہ وغیرہ۔ دوستوں کے لیے پیارے دوست، عزیز یا نام وغیرہ مخاطب ہوں اور اُن کے خطوط میں بے تکلفی کی شان نظر آئے۔ چھوٹوں کے لیے عزیزی یا نام وغیرہ لکھا جائے اور تحریر سے شفقت اور محبت کا اظہار ہو۔ خطوط کی عام طور پر تین قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے نجی یا ذاتی خطوط، کاروباری خطوط اور سرکاری خطوط وغیرہ۔ اُردو میں خط لکھنے کے دلچسپ اور نئے انداز کے موجد مرزا اسد اللہ خاں غالب ہیں۔ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا اور خط لکھنے کا ایسا انداز دیا گویا کاتب اور مکتوب الیہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔

سوانح عمری:

کسی شخصیت کی زندگی کے حالات اور واقعات کو یکجا کر کے لکھنا سوانح حیات یا سوانح عمری کہلاتا ہے

۔

دوسرے لفظوں میں کسی انسان کی زندگی کے تفصیلی بیان کو سوانح حیات کہتے ہیں۔ جس شخصیت کی سوانح حیات لکھی جائے وہ سماجی، سیاسی، مذہبی، روحانی یا پھر ادبی بھی ہو سکتی ہے۔ سوانح عمری میں انسان کے بچپن، جوانی، تعلیم، کاروبار، معاشرتی اور ادبی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کسی بھی عظیم شخصیت کی سوانح حیات لکھنے کا پہلا مقصد تو اُس کی حیات کو کتابی شکل میں محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اُس انسان کی زندگی کے اچھے کاموں سے متاثر ہو کر نئی نسل کے لوگ بھی سبق حاصل کریں۔

اچھی سوانح حیات لکھنے کے لیے کچھ اہم باتوں کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ جیسے جس شخصیت کی سوانح حیات لکھنی ہے اُس کے بارے میں کچھ بھی لکھنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر لی جائیں۔ سوانح حیات لکھتے ہوئے غیر جانبداری سے کام لینا چاہئے تاکہ آنے والی نسلوں تک صحیح معلومات پہنچ سکیں۔ اُردو ادب میں "یادگارِ غالب" نمایاں سوانح عمری ہے جو مولانا الطاف حسین حالی نے لکھی۔ وہ مرزا غالب کے شاگرد تھے اور انہیں غالب سے بے حد محبت اور عقیدت تھی اسی لیے انہوں نے غالب کی سوانح پر قلم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس سوانح میں غالب کی شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ "یادگارِ غالب" میں حالی نے غالب کی شخصیت، شاعری، مزاج، اخلاق، ظرافت، محققانہ نظر، حسنِ بیان اور شوخ طبیعت کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ غالب کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

آپ بیتی / خود نوشت:

سوانح عمری میں جیسے دوسرے شخص کی زندگی کے حالات اور واقعات بیان کیے جاتے ہیں اسی طرح آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری میں لکھنے والا خود اپنی زندگی کے حالات اور واقعات قلمبند کرتا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے Autobiography کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ بیتی میں صفحات کی کوئی قید نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی خاص طریقہ کار ہوتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے میں جہاں بہت سے دُشواریاں ہے، وہیں یہ بات بھی سچ ہے کہ بہت سی آپ بیتیاں سوانح نگاروں کے لیے مفید ثابت ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے سیاست دانوں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی خود نوشت آپ بیتیوں سے بہت کچھ ایسا پتا چلتا ہے جو کہیں کسی بھی کتاب میں موجود نہیں ہوتا۔ اس طرح نئے لکھنے والوں اور سوانح نگاروں کے لیے ایک مستند مواد فراہم ہو جاتا ہے۔

خاکہ نگاری:

لغات میں خاکہ کے معنی پنسل سے نقشہ یا ڈھانچہ بنانے یا پھر کسی کی تصویر کو لفظوں میں بیان کرنے کے ہیں۔ انگریزی زبان میں خاکہ کے معنی "سکیچ" یا "پن پورٹریٹ" کے ہیں۔ دراصل خاکہ میں کسی شخصیت کے نقوش اس طرح اُبھارے جاتے ہیں کہ اس کی خوبیاں اور خامیوں اُجاگر ہو جائیں اور قاری کے دل میں اُس کے لیے عظمت بڑھ جائے۔ خاکہ صرف عظیم اور معتبر شخصیات ہی کا نہیں ہو سکتا بلکہ عام آدمی پر بھی لکھا جاسکتا ہے بشرطیکہ خاکہ نگار نے اُسے بہت قریب سے دیکھا ہو، اُس کی ہر عادت سے واقف ہو اور خاکہ نگار کے فن پر قدرت رکھتا ہو۔ خاکے میں کسی شخص کی زندگی سے متعلق اہم واقعات، اس کی منفرد خصوصیات، عادات و اطوار، ظاہری و باطنی اوصاف، حرکات و سکنات، رہن سہن، حلیہ، لباس، طرز گفتگو وغیرہ کو اس چابکدستی سے بیان کیا جاتا ہے کہ اُس انسان کی شخصیت اور جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ خاکہ نگاری کے کچھ فنی تقاضے بھی ہوتے ہیں مثلاً تمام واقعات کو عمدہ ترتیب سے پیش کیا جائے۔ ہر واقعہ کے درمیان ربط و تسلسل کا خیال رکھا جائے، واقعہ حقیقت سے تعلق رکھتا ہوں۔ اچھا خاکہ نگار وہی ہوتا ہے جو دیانت دار ہو اور غیر جانبداری سے کام لیتا ہو۔ اُردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش قدیم تذکروں میں ملتے ہیں، میر تقی میر کی کتاب "نکات الشعرا" اور مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" میں خاکہ نگاری کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

اُردو میں خاکہ نگار کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" سے ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے یہ خاکہ اپنے اُستاد ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت پر اس خوبصورتی سے لکھا ہے کہ اُردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل بن گیا۔ یہ اردو کا پہلا طویل اور مکمل خاکہ ہے۔ اس خاکے کے بارے میں خلیق انجم فرماتے ہیں:

> "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی" کا شمار اردو کے اعلیٰ ترین خاکوں ہی میں نہیں اُردو کی بہترین تحریروں میں بھی ہوتا ہے"۔(16)

مرزا فرحت اللہ بیگ کے علاوہ خواجہ حسن نظامی، مولوی عبد الحق، مالک رام، فکر تونسوی مجتبیٰ حسین اور خلیق انجم سعادت حسن منٹو اور عطاء الحق قاسمی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

سفر نامہ:

ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کو سفر کرنے کا نام دیا جاتا ہے۔ سفر عربی زبان میں مسافت طے کرنے یا مسافت قطع کرنے کو کہا جاتا ہے۔ مسافر کو سفر کے دوران بہت سی مشکلات اور دُشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے اسی لیے دُنیا کے تمام مذاہب نے مسافر کے ساتھ حسن سلوک پر زور دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام میں مسافر کے لیے صوم وصلوٰۃ جیسے فرائض میں بھی نرمی برتی گئی ہے۔ سفر نامہ لکھنے کی ابتدا تاریخ نویسی کے ساتھ ہی ہوئی۔ یونانی مورخ "ہیروڈونس" کو دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار تسلیم کیا گیا ہے۔ یونان چین، ایران، بغداد، افغانستان اور عرب ممالک سے آنے والے سیاحوں نے سرزمین ہندوستان پر قدم رکھا اور بہت سے سیاحوں نے اپنی یادوں کو تاریخی کتابوں اور سفر نامہ کی شکل میں قلم بند کیا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومنا پھرنا، وہاں کی تہذیب، رسم ورواج، اخلاق وعادات کے بارے میں جاننا انسانی فطرت ہے۔ وہ ایک ہی جگہ رہتے رہتے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے یہی اکتابت اُسے کسی دوسری جگہ کے سفر کی طرف مائل کرتی ہے۔ سفر نامہ نگار کا ذہن جتنا تازہ ہو گا اور تجربہ جتنا وسیع ہو گا اتنا ہی سفر نامہ دلچسپ اور معلوماتی ہو گا۔

روزنامچہ (ڈائری):

روز نامچہ یا ڈائری عام طور پر شب و روز کے واقعات کو تاریخ وار لکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی روز نامچہ میں صبح سے شام تک کے معمولات اور کارکردگیوں کو لکھا جاتا ہے۔ ان تمام واقعات کا تعلق مصنف کی داخلی اور خارجی زندگی سے ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ روز نامچہ ایک ایسی دستاویز ہے جو کسی شخص کی ذاتی زندگی کی مصروفیات اور تاریخی سچائیوں کا آئینہ ہے۔ روز نامچہ کوئی بھی شخص لکھ سکتا ہے۔ موضوع سے لے کر انداز بیان تک لکھنے والے پر کسی طرح کی پابندی نہیں ہوتی۔ لکھنے والا اپنی ذاتی، سماجی اور ادبی زندگی کو جس انداز میں بیان کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ روزنامچہ لکھتے ہوئے ہر واقعہ سلیقے سے ترتیب میں لکھا جائے تو ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ روز نامچہ لکھنے کے کئی فائدے ہیں جن میں اہم فائدہ اپنا احتساب کرنا ہے۔ انسان کی زندگی میں اکثر کئی واقعات رونما ہوتے ہیں جن کا اس کے ذہن پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ روزنامچہ لکھنے والے شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں ایسا عمل کرے جو اپنی ڈائری میں لکھتے ہوئے اُسے شرمندگی نہ ہو بلکہ فخر محسوس ہو۔ اسی لیے روزنامچہ لکھنے والے کی زندگی میں دن بدن تبدیلی آتی ہے اور وہ بہتر سے بہترین انسان بننے کی کوشش میں رہتا ہے۔ آج کل کی مصروفیت بھری زندگی میں روزنامچہ لکھنے لیے بھی انسان کی پاس وقت نہیں۔ کچھ لوگ روزنامچہ لکھنے سے اس لیے بھی بچتے ہیں کہ اُن کی "پرائیویسی" خطرے میں نہ پڑ جائے۔ لیکن ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو بہت سی عظیم شخصیتوں نے اپنے روزنامچے لکھے اور اُن کے یہی

روزنامچے (ڈائریاں) محققین کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اُردو کے نامور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب نے بھی اپنا روزنامچہ "دستنبو" کے عنوان سے لکھا جسے پڑھ کے اُن کے زندگی کے بہت سے ایسے واقعات کا پتا چلتا جو کہیں بھی درج نہیں تھے۔

ترجمہ نگاری:

ایک زبان میں بیان کردہ خیالات کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ معانی، مفہوم اور مطالب وغیرہ اچھی طرح واضح ہو جائیں "ترجمہ یا ترجمہ نگاری" کہلاتا ہے۔ عام طور پر ترجمہ نگاری کو آسان سمجھا جاتا ہے، جبکہ یہ ایک فن اور ہنر ہے۔ کیونکہ کسی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا تصور کیا جاتا ہے۔ ہر زبان کی اپنی ضرورت اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر زبان کے محاورے، طرزِ ادا، اندازِ بیان، استعارے، تراکیب اور مزاج وغیرہ مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زبان کا اپنا پس منظر اور حسن و آہنگ ہوتا ہے۔ کسی زبان کے الفاظ میں وسعت اور گہرائی ہوتی ہے تو کسی زبان میں تنگ دستی۔ ترجمے لیے ضروری ہے کہ مترجم جس زبان کا ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان میں کر رہا ہے، اُن دونوں کے بارے میں پوری طرح نہ صرف واقف ہو بلکہ دونوں زبانوں کی باریکیوں، نفاستوں اور تہہ داریوں کو بخوبی سمجھتا ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جس موضوع پر ترجمہ کیا جارہا ہے اُس میں مترجم کی دلچسپی بھی ہو۔ اچھا مترجم وہی ہوتا ہے جو زبان و بیان کے پیچ و خم کا لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ موضوع کے ادبی علمی، سماجی، سیاسی، تاریخی اور شخصیاتی پس منظر کو بھی ملحوظ رکھے۔

رپورتاژ:

رپورتاژ میں عموماً چشم دید واقعات جیسے کسی جشن، جلسے، جلوس، میٹنگ یا ادبی نشست کی روداد کو رپورٹنگ کے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ رپورتاژ لکھنے کا مقصد پروگرام کی سرگرمیوں کو قاری تک پہنچانا ہوتا ہے۔ رپورتاژ خوبصورت اور ادبی زبان میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے زبان کی موزونیت اور تحریر کی خوبصورتی رپورتاژ کو دلچسپ بناتی ہے۔ اُردو میں رپورتاژ کی تعداد زیادہ نہیں ہے پھر بھی ادبی جرائد میں خوبصورت رپورتاژ پڑھنے کو ملتے ہیں اور پسند بھی کیے جاتے ہیں۔ اُردو نثر کی چند غیر افسانوی اصناف کا تعارف پیش کرنے کے بعد ذیل میں پاکستانی جامعات میں غیر افسانوی ادب میں لکھے گئے تحقیقی مقالہ جات کا تجزیاتی مطالعہ پیش ہے۔

موضوع مقالہ: "ڈاکٹر وزیر آغا: حیات و ادبی خدمات "

مقالہ نگار: تنویر الرحمان، 2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر وزیر آغا ایک متنوع الجہات شخصیت تھے۔ شاعری، انشائیہ، تنقید اور ادبی صحافت میں اُن کے کارہائے نمایاں نصف صدی پر محیط ہیں۔ انھوں نے "اوراق" کے نام سے ادبی پرچہ نکال کر چالیس سال تک نئی نسل اور ادب کی آبیاری کی۔ انشائیہ کے نقوش ادب میں بکھرے ہوئے تھے، ڈاکٹر وزیر آغا نے اُنھیں جمع کیا اور باقاعدہ صنف ادب کی صورت دی۔ عملی اور نظری تنقید میں اُن کا کام کثیر الجہاتی ہے۔ تنقید پر اُن کی بیس کے قریب کتابیں ہیں۔ ثقافت اُن کا خاص موضوع رہا جس پر قابل ذکر تعداد میں مضامین لکھے جو "کلچر کے خدوخال" کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی سامنے آئے۔ غالب، اقبال اور مجید امجد پر باقاعدہ کتب ان شخصیات سے اُن کی خاص دلچسپی کی مظہر ہیں۔ عملی تنقید میں مختلف شعرا کے مرکزی رجحانات دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بحیثیت شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کی سولہ کتابیں ہیں جس میں جدید اردو نظم اور غزل دونوں اصناف شامل ہیں لیکن جدید نظم اُن کا اصل میدان تھا۔ اس میدان میں جہاں انھوں نے جدید نظم کی تفہیم کے لیے مضامین اور اداریے لکھے وہاں علامتوں، استعاروں کے وسیع جہان سے آباد نظمیں بھی تخلیق کیں۔ یہ مقالہ تنویر الرحمان کی ایک کوشش ہے جس میں وزیر آغا کی شخصیت و کردار کے علاوہ شاعری غزل گوئی، نظم نگاری، تنقید، انشائیہ نگاری اور دیگر ادبی خدمات "بطور آپ بیتی نگار، سفر نامہ نگار، مکتوب نگار، بطور مدیر، دیباچہ نگار اور مرتب" کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں اُن کی تخلیقی، علمی، تنقیدی اور دیگر ادبی خدمات کے جائزے کی سعی کی گئی ہے۔

اس مقالے کا پہلا باب ڈاکٹر وزیر آغا کی سوانح، شخصیت و کردار اور تصنیفات و تالیفات کا مفصل جائزہ پیش کرتا ہے۔ سوانح کی ذیل میں اُن کا خاندانی پس منظر، گھر کا ماحول، تعلیم، تخلیقی سفر کا باقاعدہ آغاز، شادی اور اولاد، زراعت کے تجربات، ادبی دنیا میں شریک مدیر کی حیثیت سے کام کرنا۔ "اوراق" کا اجرا، لاہور میں قیام، ایوارڈ اور وفات وغیرہ جیسے ضمنی عنوانات کے تحت معلومات درج کی گئی ہیں۔ ان معلومات کے حصول کے لیے مقالہ نگار نے بنیادی مآخذ اُن کی آپ بیتی "شام کی منڈیر سے" کے علاوہ اُن کے اہل خانہ اور دوست احباب کو قرار دیا۔ تنویر الرحمان نے ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت، مزاج، عادات و اطوار اور مختلف حیثیتوں سے اُن کی شخصیت کے خدوخال بھی اُجاگر کیے ہیں۔ مزید برآں اُن کی تصنیفات و تالیفات کی تفصیل بھی باب

اول میں شامل ہے۔ باب دوم میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں اُن کی نظری تنقید کے مباحث جن میں ساختیات و پس ساختیات، مابعد جدیدیت، تہذیبی و ثقافتی جہت، نفسیات اور دیومالا کا بیان، جدید نظم کے مباحث، انشائیہ کی تنقید اور امتزاجی تنقید وغیرہ شامل ہیں ۔ مزید بر آں "اقبال، غالب، مجید امجد، راشد اور میراجی" کے حوالے سے اُن کی عملی تنقید بھی اس باب میں زیر بحث آئی ہے۔ عملی تنقید میں اُن کی تین کتابوں "مجید امجد کی داستان" "تصورات عشق و خرد: اقبال کی نظر میں" اور "غالب کا ذوق تماشا" کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

باب سوم میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری پر مفصل بات کی گئی ہے۔ ابتدا میں انشائیہ کیا ہے؟ ، مغرب میں انشائیہ، اُردو میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش اور انشائیہ کے فروغ میں رسائل کا کردار، پر مختصراً بات کی گئی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے خصائص جن میں تنوع و بو قلمونی، فطرت کے اسرار سے آگہی، فطرت کی منظر کشی، دیہات کا منظر نامہ، انکشاف ذات اور عرفان کائنات کا عنصر، تازگی، بذلہ سنجی اور شگفتگی وغیرہ شامل ہیں، پر تفصیلی اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے انشائیوں کا فنی و اسلوبیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ضمناً انشائیے کے فروغ اور تفہیم کے حوالے سے وزیر آغا کی مساعی کا مختصراً تذکرہ ہے۔ آخر میں مجموعی جائزہ بھی شامل باب ہے۔

باب چہارم میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بحیثیت شاعر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب تین ذیلی حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلی فصل میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نظم نگاری پر بات کی گئی ہے جس کو مزید دو حصوں مختصر نظم اور طویل نظم میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان حصوں میں جدید اردو نظم کا ارتقا، ڈاکٹر وزیر آغا کی علامت آفرینی، استعاراتی نظام، مقامیت اور تہذیبی عناصر کے علاوہ اُن کی طویل نظموں آدھی صدی کے بعد، ایک کتھا انوکھی، الاؤ، ٹرمینس، اور اندر کے رونے کی آواز" جیسی طویل نظموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسری فصل میں وزیر آغا کی غزلوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اُن کی غزلوں میں موجود "جنگل، ہوا، شام، سفر اور پرندہ کی علامت، دیومالا اور اساطیر کا بیان، روحانی کشف کا اظہار، میکانی اور مشینی زندگی کے خلاف ردعمل" جیسے عناصر پر بطور خاص بات کی گئی ہے۔ تیسری فصل اُن کی پنجابی شاعری (نظم اور غزل) کے جائزے پر مشتمل ہے۔

باب پنجم ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی خدمات کے جائزے پر محیط ہے۔ فصل اول میں ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی "شام کی منڈیر سے" کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس حصے میں خود نوشت سوانح نگاری کی روایت، سوانح نگاری کے لوازم پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے "شام کی منڈیر سے" کا فکری اور اسلوبیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ فصل

دوم میں سفر نامہ نگاری کی روایت پر بات کرنے کے بعد وزیر آغا کے سفر نامے "تین سفر" کے خصائص اور اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فصل چہارم میں ڈاکٹر وزیر آغا کو بطور مدیر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس فصل میں رسالہ " اوراق " کے چالیس سال تک مدیر ہونے کی حیثیت سے کس طرح انھوں نے اپنے اداریوں کے ذریعے ایک ادبی راہ نما کا فریضہ انجام دیا اور اعلیٰ درجے کے منتظم ، رجحان ساز مدیر اور زیرک اداریہ نویس ہونے کا ثبوت دیا۔ فصل پنجم میں وزیر آغا کی دیباچہ نگاری کے اوصاف اور اسلوب پر بحث کی گئی ہے اور آخری یعنی فصل ششم میں وزیر آغا کا بطور مرتب جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے ما حصل میں وزیر آغا کی تمام تخلیقی ، تنقیدی و دیگر ادبی مساعی کو سامنے رکھتے ہوئے اُردو ادب میں اُن کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ کتابیات کے عنوان سے جن مآخذ سے براہِ راست یا بلا واسطہ استفادہ کیا گیا، اُن کی مکمل فہرست بھی مقالہ نگار نے شامل کی ہے۔ "ضمائم" کے عنوان کے تحت آخر میں چار ضمیمے بھی شامل مقالہ ہیں۔

موضوع مقالہ: "ڈاکٹر گیان چند جین: احوال و آثار "

مقالہ نگار: عثمان شاہ، 2011ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، قرطبہ یونیورسٹی، پشاور

اُردو زبان و ادب کا خمیر برصغیر پاک وہند سے اٹھا ہے۔ برصغیر کی اقوام کے درمیان رابطے کی اس زبان میں ہر مذہب اور ہر خطے سے تعلق رکھنے والے ادبا اور شعرا نے خامہ فرسائی کی ہے۔ نفرت اور تعصب سے ناآشنا، امن و آشتی اور دوستی و بھائی چارے کی فضا کو فروغ دینے والی زبان ایک خود رو پودے کی مانند اپنی زندگی کو ہر مشکل سے بچاتے ہوئے محو سفر رہی ہے اور اب ایک قلیل عرصے میں دنیا کی تیسری بڑی زبان کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس شستہ و شیرین زبان کو روز اول سے ہی نامساعد حالات کا سامنا رہا ہے مگر عوام میں جنم لینے والی اس زبان کو ہر دور اور ہر خطے میں ایسے عظیم سپوت میسر رہے ہیں جنہوں نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اپنی تمام تر زندگی اس کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کر دی۔ بلاشبہ ان عظیم ادیبوں میں ہر مذہب ، نسل اور علاقے سے تعلق رکھنے والے ادیب شامل ہیں جنہوں نے ہر طرح کے تعصبات اور اختلافات سے بالاتر ہو کر اسے رابطے کا ذریعہ بنایا جس کی بدولت برصغیر پاک وہند کی مختلف اقوام اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے آپس میں یک جاں ہوئے۔ اُردو زبان و ادب کا دامن نہایت زرخیز ہے، جس میں ہر صنف سخن میں بھر پور طبع آزمائی کی گئی اور بڑے بڑے اہل قلم نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ یوں آج اسے دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ادب کے مقابلے پر لایا جا سکتا ہے۔ اُردو زبان و ادب سے وابستہ ادبا کی ایک واضح تعداد

اُردو کے اہلِ زبان نہ ہونے کے باوجود اُردو زبان و ادب ہی میں سخن گوئی کو شعار بنائے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے یہ غالباً دنیا کی واحد زبان ہو گی جس میں غیر اہل زبان اس قدر کثیر تعداد میں اتنے بہترین اسلوب میں لکھتے رہے ہیں۔ اس طرح مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے لکھاریوں کی وجہ سے اس زبان کے اسلوب و آہنگ میں گراں قدر اضافے اور تجربے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین کا شمار بھی ایسے ہی عظیم ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی آدھی صدی سے زیادہ زندگی اُردو زبان کے نام کر دی اور اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ آپ کی خدمات کا دائرہ کار نہایت وسیع اور ناقابل فراموش ہے۔ آپ ایک بلند پایہ اُستاد، بہترین محقق، مضمون نگار اور ماہر لسانیات رہے۔ آپ کی کئی تصانیف کو دنیا بھر کی جامعات میں حوالے کی کتابوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ بالخصوص تحقیق سے وابستہ اساتذہ اور طلبہ میں آپ کی تصانیف کی مقبولیت کسی سے پوشیدہ نہیں جو تحقیق کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ گیان چند جین کی قابل فخر تصانیف میں "ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب ماہ و سال ۱۹۹۸ء تک" اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے جس میں آپ نے اقبال کے منسوخ و متداول ابتدائی کلام کا ریزہ ریزہ جمع کر کے ثابت کر دکھایا کہ علامہ اقبال کی شاعری کا ذوق رکھنے والے ہندوستان میں بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اہلِ پاکستان اور اقبال شناسوں کو اُن کے ابتدائی عشقیہ شاعری اور فکر و فن کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کا بہترین موقع فراہم کیا۔ اس طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر "رموزِ غالب" کے نام سے مضامین کا مجموعہ بھی آپ کا کارنامہ ہے، جس سے اُردو کے اس عظیم شاعر کی زندگی کے کئی رُخ سامنے آتے ہیں۔ غالب کے قلم زد اور متداول دونوں طرح کا کلام اس مجموعے کے مضامین سے پوری طرح عیاں ہے۔ غالب کے منسوخ کلام کی شرح کے حوالے سے آپ کا شاہکار کارنامہ "تفسیر غالب" آپ کی غالب شناسی کا بین ثبوت ہے۔ غالب کے مُغلق طبیعت اور دور از فہم شاعری کو "تفسیر غالب" کے ذریعے انہوں نے قابلِ فہم اور مطالعے کے لیے آسان بنایا۔ اسی طرح "اُردو مثنوی شمالی ہند" میں آپ کی وہ تصنیف ہے جو اُردو ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ صنف مثنوی پر آپ کی یہ تحقیق گراں قدر خوبیوں کا مرقع ہے۔ ایک اور قابلِ قدر تصنیف "تحقیق کا فن" ہے جس میں فنِ تحقیق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مقالہ نگار عثمان شاہ، گیان چند کے تحقیقی اسلوب کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "گیان چند نے تحقیق کے لیے صاف اور عام فہم زبان استعمال کرتے ہوئے جامع اور مختصر بات کرنے کے اُصولوں کو اپنایا ہے۔ تحقیق کے طلبہ پر زور دیا ہے کہ

تحقیق کرتے ہوئے وہ سخت ، نامانوس ، دقیق اور پر تصنع الفاظ و عبارات سے اجتناب برتیں اور بغیر کسی خاص ضرورت کے تشبیہات و استعارات اور مخففات سے بھی گریز کریں۔ اس ضمن میں آپ نے اپنا عمیق مطالعہ و مشاہدہ پیش کیا ہے اور قدم قدم پر دیگر محققین اور ناقدین کی آرا اور تجربات کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے"۔(17)

گیان چند جین نے سیدہ جعفر کے اشتراک سے "تاریخ ادب اُردو" پانچ جلدوں میں لکھی ہے جو ایک قابل تحسین کاوش ہے۔ پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم تاریخ میں آپ نے اُردو ادب کی بہترین تاریخ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یوں مختلف موضوعات پر مضامین و مقالات بھی اعلیٰ پائے کے ہیں۔ ان مضامین و مقالات میں لسانیات، تحقیق، تاریخ، اُردو زبان و ادب پر دیگر زبانوں کے اثرات اور اصناف ادب پر جامع اور مدلل بحث کی ہے۔

زیر نظر مقالہ "ڈاکٹر گیان چند جین: احوال و آثار" میں مقالہ نگار عثمان شاہ نے گیان چند کی زندگی اور ادبی خدمات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے جس سے ایک طرف آپ کی شخصیت اور مختلف اضاف ادب میں آپ کی خدمات نکھر کر سامنے آئیں تو دوسری طرف ادب کے اساتذہ اور طلبہ کو بھی آپ کی زندگی اور فن سے کماحقہ واقفیت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ مقالے کا باب اوّل ڈاکٹر گیان چند جین کی شخصیت کے حوالے سے ہے جس میں آپ کی پیدائش، خاندان، تعلیم و تربیت، ملازمت، رہائش اور زندگی کے مختلف ادوار کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم میں آپ کو ایک محقق کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور اُردو تحقیق پر آپ کا نیا، بہترین اور اچھوتا انداز بیان، فنِ تحقیق کے لیے متعین کردہ اُصول اور اس ضمن میں آپ کی مشہور تصنیف "تحقیق کا فن" میں اُصول تحقیق میں کی گئی ترامیم سمیت کئی حوالوں سے آپ کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عثمان شاہ نے آپ کی دیگر تحقیقی تصانیف کا بھی جائزہ پیش کیا ہے جن میں آپ کی اولین تحقیق "اُردو کی نثری داستانیں"، "اُردو مثنوی شمالی ہند میں"، "تاریخ ادب اُردو: 1700ء تک اور "اُردو کی ادبی تاریخیں" شامل ہیں۔

باب سوم میں پروفیسر جین کی غالب شناسی اور اقبال شناسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں مرزا غالب پر آپ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعے "رموز غالب" پر بحث کی گئی ہے جبکہ آپ کی تصنیف "ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال" میں علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری پر آپ کی تحقیقی کاوشوں کو

اُجاگر کیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کی تصانیف "قاضی عبد الودود بحیثیت مرتب متن" اور "اپندر ناتھ اشک" کا تنقیدی جائزہ بھی اس باب کا حصہ ہیں۔ باب چہارم ڈاکٹر گیان چند کی مضمون نگاری سے متعلق ہے، جس میں آپ کے مضامین کے مجموعوں اور وقتاً فوقتاً پاکستان وہندوستان کے معیاری رسائل میں چھپنے والے آپ کے تحقیقی مضامین کا تذکرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے کئی مضامین کی روشنی میں آپ کے فکر و فن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں گیان چند جین کو ایک عروض داں کی حیثیت سے بھی سراہا گیا ہے۔ باب پنجم میں انہیں ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور لسانیات کے میدان میں آپ کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے، اُردو زبان و ادب میں لسانیات کے نت نئے تجربات، نئے اور پرانے اسالیب اور حرکات و سکنات کا سائنسی انداز سے مشاہدہ کیا گیا ہے۔ لسانیات پر کام کرنے والے دیگر محققین اور ماہرین لسانیات کی تصانیف سے آپ کے تجربات و مشاہدات کا موازنہ اور اُردو زبان و ادب پر اس کے اثرات کے حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

باب ششم آپ کی زندگی کی آخری اور متنازع کتاب "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" سے متعلق ہے جس میں اس کتاب کے مختصر مگر جامع تنقیدی جائزے کے علاوہ اس کے اعتراض میں لکھی جانے والی تحریروں اور اس کے معترضین کا موازنہ شامل ہے اور ان میں سے بعض اعتراضات کے مدلل جوابات دینے کی بھی عثمان شاہ نے کوشش کی ہے۔ باب ہفتم مقالے کا آخری باب ہے جس میں حاصل تحقیق شامل ہے۔ اس حوالے سے مقالہ نگار نے مختلف ادبا کی رائے لی ہے، اساتذۂ ادب، محققین اور دانشوروں سے انٹرویوز کیے اور مختلف مراسلوں، اخبارات و جرائد اور انٹرنیٹ سے بھی مدد لی ہے جس کی روشنی میں انہوں نے ادب کے اس درخشندہ ستارے کا مقام متعین کیا ہے۔ "ڈاکٹر گیان چند جین: احوال و آثار" میں بعض مقامات پر کچھ باتوں کی تکرار نظر آتی ہے جس سے شاید مقالہ بوجھل محسوس ہو لیکن یہ اُس وقت موضوع کی مناسبت سے وضاحت کے لیے ضروری تھا۔ تاہم اس کا اعتراف کرتے ہوئے محقق نے اس پر پیشگی معذرت بھی کی ہے اور اُمید کی ہے کہ اس تحقیقی کام کو ادب کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

موضوع مقالہ: "تابش دہلوی: احوال و آثار"

مقالہ نگار: شاہانہ خانم، 2018ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال، جامعہ کراچی، کراچی

ایک اچھا نغمہ یا ایک اچھا شعر جہاں آدمی کو متاثر کرتا ہے وہاں شاعری حسن کی ترویج اور اس کے پاکیزہ اظہار کا نام بھی ہے۔ یہ پاکیزہ خیالات، احساسات اور جذبات کی نشو و نمود کرتی ہے کیونکہ شاعری کا بنیادی مقصد ہی اچھے جذبات کی تربیت، ترغیب اور اشاعت ہے۔ ان ہی تمام خوبیوں کا مجموعہ تابش دہلوی کی شاعری ہے۔ کیونکہ تابش شعر کہنے کی فطری صلاحیت سے متصف تھے۔ زبان و بیان پر گرفت مضبوط تھی ، تابش زبان کی صحت کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ لفظیات ان کی اپنی تھیں، یہی صلاحیت ان کو دیگر شعرا سے مختلف کرتی ہے اور ان کو ممتاز مقام کا حامل بناتی ہے۔ مقالہ بحوالہ عنوان بالا میں تابش دہلوی کی شخصیت اور فکر و فن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس مقالے کو شاہانہ خانم نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول تابش دہلوی کی سوانح حیات ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق تابش دہلوی کا خاندان اور ان کا ددھیال دہلی سے تعلق رکھتا تھا۔ تابش دہلوی کے پردادا نظام الدین نظامی فارسی کے مستند ادیب اور شاعر تھے۔ آپ کے دادا فیض الحسن بھی شعر وادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ تابش دہلوی کا خاندانی نام مسعود الحسن تھا۔ آپ کے والد محترم ثناء الحسن نے دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری بیوی قیصر جہاں بنت سید سعید احمد سے واحد اولاد سید مسعود الحسن تابش دہلوی تھے۔ آپ اپنے نانا مولوی عنایت اللہ کے ساتھ تقریباً سترہ برس حیدر آباد میں مقیم رہے۔ ادبی و شعری ذوق کی تربیت تمام تر یہیں ہوئی اور یہیں تابش نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

باب دوم اردو" غزل کی روایت کے تناظر میں تابش دہلوی کی غزل کا مطالعہ " ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار بتاتے ہیں کہ اردو غزل نے ہر دور میں اپنے عہد کی ترجمانی اور عکاسی کی، جیسا عہد رہا ویسی غزل گوئی رہی۔ تابش دہلوی کی غزل اس روایت پر عمل پیرا ہے، یوں تابش دہلوی کی غزل بھی اپنے عہد کی ترجمان نظر آتی ہے۔ باب سوم " اردو نظم کی روایت کے تناظر میں تابش دہلوی کی منظومات کا مطالعہ " ہے۔ تابش دہلوی کی نظمیں اپنی شعریت اور پختہ انداز بیان کی وجہ سے بھرپور تاثر پیش کرتی ہیں۔ ان کا شعری آہنگ، زبان و بیان اور موضوعات انہیں رومانویت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ان کی نظموں میں داخلی کیفیات کی یہ اتنی سادہ مگر اتنی ہی پیچیدگی اور سنجیدگی کے ساتھ انسان کے باطن کو کئی نئے سوالوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ ان کی نظموں میں آزاد اور پابند دونوں طرح کی ہیئتوں کے تجربات نظر آتے ہیں لیکن آزاد نظم میں شعریت کی پابندی کو تابش دہلوی نے اپنے لیے لازم جانا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آزاد نظمیں بھی پابند نظموں کی طرح خیال کی یکساں پختگی اور تاثیر کی حامل ہیں مثلاً اس طرز کی شعری کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ تابش کا حمدیہ کلام جو تابش کے مذہبی جذبات کی بہترین عکاس ہے۔ تابش کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہانہ خانم لکھتی ہیں:

"نعت گوئی باقاعدہ صنف سخن کے طور پر رائج ہے۔ تابش نے اس صنف کو بخوبی نبھایا ہے۔ رسول پاک سے اُن کی عقیدت اور محبت کچھ اس درجہ کی ہے کہ قاری تابش کی نعت پڑھتے ہوئے اس عقیدت اور محبت کا حصہ بن جاتا ہے جو تابش کے حصے میں آئی۔ تابش کی بیشتر نعتیں غزل کا طرز لے کر وارد ہوتی ہیں اور تابش کو دیگر شعرا سے مختلف کر جاتی ہیں"۔(18)

"تابش دہلوی: احوال و آثار " کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تابش دہلوی نے منقبت نگاری میں تجربہ کیا ہے۔ تابش نے خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیقؓ ،حضرت عثمانؓ ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے حوالے سے چار مناقب تحریر کیے ہیں۔ تابش دہلوی نے بڑے سلیقے سے اہل کربلا کی شان میں سلام پیش کیے ہیں اور اسے اپنے لیے راہ نجات سمجھتے ہیں۔ تابش دہلوی کا تحریر کردہ مرثیہ عام مرثیہ نگاری کی روایت سے مختلف ہے، گو کہ انہوں نے کچھ خصوصیات خاص طور پر ہیئتی خصوصیت کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس کے باوجود ان کا اپنا ذاتی انداز ہے جو انہیں دیگر مرثیہ نگاروں سے مختلف کرتا ہے۔ باب چہارم "اردو نثر کی مختصر تاریخ اور تابش دہلوی کی نثر کا مطالعہ " ہے۔ نثر میں تابش دہلوی کا صرف ایک مجموعہ "دید باز دید "ہے۔ تابش دہلوی کی "دید باز دید" نے ایک ایسازاویہ فراہم کر دیا ہے جس کی مدد سے ہماری آئندہ نسلیں اس پورے عہد میں جھانک سکیں گی جو فی الحال تو" حال" ہے لیکن امتدادِ زمانہ سے آج یا تو کل اسے ماضی بن جانا ہے۔ تابش نے خاکے بھی لکھے اور تنقید بھی کی ہے۔ ساتھ ساتھ ادبی نوعیت کی یادداشتیں بھی تحریر کی تھیں۔

اس مقالے کے تجزیاتی مطالعے سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تابش دہلوی ایک معتبر نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تحریریں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں کہ تاریخ سے اپنا رشتہ قائم کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسے انسان پر کچھ نہ لکھنا یا بہت کم لکھنا نامناسب عمل ہے۔ تابش دہلوی نے اس نامناسب عمل کو برداشت کیا۔ تابش دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام بھی کافی مقدار میں موجود ہے۔ جسے نعیم میرٹھی نے اُن کی کلیات "کشت نوا" کے نام سے مدون کرتے ہوئے اس میں شامل کیا ہے۔ تابش تمام عمر اسی ڈگر پر چلتے رہے جسے روایت اور وضع داری کہا جا سکتا ہے۔ موضوعات و ہئیت کے اتنے تجربے تابش دہلوی کے یہاں موجود ہیں کہ ان کے شاعری کے تنوع اور زود گوئی کا قائل ہونا پڑتا ہے بلکہ بڑے بڑے شعرا اس کے قائل ہیں۔ تابش دہلوی اور شاعری کا تعلق بہت گہرا ہے۔ تابش شاعری سے اور شاعری تابش سے تعلق خاص رکھتی ہے۔ شاعری وہ دار ہے جس پر تابش تمام عمر مصلوب رہے اور یہی مذکورہ مقالے کا" حاصل کلام " بھی ہے۔

موضوعِ مقالہ: "پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ:1960ء تا حال "

مقالہ نگار: سائرہ بتول،2012ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر روبینہ شہناز، نمل،اسلام آباد

انشائیہ اُردو ادب کی ایک نہایت اہم صنف ہے۔ اگرچہ جدید انشائیے کا آغاز بہت بعد میں ہوا تاہم اُردو کے نثری ادب کے آغاز کے ساتھ ہی نثر پاروں میں انشائی خدو خال نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بعد میں جب انگریزی "essay" کو جدید انشائیہ کے طور پر اُردو میں رواج دیا گیا تو یہ صنف اپنی منفرد شعریات کی بنیاد پر باقی اصناف سے اپنے آپ کو الگ کرتی چلی گئی، لہٰذا جیسے جیسے اس صنف کو پروان چڑھانے والے اس کی طرف متوجہ ہوتے گئے اس میں اسالیب کا تنوع بڑھتا چلا گیا۔ انشائیہ نگاروں کے اسالیب پر اُردو میں جزوی طور پر تو کام ہوتا رہا لیکن مجموعی طور پر ایک ایسی کوشش کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی جس سے یہ صنف اپنی رنگارنگی کے باعث ایک جائز مقام کی حامل ہو جائے۔ مذکورہ تحقیقی مقالے کے مطالعے سے یہ تجزیہ کیا جا سکتا ہے کہ مقالہ نگار نے یہ مقالہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر تحریر کیا تاہم اس موضوع کا کما حقہ احاطہ کرنے کے لیے وہ صرف پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب تک محدود رہے۔ اپنے مقالے کو انہوں نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "اسلوب" کی تعریف اور ماہیت سے متعلق ہے، اس حوالے سے وہ لکھتی ہیں:

> "یوں تو ہر صنف ادب کی پہچان کا معتبر وسیلہ اس میں برتا گیا ہوتا ہے۔ لیکن صنف انشائیہ کی روح گویا اس کا اسلوب ہی ہے۔ ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ انشائیے کا وجود اور معیار دونوں اس کے اسلوب ہی سے عبارت ہیں"۔(19)

مقالہ نگار نے پہلے باب میں انشائی اسلوب کی بحث سے قبل اسلوب کے عمومی مفہوم کو مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اسلوب لفظ اور معنی کے اشتراک سے جنم لیتا ہے الفاظ گویا پیکر ہوتے ہیں اور معانی اُس کی روح کسی تحریر کا ظاہری ڈھانچہ جتنا مضبوط ہو گا اور اُس کے اندر معانی کی قوت جتنی جاذب توجہ ہو گی اتنی ہی وہ تحریر جاندار اور خوش اسلوب ہو گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اصناف میں اسلوبیاتی تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرا باب جدید اردو انشائیے کے تین سرکردہ ناموں کے اسلوب کا مجموعی جائزہ ہے۔ اسلوب کی سطح پر جب جدید اُردو انشائیے کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ صنف ادب بہت توانا اور بھرپور نظر آتی ہے۔ انشائیے کے معیار اور اعتبار کی بڑی وجہ اس کا اسلوب ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھرتا اور سنورتا جا رہا ہے۔

اسلوب کے اس نکھار کا ایک سبب پاکستانی انشائیہ نگاروں کی موثر اور وقیع کوششیں ہیں جو لائق تحسین ہیں۔ وزیر آغا، نذیر صدیقی اور مشکور حسین یاد وہ تین نام ہیں جنھوں نے ابتدا ہی میں انشائیے کے تین مکاتب کی اسلوبیاتی سطح پر الگ شناخت پیدا کی ہے۔ وزیر آغا نے جدید انشائیے کو نیا رنگ روپ اور امتیاز واعزاز عطا کرنے کے لیے اپنی پوری توانائیاں صرف کیں۔ انھوں نے تخلیقی طور پر بہت اعلیٰ انشائیے تحریر کیے اور اس کے خدو خال نمایاں کرنے کے لیے مسلسل مضامین قلمبند کیے۔ "ادبی دنیا" اور اس کے بعد "اوراق' جیسے رسائل و جرائد میں انشائیے کو خصوصی منصب عطا کر کے پوری اُردو دنیا کو ایک دفعہ اس صنف کی طرف متوجہ کر دیا۔ وزیر آغا نے ہی جدید انشائیے کی تعریف کا تعین کیا۔ انشائیے کو تخلیقی درجہ دیا اور اس کے عناصر ترکیبی کی پرکھ کی۔ انھوں نے انشائیہ لکھا اور اس صنف کی تکنیک، مزاج اور فنی اسالیب متعین کر کے عملی تنقید کا حق ادا کیا۔ ان کے انشائیوں کے اسلوب میں لطافت، تازگی، انکشاف ذات، تنوع اور رنگارنگی، اندر کی مسرت اور باہر کی حیرت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اس باب میں مقالہ نگار نے وزیر آغا کے فن اور اسلوب پر تفصیل سے بحث کرنے کے بعد اُن کے ہم عصر اور انشائیے کے مختلف مکتب کے نمائندے نظیر صدیقی کی انشائیہ نگاری کو موضوع بحث بنایا ہے۔ نظیر صدیقی بنیادی طور پر طنز نگار ہیں لیکن وہ انشائیہ نگار کی طرح انکشاف ذات کے قائل ہیں اور اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ معاشرے کی مضحک صورت حال کو جزیات نگاری کے وسیلے سے طنز و مزاح کا لمس دیتے ہیں تاکہ تحریر میں شگفتگی اور دلکشی پیدا ہو۔ ان کے انشائیوں میں فکر کی گہرائی بھی ملتی ہے اور طنز کی کاٹ بھی۔ انشائیہ نگاری میں ان کا خصوصی اسلوب تھا جس کے مطابق انشائیہ طنز و مزاح کا احاطہ بھی کر سکتا ہے اور علم و دانش کا بھی۔ ان کے انشائیے میں طنز، فکر، فلسفہ، ذاتی مشاہدہ و گہرا مطالعہ، انکشاف ذات، بات سے بات پیدا کرنے کا عمل، اختصار، زبان و بیان پر مکمل گرفت، آزادہ روی سبھی عناصر دیکھے جاسکتے ہیں۔

انشائیہ کے دور وسطی کے تخلیق کاروں میں مشتاق قمر جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، سلیم آغا، انور سدید، انجم نیازی اور حامد برگی کو نمائندگی دی گئی ہے۔ مشتاق قمر، وزیر آغا کے دوستوں میں سے تھے اور انہی کی تحریک پر وہ انشائیے کی طرف آئے۔ ان کے اسلوب کی خاص بات یہ ہے کہ وہ زندگی کی ایک جہت کو نظر میں رکھتے ہیں اور اُس پر اس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ پوری طرح جگمگا اٹھتی ہے۔ جمیل آذر بھی مشتاق قمر کی طرح وزیر آغا کے مشورے پر ہی انشائیے کی طرف متوجہ ہوئے لیکن بہت جلد ہی انھوں

نے اپنا اسلوب وضع کر لیا۔ جمیل آذر کا انگریزی ادبیات کا مطالعہ وسیع ہے۔انھوں نے چونکہ براہ راست انگریزی 'ایسے' سے استفادہ کیا ہے لہذا مغربی انشائی عناصر انھیں اپنے ہمعصروں سے ممتاز اسلوب کا حامل انشائیہ نگار ٹھہراتے ہیں۔ غلام جیلانی اصغر نے اپنے انشایئے کو مزاح کے تڑکے سے منفرد بنالیا اُن کی مزاح نگاری اور انشائیہ نگاری جس نقطے پر ہم آمیز ہو جاتے ہیں وہاں اُن کی انفرادیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔اکبر حمیدی سلیم آغا، انور سدید، انجم نیازی اور حامد برگی کے ہاں کچھ عناصر کا اشتراک ہے اور کہیں کہیں ایک دوسرے کے ہاں بعض اجزائے ترکیبی کی کمی بیشی سے اسلوب میں تنوع پیدا ہوتا چلا گیا ہے اگر کہیں کہیں یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔

مقالہ نگار نے اس مقالے کو درج ذیل چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلے باب میں اسلوب، انشائیہ کی ماہیت اور اسلوبیاتی عناصر کا تعین کیا گیا ہے۔ نیز انشائیہ کی مختصر تاریخ تحریر کی گئی ہے۔دوسرے باب میں باقاعدہ انشائیہ نگاری کے ابتدائی دور کے تین اہم انشائیہ نگاروں مشکور حسین یاد، نظیر صدیقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے اسالیب کا جائزہ لے کر انشائیہ کے اسالیب کا تعین کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں پاکستان میں انشائیہ نگاری کے پہلے دور کے انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔چوتھے باب میں دوسرے دور کے انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تجزیہ کیا گیا ہے۔پانچویں باب میں تیسرے دور کے انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔باب ششم مجموعی جائزہ، استخراج نتائج اور سفارشات پر مبنی ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی، حیدر قریشی ، خیر الدین انصاری، پروین طارق، شہزاد قیصر، ناصر عباس نیر، حنیف باوا، شفیع ہمدم، اے غفار پاشا، خالد اقبال، منور عثمانی، ڈاکٹر محمد سلیم ملک جیسے انشائیہ نگاروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ شمیم حیدر ترمذی اپنے دو مجموعوں "پھوار "اور" ہنستے بولتے لفظ "کی وجہ سے اس دور کے تخلیق کاروں میں سر فہرست ہیں۔ انشایئے کو ہر حال میں ہلکی پھلکی تحریر کے طور پر جلوہ گر دیکھنا، اُن کا مطمع نظر ہے۔ باقی انشائیہ نگاروں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ یہ خوبی نمایاں ہے۔ شہزاد قیصر اور ڈاکٹر سلیم ملک کے علاوہ مذکورہ ناموں میں سے سب "اوراق" سکول سے تعلق رکھنے والے ہیں ،لہذا اُن کے ہاں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسلوب کا وہی پہلو نمایاں ہے جو وزیر آغا اور ان کے ہمعصروں کے ہاں نمایاں ہے۔ شہزاد قیصر، ڈاکٹر سلیم ملک کے ہاں شمیم حیدر ترمذی کے اسلوب کے اثرات جھلکتے ہیں۔

پانچواں باب اُن انشائیہ نگاروں سے متعلق ہے جو مختصر عرصے کے لیے اس صنف کی طرف راغب ہوئے یا ان کا بنیادی حوالہ شاعری اور مزاح نگاری ہے لیکن اُن کے ہاں انشائی اسلوب کا سراغ لگایا جاسکتا ہے ۔ارشد میر ، تقی حسین خسرو، حسرت کاسگنجوی، سلمان بٹ، اظہر ادیب، محمد اقبال انجم، بشیر سیفی، راجہ محمد ریاض الرحمان، جان کاشمیری، محمد یونس بٹ، محمد اسلام تبسم، رعنا تقی، شاہد شیدائی، رضی الدین رضی، عامر عبد اللہ، صلاح الدین حیدر، خالد سہیل ملک، شکیلہ رفیق وغیرہ ایسے ہی انشائیہ نگار ہیں۔ان انشائیہ نگاروں نے انشائیہ کے بنے بنائے اصولوں کی پاسداری ضرور کی لیکن ساتھ ساتھ خیال، احساس اور اسلوب کی جدت اور تازگی کو اپنے اپنے انداز میں آگے بڑھایا۔ ہر انشائیہ نگار کے مزاج اور اس کی شخصیت کا رنگ اس کی تخلیق میں الگ سے نظر آتا ہے۔ انکشاف ذات سب کے ہاں ہے لیکن اس انکشاف کے مظاہر اور مناظر مختلف رنگوں سے مزین کیے گئے ہیں۔ شخصیات کے فرق نے انشائیے میں برتے اسالیب کو رنگا رنگ تصاویر کے روپ میں بدل دیا ہے۔

اس مقالے میں مقالہ نگار بتاتے ہیں کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جب علمی، ادبی، سائنسی اور سیاسی تحریکوں نے برصغیر کے لوگوں کے ذہنی رویوں میں تبدیلیاں پیدا کیں اور یہاں کا انسان نئے خیالات ، متنوع جذبات، تازہ تجربات اور عصری علوم وفنون کی نئی کروٹوں سے آگاہ ہوا تو یہاں کے لکھنے والوں کو ذات کے اظہار کے لئے نئے ادبی سانچوں کی بھی تلاش ہوئی۔ اس تلاش میں جہاں اظہار و ابلاغ کے کئی پیکر ہاتھ لگے وہاں انشائیہ بھی دریافت ہوا۔ دیگر اصناف ادب کی طرح اس کے سانچے بھی مغرب سے لئے گئے ۔ اس امر کی ضرورت تھی کہ اس مواد کو اکٹھا کر کے انشائیے کے اسلوبیاتی عناصر کا تعین کیا جائے۔ مقالہ نگار نے اس مواد کو جمع کر کے اپنی تحقیقی کاوش میں جن امور کا احاطہ کیا ہے اُن میں "جدید اسلوب نثر پر بنیادی مباحث، انشائیے کے اسلوبیاتی عناصر کی شناخت اور تعین، ابتدائی دور کے اہم انشائیہ نگاروں کے اسلوب کا انفرادی تجزیہ اور مختلف اسالیب کا تعین، انشائیہ نگاری کے مختلف ادوار میں سامنے آنے والے انشائیہ نگاروں کے اسلوب کا مطالعہ اور تجزیہ "شامل ہیں۔

موضوع مقالہ: "اُردو مضمون نگاری میں پاکستانیت کے عناصر"

مقالہ نگار: عبد الودود قریشی، 2018ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شفیق انجم، نمل، اسلام آباد

انیسویں صدی میں علی گڑھ تحریک کا آغاز سر سید احمد خان کی مضمون نگاری سے ہوا۔ سر سید نے انگریزی رسالوں کی طرز پر "تہذیب الاخلاق" رسالہ جاری کیا اور ان کے رفقا نے بھی اسی اسلوب پر اس میں مضامین لکھے۔ قیام پاکستان کے بعد مختلف اصناف ادب میں ایسے عناصر اجاگر ہوئے جو پاکستان کی دھرتی اس کی عوام، ان کے نظریات، تہذیب، ثقافت اور قومیت کے لیے خاص تھے اور یوں پاکستانیت، پاکستانی ادب، پاکستانی کلچر اور پاکستانی ثقافت اپنے انداز میں اجاگر ہوئی جس نے خطے کی دیگر اقوام کو بھی متاثر کیا۔ اقلیت نے ایک نظریہ کی بنیاد پر ملک حاصل کر لیا تو اس کی پہلی کڑی اردو مضمون نگاری ہی نظر آئی جو سارے خطے میں عام فہم اور جدید اسلوب تھا۔ مضمون نگاری کا آغاز مارچ ۱۵۷۱ء میں فرانسیسی فلسفی مانیٹن نے کیا اور اس کا نام (Essay) رکھا- سترہ سال بعد اس صنف کو برطانوی مصنف بیکن نے انگریزی میں لکھنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ یہ صنف دنیا بھر کی زبانوں میں مقبول ہوئی۔ برصغیر میں اردو مضمون نگاری کی صنف پہلی مرتبہ ماسٹر رام چند نے اپنے رسالے "فوائد الناظرین" میں ۱۹۴۵ء میں استعمال کی مگر وہ سائنسی مضامین تھے۔ اس کے بعد سر سید نے برطانیہ کے رسالوں "دی سپکٹیٹر" اور" دی ٹیٹلر "سے متاثر ہو کر "تہذیب الاخلاق "کا اجرا کیا اور مضمون نویسی کو اپنایا۔

"اُردو مضمون نگاری میں پاکستانیت کے عناصر" کا بنیادی دورانیہ قیام پاکستان کے بعد ۲۰۱۵ء تک ہے۔ اس طرح پاکستان میں مضمون نگاری کے عہد بہ عہد بدلتے تناظر اور نئے رخ سے شامل ہونے والے مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مقالے میں مباحث کی تقسیم موضوعاتی ہے۔ مختلف موضوعات: قومیت، کلچر اور ادب کو الگ الگ باب میں ذیلی عنوانات کے تحت زیر بحث لاتے ہوئے نتائج مرتب کیے گئے ہیں۔ مقالہ نگار نے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول "موضوع کا تعارف، اصول و مباحث، پاکستانیت کے بنیادی عناصر تعارف وحدود: قیام پاکستان سے پہلے، اردو مضمون نگاروں میں پاکستانیت کے مباحث پس منظری مطالعہ" پر مشتمل ہے۔ باب دوم میں اُردو مضمون نگاری میں پاکستانی قومیت کے مباحث، قیام پاکستان کے بعد پاکستانی قومیت کے مباحث: بنیادی محرکات، قومیت کی مختلف تعبیرات، اہم مضمون نگاروں کے تصور قومیت کا خصوصی مطالعہ شامل ہے۔ باب سوم اُردو مضمون نگاری میں پاکستانی کلچر کے مباحث، پاکستانی کلچر کے مباحث کی ابتدا محرکات و مقاصد، پاکستانی کلچر کی مختلف تعبیرات، اہم مضمون نگاروں کے افکار و نظریات کا خصوصی مطالعہ پر مشتمل مشتمل ہے۔ باب چہارم میں اردو مضمون نگاری میں پاکستانی ادب کے مباحث، ادب میں پاکستانیت کے مباحث ادبی تحریکوں اور پاکستان کے مباحث، پاکستانی ادب کی تحریک، اسلامی ادب کی

تحریک، ارضی ثقافتی تحریک، اہم مضمون نگاروں کے افکار و نظریات کا خصوصی مطالعے پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم مجموعی جائزہ، نتائج اور سفارشات پر مشتمل ہے۔

موضوع مقالہ: "عزیز ملک: شخصیت اور علمی و ادبی خدمات"

مقالہ نگار: زاہد حسن چغتائی، 2018ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر ذوالقرنین احمد (شاداب احسانی)، جامعہ کراچی، کراچی

عزیز ملک بیسویں صدی کے نصف آخر کی علمی و ادبی کہکشاں کے جگمگ کرتے ستارے ہیں۔ بالخصوص خطہ پوٹھوہار کی علمی و ادبی روایت میں ان کا بھرپور اور جاندار حصہ پورے شواہد کے ساتھ عیاں دبیاں ہے۔ ان کے ذکر کے بغیر یہ روداد مکمل ہی نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ادبی مؤرخ اور نقاد ان کے نام سے صرف نظر کر سکتا ہے۔ عزیز ملک کے علمی و ادبی کارناموں کا اعتراف اس دور کے کئی مقتدر اہل قلم نے التزام کے ساتھ کیا ہے۔ ان میں ممتاز مفتی، سید ضمیر جعفری، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر وحید قریشی، شاہد احمد دہلوی اور یوسف ظفر کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ عزیز ملک کا نام اپنے عہد کے ادبی منظر نامے میں پوری اہمیت اور شد و مد کے ساتھ موجود ہے۔ خطہ پوٹھوہار کے نامور شعرا آغا صدیق حسن ضیا اور انجم رضوانی ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ جن دیگر قد آور اہل قلم کے ساتھ عزیز ملک کی دوستی اور رفاقت کا گہرا رشتہ استوار ہوا، اُن میں باقی صدیقی، ممتاز مفتی، سید ضمیر جعفری، حفیظ جالندھری، جگن ناتھ آزاد، کرتار سنگھ دگل، برج لعل رعنا، صادق حسین، منصور قیصر نذیر شیخ، حافظ مظہر الدین، سید فیضی، بریگیڈیئر (ر) گلزار احمد، سید عطا حسین کلیم، امین راحت چغتائی اور کئی دوسرے نامور شعرا اور ادیب شامل ہیں۔ عزیز ملک کا شمار حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اختر ہوشیار پوری، اکرام قمر اور محمد فاضل کے ساتھ مل کر حلقہ کی بنیاد رکھی اور یکے بعد دیگرے دو مرتبہ اس کے سیکریٹری بھی رہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایک ادبی تنظیم "انجمن تعمیر ادب" کے نام سے بھی قائم کی۔

راولپنڈی میں ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۵ء کا عبد انجمن ترقی اردو کی بھرپور سرگرمیوں کا دور تھا۔ اس کے ادبی جلسوں میں جو نثر نگار ابھر کر سامنے آئے، ان میں سرفہرست نام عزیز ملک کا تھا۔ بعد ازاں ان کی نثر نگاری

کے جوبن کا عہد حلقہ ارباب ذوق کے عروج کا دور تھا۔ وہ راولپنڈی، اسلام آبادی نہیں خطہ پوٹھوہار کی نثری روایت کے سرخیل گنے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی تین کتابوں "زیر نقاب کیا ہے؟ "راول دیس، اور" میں نے کہا" نے اپنے دور کے ادبی حلقوں میں تہلکہ مچادیا تھا۔ زاہد حسن چغتائی نے تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول "سوانح اور شخصیت، باب دوم: آثار، ذہنی وفکری پس منظر اور علمی وادبی فضا، باب سوم: عزیز ملک بحیثیت صوفی، دوستیاں اور رفاقتیں اور غیر مطبوعہ خطوط بنام عزیز ملک"، باب چہارم" عزیز ملک کی نثر نگاری، انشا پردازی اور پاکستانیت کے نقوش"، باب پنجم "عزیز ملک کی تاریخ نگاری، سیرت نگاری، سوانح نگاری، شخصیت نگاری، خاکہ نگاری، افسانہ نگاری اور تحقیق وتنقید"۔ اس باب میں عزیز ملک کی تمام کتابوں "راول دیس، پوٹھوہار، پاکستان سے پہلے، خون حسین، تذکار نبی، مکاتیب نبوی، سید المرسلین، بلال حبشی، مرد قلندر، کارواں، عزیز ملک کے افسانے، صحافت اور تحریک آزادی، حفیظ جالندھری: شخصیت اور فن اور غوث پاک "کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں عزیز ملک کی منفرد نثر نگاری اور انشا پردازی کی ذیل میں آنے والی تین کتابوں راول دیس، زیر نقاب کیا ہے؟ اور میں نے کہا" کا گہرا ناقدانہ جائزہ بھی لیا گیا۔ انہوں نے اس مقالے میں عزیز ملک کی غیر مطبوعہ یادداشتوں، سلسلہ وار مضامین، غیر مطبوعہ خطوط بنام عزیز ملک اور غیر مدون مضامین کے علاوہ صحافتی تحریروں اور ریڈیو تقاریر وفیچرز کی اصول تحقیق کے مطابق فہرستیں بھی مرتب کی ہیں۔ آخر میں مقالہ نگار کی طرف سے تحقیقی مقالے کا محاکمہ کیا گیا اور عزیز ملک کے ادبی مقام ومرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی۔

تاریخ نگاری کے حوالے سے عزیز ملک نے اپنی تحریروں میں پاکستانیت کی بازیافت پورے حقائق و شواہد کے ساتھ کی۔ ان کے نظام فکر میں تصورات اقبال کی روشنی اور بصیرت پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تحقیقی و تخلیقی وجدان میں پاکستان اور پاکستانیت کی ہر دو جہتیں ہمہ وقت پوری تاریخی بصیرت کے ساتھ جگمگ کرتی رہیں۔ انہوں نے تحریک مجاہدین سمیت برصغیر میں روبہ عمل ہر اسلامی تحریک سے دینی حمیت اور قومی دردمندی کے جوہر کشید کئے۔ عزیز ملک کے بزرگوں نے تحریک مجاہدین اور ریشمی رومال تحریک میں عملاً حصہ لیا تھا۔ چنانچہ ان کے قلمی وفکری باطن میں یہ روداد تاریخ کی سچائی بن کر تازندگی روشن رہی۔ مقالہ نگار نے عزیز ملک کی صوفیانہ اور روحانی طرز زندگی کا احوال بھی تحقیقی انداز میں رقم کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چار ہم عصر اہل قلم یوسف ظفر، ممتاز مفتی، اشفاق احمد اور

قدرت اللہ شہاب کے صوفیانہ انداز فکر کے تقابل کی روشنی میں بعض حقائق منظر عام پر لانے کی کوشش کی ،زاہد حسن چغتائی لکھتے ہیں:

"عزیز ملک نہ صرف یہ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر کے نامور نثر نگار اور انشا
پرداز ہیں بلکہ تاریخ نگاری، سیرت نگاری، شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری میں بھی
اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں"۔(20)

مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی نثر ایک طرف کلاسیکی روایت کے ساتھ جڑی ہے جبکہ دوسری جانب جدید طرز نگارش کی تمام خوبیوں کی بھی حامل ہے۔ افسانہ ہو یا انشائی ادب وہ اپنے نثری ہنر کو کمال خوبی سے برتنا جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی حقیقت نگاری کا عنصر توانا صورت میں ملتا ہے جبکہ کئی تحریروں میں ماورائی انداز اضطراری طور پر در آتا ہے۔ سوانح نگاری، شخصیت نگاری اور خاکہ نگاری میں بھی وہ ایسی گل کاریاں اور موشگافیاں دکھاتے ہیں کہ سچائی، خلوص اور صاف گوئی کے اوصاف سر چڑھ کر بولنے لگتے ہیں۔

موضوع مقالہ: "عطاء الحق قاسمی: حیات وخدمات"

مقالہ نگار: مظہر اقبال، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر وحید الرحمان خان، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

عہد ساز مزاح نگار، کالم نویس، سفر نامہ نگار، خاکہ نگار، شاعر اور ڈراما نگار عطاء الحق قاسمی کا تخلیقی سفر نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ اتنا طویل عرصہ مسلسل اور معیاری تخلیقات پیش کرنے اور اپنے قلم کی شگفتگی کو روزِ اول کی طرح برقرار رکھنے کا ہنر جاننے والا یقینا ایک اعلیٰ پائے کا تخلیق کار ہی ہو سکتا ہے۔ زیر نظر تحقیقی وتنقیدی کاوش عطاء الحق قاسمی کی حیات وخدمات کے حوالے سے ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی زندگی اور شخصیت کا باب ایسے ایک تخلیق کار کا قصہ حیات ہے جس نے اپنی بہترین طنزیہ ومزاحیہ صلاحیتوں کے طفیل اُردو کی تقریباً تمام اصنافِ نثر کو شگفتگی بخشی۔ آپ یکم فروری ۱۹۴۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے وقت ان کی عمر ساڑھے چار برس تھی۔ قیام پاکستان پر وہ امرتسر سے ہجرت کر کے اپنی ننھیالی قصبے وزیر آباد منتقل ہو گئے تھے۔ آج کی بارونق تحصیل وزیر آباد اس وقت ایک چھوٹا سا پرسکون قصبہ تھا۔ جہاں ان کے بیشتر رشتے دار آباد تھے۔ ان کے بچپن کے یادگار دن وزیر آباد میں ہی گزرے۔ وہیں سے انھوں نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ جب وہ چھٹی کے طالب علم تھے تو وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ لاہور

منتقل ہو گئے جہاں پر ان کے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمی ماڈل ٹاؤن کی جامع مسجد میں بطور امام و خطیب ذمہ داری سنبھال چکے تھے۔ وہ چھٹی جماعت میں ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوئے اور وہیں سے ۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف اے کا امتحان ایم اے او کالج سے ۱۹۶۲ء میں اور بی اے کا امتحان بھی ۱۹۶۴ء میں یہیں سے پاس کیا۔ ۱۹۶۴ء میں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے لیے داخل ہوئے جو ایک پرچے میں ناکامی کے بعد ۱۹۶۸ء میں پاس کیا۔

عطاء الحق قاسمی سکول کے زمانے میں لکھنے لکھانے کے ہنر سے آشنا ہو چکے تھے۔ جبکہ کالج کی سطح پر وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی کرنے لگے تھے۔ نثر میں کالم نگاری کی صورت میں طبع آزمائی، جب کہ شعر گوئی میں پر مزاح زور آزمائی کا سلسلہ ہجو کی صورت میں کامیابی سے رواں دواں ہونے لگا۔ احمد ندیم قاسمی کے " فنون" سے ان کے باقاعدہ ادبی سفر کی بنیاد پڑتی ہے اور ادبی حلقوں میں ان کے طرزِ ادا کو تحسین کی نظر سے دیکھا جانے لگتا ہے۔ وہ "روزن دیوار" کے عنوان سے روزنامہ "نوائے وقت" اور پھر روزنامہ " جنگ" سے منسلک ہو کر کئی دہائیوں سے کالم لکھ رہے ہیں۔ اُردو کالم نگاری کے میدان میں وہ اس قابل رشک مقام پر فائز ہیں جو عہد رواں میں کسی بھی کالم نگار کو حاصل نہیں ہے۔

مذکورہ بالا مقالے کے مطالعاتی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے سفر ناموں "شوق آوارگی، گوروں کے دیس میں، دلی دور است اور "دنیا خوبصورت ہے" میں اپنے تجربات اور مشاہدات کے اظہار میں ڈھکے چھپے الفاظ کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھیں مِن وعن پیش کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا سفر ناموں میں "شوق آوارگی" ان کے امریکہ اور یورپ کے سفر کی مشتمل ہے۔ اس سفر نامے میں خوش گوار ملاقاتوں کا احوال بھی رقم ہے اور جدائیوں کے عذاب کی کہانی بھی بیان ہوئی ہے۔ قاسمی نے اہل فرہنگ کی سرزمین پر چکا چوند روشنیوں کے پس پردہ تاریکیوں کا مشاہدہ جس طرح گہرائی سے کیا اسی طرح اسے سچائی سے حوالہ قلم بھی کیا ہے۔ وہ منافقت کے میک اپ میں چہرہ چھپائے گوروں کے سیاہ کردار کو سلیقے سے سامنے لائے ہیں۔ آزادی کے نام پر قید در قید اور دربدر ہوئی بنتِ حوا کی داستانِ الم کی جھلکیاں کہیں کہیں سفر نامے کے شگفتہ اور پر مسرت ماحول کو سوگوار بنا دیتی ہیں۔

انھوں نے پی ٹی وی کے لیے جو ڈرامے لکھے ان میں سماجی، معاشرتی اور معاشی زندگی سے متعلق حقیقی مسائل کی تصویر کشی بہترین انداز میں کی گئی ہے۔ "شب دیگ اور خواجہ اینڈ سن" لکھ کر قاسمی صاحب نے پنجابی معاشرت خصوصاً متوسط طبقہ کے گھمبیر مسائل کو اجاگر کرنے میں اپنا قلمی کردار احسن طریقے نبھایا ہے۔

ان ڈراموں کے علاوہ انھوں نے " اپنے پرائے، علی بابا چالیس چور، آپ کا خادم، حویلی، ہر فن مولا، آئینہ اور "سارے گامے" جیسے یادگار ڈرامے لکھ کر نہ صرف زندگی کے تلخ حقائق کا نقشہ ڈرامائی صورت میں ہنر مندی سے کھینچا ہے بلکہ ان ڈراموں میں "انکل کیوں"، کاکا منا،، شیدا ٹلی" جیسے یادگار ڈرامائی کرداروں کی پیش کش سے طنز و مزاح کے عملی نمونے پیش کر کے نہ صرف رنجیدہ دلوں میں شگفتگی کے پھول کھلائے ہیں بلکہ معاشرے کے بدکردار عناصر کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔ مقالہ نگار مظہر اقبا نے قاسمی صاحب کی ادبی خدمات کے زمرے میں الحمرا آرٹ کونسل کی چیئر مین شپ کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کی سربراہی سے قبل اس ادارے کا سٹیج محض رقص و سرور کے علاوہ چند چھوٹی موٹی سماجی و ثقافتی تقاریب تک محدود تھا۔ ان کے دور میں یہ ادارہ علم و ادب اور ثقافت کی ترویج و ترقی کا علم بردار بن کر سامنے آیا۔ کئی عالمی، ادبی اور ثقافتی کانفرنسز کا انعقاد ہوا۔ ان کی سربراہی میں یہ ادارہ ادب و ثقافت کا مرکز بن گیا۔

قاسمی نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں جہاں بطور کالم نویس، سفر نامہ نگار، ڈراما اور خاکہ نگار اپنی فنی صلاحیتوں کو آزمایا ہے وہیں بطور شاعر بھی انھوں نے اپنے جذبات کا خوب صورت اظہار پیش کیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "ملاقاتیں ادھوری ہیں" دلنشیں و پر تاثیر حمدیہ و نعتیہ کلام اور بہترین غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اس خوب صورت شعری مجموعے کا تجزیہ قاسمی صاحب کی شاعرانہ خوبیوں کے ثبوت کو سامنے لاتا ہے۔ عطا صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے مجلہ "معاصر انٹر نیشنل" کا ذکر بھی مقالہ نگار نے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ "معاصر انٹر نیشنل" کا اجرا اکتوبر ۱۹۷۹ء میں ہوا۔ یوں اس کی علمی، ادبی اور تحقیقی و تنقیدی میدان میں خدمات کا دائرہ چالیس برس سے زائد عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ بطور مدیر "معاصر "عطاء الحق قاسمی نے نئے لکھنے والوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ نیز عہد کے نامور ادبا و شعرا کی تخلیقات کو باقاعدگی سے شائع کر کے اردو کے دائرہ ادب کو وسعت بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مقالے کے آخر میں مظہر اقبال نے قاسمی صاحب کے بطور اُستادِ ادب اردو علمی و ادبی خدمت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق عطاء الحق قاسمی نے اپنی ادبی مصروفیات کے باوجود تین دہائیوں تک اپنی علمی اور ادبی قابلیت سے طالبانِ علم و دانش کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ اُن کی ادبی خدمات اور انفرادیت کو ایک زمانے نے تسلیم کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں، ان کی تخلیقات میں مزاح کی چاشنی اور طنز کی لطافت کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بطور نثر نگار انھوں نے اپنے کالموں، سفر ناموں، خاکوں اور ڈراموں میں کھل کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ نثر نگار ہی نہیں، بحیثیت شاعر بھی وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں

ہیں۔ ان کے نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر محیط شگفتہ قلمی سفر کامیابیوں اور کامرانیوں سے عبارت ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مسائل زمانہ کو بھرپور اُجاگر کیا ہے۔ اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف متعدد مرتبہ قومی ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر بھی کیا جا چکا ہے۔ درجنوں اعزازات و مراتب کے حقدار ٹھہرنے والے قاسمی صاحب نے اردو کے فکاہیہ ادب میں معیار اور مقدار کے حوالے سے ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

موضوع مقالہ: "جابر علی سید: حیات اور ادبی خدمات"

مقالہ نگار: انیلہ سلیم، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

جابر علی سید کثیر الجہات ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ تنقید، عروض، لسانیات اور شاعری پر تنقید کے ساتھ ساتھ اقبال شناسی کے میدان میں فنی رموز کی عقدہ کشائی میں انھیں اختصاص حاصل ہے۔ عروض و لسانی مسائل پر بحث و تمحیص میں انھیں استناد کا درجہ حاصل رہا۔ تنقید کے ضمن میں جابر علی ایک خاص اصول یعنی "لبرل ازم" کے قائل تھے۔ انھوں نے لسانیات اور لغت نویسی پر بھی وقیع کام کیا۔ اسی طرح اقبالیات کے سلسلے میں انھوں نے کلام اقبال کا جس طرح فنی مطالعہ پیش کیا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے۔ شاعری میں انھوں نے کلاسیکی اور جدید اصناف سخن کے ساتھ مغربی شاعری کے منظوم تراجم پر بھی طبع آزمائی کی۔ جابر علی سید ادبی تنقید میں کسی گروہ سے وابستہ نہیں تھے اور آزادانہ تنقید کے حامی تھے۔ جابر علی سید کی گوناگوں حیثیات کو اردو کے ادبی منظر نامے پر پرکھنے اور ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے انیلا سلیم نے اُن کی حیات اور ادبی خدمات کو اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کا موضوع بنایا۔

اس ضمن میں ان کی تنقید، لسانیات، عروض، اقبالیات اور شاعری کی تحقیق و تنقید کی کاوش کی گئی تاکہ ان کی ہر ادبی جہت کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ کر کے اردو ادب میں ان کا مقام و مرتبہ نمایاں کیا جا سکے۔ جابر علی سید کے دور کے ناقدین میں سید عابد علی عابد، وارث سرہندی، ابوالخیر کشفی، حمید عبد المالک، عزیز حامد مدنی، محمد کاظم، عرش صدیقی، فہیم جوزی، خالد احمد، علی عباس جلال پوری اور ڈاکٹر اسلم انصاری قابل ذکر ہیں۔ جابر علی سید نے اپنے منفرد انداز تنقید اور نئے تنقیدی سانچوں کے ذریعے اپنی پہچان بنائی۔ پیش نظر مقالے

جابر علی سید: حیات اور ادبی خدمات کو انیلا سلیم نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب "جابر علی سید: سوانح اور شخصیت" میں جابر علی سید کی سوانح اور شخصیت کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ جابر علی سید کے سوانحی نقوش میں ان کا خاندانی پس منظر، تعلیمی و ادبی سفر، اساتذہ کرام سے فیض یابی، مختلف اداروں میں بطور استاد ملازمت، شادی، اولاد اور جبری ریٹائرمنٹ پر تحقیق کو اس باب کے حصہ اول کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں شخصیت کے زیر عنوان ان کے شخصی کوائف نمایاں کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں جابر علی سید کے اعزہ و اقربا سے ملاقات اور مصاحبات کے ساتھ ساتھ ان کی وفات پر ملتان اور لاہور کے اخبارات میں شایع ہونے والے تعزیتی کالموں، تعزیتی ریفرنسوں کی رودادوں، اخبارات کے ادبی اڈیشنوں سے مدد لی گئی ہے، خصوصاً جابر علی سید کی اہلیہ شکیلہ اختر بخاری، فرزندان عقیل جابر، شکیل جابر اور دختر نغمہ جابر سے مصاحبے کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جابر علی سید کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ ادبی و تنقیدی کاوشوں کی مختصر فہرست کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

دوسرا باب "جابر علی سید بحیثیت نقاد" کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ادبی دنیا میں جابر صاحب کی ناقدانہ حیثیت ممتاز ہے۔ اس باب میں تحقیق و تنقید پر جابر علی سید کی گہری نظر کا مطالعہ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتب، مقالات اور تبصروں کے علاوہ مختلف ادبا و ناقدین پر کیے گئے تبصروں اور ادبی اعتراضات کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ تنقید میں جابر علی سید نے "لبرل ازم" کو رواج دیا اور اس کے تحت ہر طرح کی ادبی گروہ بندی سے آزادی کا عَلم بلند کیا۔ اس باب میں لبرل اور آزادانہ روش تنقید سے مشروط جابر علی سید کے تنقیدی سرمائے سے ان کے تنقیدی نظریات کی گرہ کشائی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں باب کے آغاز میں جابر علی سید کے تنقیدی مجموعوں میں شامل مضامین پر تبصرے کے ساتھ ساتھ تحقیقی نکات کا اضافہ کیا گیا ہے۔ سید عابد علی عابد کی معرکتہ الآرا تصنیف "اصول انتقاد ادبیات" پر جابر علی سید نے نہایت عرق ریزی سے ایک تنقیدی جائزہ رقم کیا تھا جو ان کے غیر مطبوعہ ادبی آثار کا حصہ تھا۔ جابر علی سید مرحوم کے اہل خانہ کے اصرار پر انیلا سلیم نے مقالے کی تکمیل کے دوران ہی اس مسودے کی ترتیب، تدوین اور تحشیہ نگاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس باب میں مذکور مسودے پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ادبی یادداشتوں پر مبنی ان کی کتاب "ایک ادبی خود نوشت" جو جابر علی سید کی ادبی تشکیل کے ادوار پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ واضح تنقیدی اشارے کرتی ہے، اسے بھی ان کی تنقیدی حیثیت میں شامل رکھا گیا ہے۔

مقالے کا تیسرا باب "جابر علی سید بحیثیت اقبال شناس" ہے۔ جابر علی سید نے "اقبال کا فنی ارتقا اور اقبال ایک مطالعہ" کے زیر عنوان اقبالیاتی مجموعوں میں اقبال کی شاعری پر فکری اور خاص طور پر فنی حوالے سے تنقید کی ہے۔ اس باب میں ان اصولوں کے استخراج کی کوشش کی گئی ہے جن کے تحت جابر علی سید نے کلامِ اقبال کے فنی رموز کی عقدہ کشائی کی ہے۔ اپنی اولین صورت میں یہ اقبالیاتی مضامین کن ادبی پرچوں میں شائع ہوئے اس تحقیق کو بھی باب مذکور کا حصہ بنایا گیا ہے۔ باب کا اہم حصہ ان مباحث پر مبنی ہے جن میں اقبالیات کے فنی موضوعات میں جابر علی سید نے اولیت پائی۔ باب چہارم "جابر علی سید بحیثیت ماہر لسانیات لغت و عروض" کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ جابر علی سید کی ان تینوں حیثیات پر مبنی مضامین دیگر کتب کے ساتھ ساتھ لسانی و عروضی مقالات اور کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ اس باب کا حصہ ہے۔ متذکرہ باب میں ان مضامین کے علاوہ فنون اور اخبار اردو میں سلسلہ وار شائع ہونے والے لسانی مباحث کو بھی شامل کیا گیا ہے ۔ اس باب میں لغات کے تجزیے میں اصل لغات کے اقتباسات کے ساتھ جابر علی سید کی آرا کو پیش کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عروض و لسانیات کے حوالے سے اردو تنقید کے قلیل سرمائے میں جابر علی سید کی اس تنقیدی و تحقیقی کاوش کے تجزیے سے ان کا مرتبہ عروض، لسانیات اور لغت کی ترتیب کے میدان میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جابر علی سید ادبی نقاد اور محقق کی حیثیت سے زیادہ جانے جاتے ہیں، تاہم ان کا ایک شعری مجموعہ "موج آہنگ" کے عنوان سے موجود ہے جو ان کی شاعرانہ حیثیت کو سامنے لاتا ہے۔ مقالہ نگار نے مقالے کے باب پنجم میں "جابر علی سید بحیثیت شاعر" کے زیر عنوان جابر علی سید کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے اس مجموعے میں غزل، نظم، رباعی، مستزاد، تضمینات کے علاوہ مغربی شاعری کے منظوم تراجم موجود ہیں۔ وہ چونکہ اپنے خاص تنقیدی و عروضی اصول رکھتے تھے لہٰذا ان کی شاعری میں ان اصولوں کی تلاش بھی اس باب کا حصہ ہے۔ جابر علی سید کا یہ شعری مجموعہ ان کی وفات کے تقریباً تیرہ سال بعد شائع ہوا لیکن یہ ان کی مکمل شاعری کا احاطہ نہیں کرتا اور ان کی مکمل شعری تدوین کا تقاضا کرتا ہے۔ جابر علی سید کی سوانح و شخصیت اور ان کی ادبی خدمات پر مبنی اس کاوش سے جابر علی سید کے ادبی و تنقیدی مقام کا تعین کرنے میں مدد لی جاسکے گی۔

موضوع مقالہ: "رحمان مذنب: احوال و آثار (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)"

مقالہ نگار: رابعہ عرفان، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ضیاء الحسن، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

رحمان مذنب کا شمار اردو ادب کے بلند پایہ مصنفین میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے شاید ہی کوئی موضوع تشنہ رہا ہو، البتہ انہوں نے افسانے کی صنف میں خاصی شہرت حاصل کی۔ ان کے دیگر موضوعات میں ناول، ڈراما، اساطیری علوم، سوشل انتھروپولوجی اور پنجابی ادب شامل تھے۔ وہ بنیادی پر تخلیقی مصنف تھے ۔ موضوعات میں وسعت اور تنوع کی بدولت انہوں نے اردو ادب میں اپنا ایک مستقل مقام بنالیا۔ ان کی نثری تصانیف ایک دبستان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ناول "باسی گلی" اور "گل بدن" ان کے اہم ناول ہیں۔ "گل بدن" میں محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ناول کا موضوع خیالی دنیا سے نہیں بلکہ یہ لاہور شہر کے باسیوں کی کہانی ہے۔ یہ ناول زندگی کے حقیقی اسرار کا غماز ہے۔ گل بدن میں طوائف کے پیشے کو خیر باد کہنے والی عورت کی سماجی حیثیت اور اس کے حالات و مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کے ذریعے طوائف کے پیشے کو چھوڑ دینے والی عورت کی نفسیات، اس کے جذبات واحساسات، اس کی چالاکی و مکاری اور ذہنی گھٹن کا اندازہ ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمان مذنب نے اپنے افسانوں کی بنیاد حقیقت پر رکھی۔ ان کا کل افسانوی سرمایہ طوائف اور اس کے ماحول کے متعلق ہے۔ ان کے پیش نظر قاری کے سامنے محض طوائف اور اس کے ماحول کو بیان کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ انہوں نے عورت کی ذات اور اس کی زندگی سے وابستہ مسائل کو موضوع بنایا۔ رحمان مذنب نے سعادت حسن منٹو کی طرح معاشرے کے دھتکارے ہوئے بدنام طبقے کے مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں وہ فنی پختگی موجود ہے جس کے باعث اردو افسانے کا وقار بلند ہوا۔ ان کا افسانوی فن قدیم اور جدید معیارات کو بہترین انداز میں پیش کرتا ہے۔ رابعہ عرفان نے اپنے مقالے میں رحمان مذنب کی ڈراما نگاری کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ ڈرامے کے حوالے سے ان کی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی البتہ مختلف رسائل میں شائع ہونے والے ڈراموں کی وجہ سے بطور ڈراما نگاران کی ادبی اہمیت مسلم ہے۔ ان کے ڈراموں میں ایک اچھے ڈرامے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ رحمان مذنب کی ترجمہ نگاری کو موضوع بناتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> "رحمان مذنب کو مطالعہ کرنے کا بے حد شوق تھا۔ مختلف موضوعات کا مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے دوسری زبانوں کے نادر مضامین کو اُردو ادب میں منتقل کیا۔ یوں انہوں نے ترجمہ نگاری کے میدان میں اپنی علمی قابلیت کی دھاک بٹھائی ۔ انہوں نے ترجمہ کرتے ہوئے تراجم کے آہنگ کو برقرار رکھنے اور محض

معروضی طور پر ترجمہ کرنے کی بجائے زیر ترجمہ تحریر کی روح کو اپنے فن میں ڈھالا ہے ۔ یوں ان کے تراجم میں اصل تحریر کی فضا اور آہنگ نظر آتا ہے"۔(21)

رحمان مذنب نے جس خوب صورتی سے اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ اسی چابک دستی سے انہوں نے بچوں کے لیے تفریح اور سبق آموزی کے ذرائع بھی فراہم کیے ہیں۔ دیگر نثری اصناف کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کے حوالے سے بھی رحمان مذنب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دیگر تصنیفی امور کے حوالے سے رحمان مذنب بطور کہانی نویس، مضمون نگار، تبصرہ نگار، خاکہ نگار اور سفر نامہ نگار کے بھی ادبی مقام رکھتے ہیں مگر افسانوی ادب اور اساطیری علوم کے حوالے سے لکھی گئی کتب کی بدولت ان کا ادبی مقام و مرتبہ نمایاں ہے۔

رابعہ عرفان کے اس مقالے میں آٹھ ابواب شامل ہیں۔ باب اول میں رحمان مذنب کی سوانح، شخصیت کے علاوہ ان کی تصانیف کا تعارف موجود ہے۔ رحمان مذنب کی ولادت سے آغاز کرتے ہوئے ان کی وفات تک کے تسلسل کو پیش کیا گیا ہے ۔ اس ضمن میں ان کے خاندانی پس منظر، والدین، بچپن، جوانی، مشاغل، علمی و ادبی تفصیلات کے حوالے سے تمام اہم معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ شخصیت کے حوالے سے ان کی مختلف جہات، عادات و مزاج، حلقہ احباب اور دیگر خصوصیات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تصانیف کے جائزے میں افسانہ، ناول، ڈراما، تراجم، بچوں کے ادب کے حوالے سے تصانیف اور متفرق ادبی جہات کا الگ الگ مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کے باب دوم میں جنس، ادب اور فحاشی کے مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا ہے ۔ اس باب کو انہوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ الف میں جنس، جنسیات کا تاریخی پس منظر، جنس اور نفسیات، جنس اور اخلاقیات، اسلام اور جنس، ادب اور آرٹ، اردو ادب اور فحاشی و عریانی کے مسائل، اردو ادب اور جنسی کلچر اور جنسی ادب کے موضوعات ور جحانات پر بحث کی گئی ہے۔

باب دوم کے حصہ "ب" میں مغرب کے چند اہم مفکرین" ڈی ایچ لارنس، ستاں دال اور فرائیڈ" کے جنسی نقطہ نظر کو بیان کیا گیا ہے۔ حصہ "ج" میں افسانوی ادب میں جنسی اظہار کی روایت کو بیان کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، عزیز احمد، عصمت چغتائی، بانو قدسیہ اور رحمان مذنب کے جنسی نقطہ نظر کو صراحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ باب سوم " رحمان مذنب بحیثیت ناول نگار " میں ناول نگاری کے فن و روایت کے ساتھ ساتھ رحمان مذنب کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے

ناول "باسی گلی" اور "گل بدن" کا الگ الگ فکری و فنی اور اسلوبیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم "رحمان مذنب بحیثیت افسانہ نگار" میں افسانے کے فن و روایت کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوی مجموعوں کا موضوعاتی و فکری اور اسلوبیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب پنجم "رحمان مذنب بحیثیت ڈراما نگار" میں ڈراما نگاری کے فن و روایت کو موضوع بحث بنانے کے علاوہ ڈرامے کی تاریخ کے حوالے سے رحمان مذنب کی کتاب "ڈرامہ اور تھیٹر کی عالمی تاریخ" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں رحمان مذنب کے ڈراموں کا جائزہ بھی شامل ہے۔

باب ششم "رحمان مذنب بحیثیت مترجم" میں رحمان مذنب کے تراجم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں ان کے تراجم کے فنی اور معنوی کمالات اُجاگر کیے گئے ہیں۔ باب ہفتم میں بچوں کے ادب کے حوالے سے رحمان مذنب کی تصانیف کو موضوع بحث بنانے کے علاوہ بچوں کے ادب کی ضرورت و اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخری باب میں رحمان مذنب کے دیگر تصنیفی کاموں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے حصہ "الف" میں ان کی تین کتابوں "داستان آب و گل، جادو اور جادو کی رسمیں اور دین ساحری، دیومالا اور اسلام" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی نثری اصناف کہانی، تبصرہ، خاکہ اور سفر نامے کے فن و روایت پر مختصر بات کرتے ہوئے مذکورہ بالا اصناف کے حوالے سے رحمان مذنب کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں کتابیات درج ہیں۔ زیر نظر مقالے میں جن کتب و رسائل، اخبارات اور دیگر ماخذ کو حوالے کا درجہ حاصل ہے۔ انہیں کتابیات کے ضمن میں ترتیب دے کر پیش کر دیا گیا ہے۔ زیر نظر مقالے میں مقالہ نگار نے تحقیق کے جملہ اصول اور ضوابط کو بروئے کار لاتے ہوئے ممکنہ حد تک کوشش کی ہے کہ رحمان مذنب کی شخصیت و فن کو مکمل طور پر پیش کر دیا جائے۔

موضوع مقالہ: "ساہیوال کی شعری روایت میں گوہر ہوشیارپوری کی خدمات"

مقالہ نگار: محمد اسحاق، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر عقیلہ شاہین، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

خالق کائنات نے اس دنیا کو لالہ زاروں، سبزہ زاروں اور کوہساروں سے مزین کیا ہے۔ ہمیں لق و دق صحرا، جنگلات، چشموں، ندی نالوں اور دریاؤں کی شکل میں اس کی مرصع کاری نظر آتی ہے۔ پانی کا ہر قطرہ اونچائی سے گہرائی کی طرف بھاگتا ہوا بے چین نظر آتا ہے اور اس کی بے چینی اس وقت چین میں بدلتی ہے جب یہ سمندر کی وسعتوں میں گم ہو کر خود سمندر کہلانے لگتا ہے۔ انسانی فکر اور تخیل کی دنیا بھی ایک بے

کر اس سمندر لا محدود اور وسیع و غیر مرئی چیز ہے۔ اس میں سفر کرنے کے لیے کسی مادی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے اس سمندر میں فکر و تخیل کے وہ جزیرے بنتے اور ختم ہوتے ہیں کہ ان کی دریافت سے مادی دنیا کے پیکر میں جدت و نمو کے رنگ نظر آتے ہیں، یہ رنگ فلسفہ بن کر تو کبھی فنون لطیفہ کے مختلف فکری دھارے لیے ہمارے قلب و اذہان کا سرمایہ بنتے ہیں۔ ان سے سائنسدان، فلسفی اور شاعر و ادیب لوگ مختلف حلقوں میں دنیا اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہم خیال اور ہم مزاج لوگوں کی کہکشائیں اور دبستانوں کو سجاتے جاتے ہیں۔ انہیں دبستانوں میں مختلف زبانوں اور اصناف کے ذریعے مختلف انداز میں ادبا و شعرا کائناتی سچائیوں کی تلاش کرتے ہیں ان اپنے فن پاروں سے معاشرتی نمو میں اپنا مثبت کردار پیش کرتے ہیں۔

اردو کے عظیم مراکز جو کہ اپنے دامن میں تاریخی و تہذیبی، معاشرتی و علمی اور مذہبی جواہر کے خزینے لیے ہوئے نظر آتے ہیں ان میں برصغیر پاک و ہند کے چھوٹے بڑے ادبی دبستانوں کی بہت بڑی تعداد ہے جنھوں نے مقامی زبان و ادب کے ساتھ اردو زبان و ادب کے لیے گراں قدر خدمات پیش کیں جس طرح محققین ان مراکز کے چہروں سے وقت کی گرد کو جھاڑ کر صاف شفاف چہرے سامنے لا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ برصغیر پاک و ہند میں اردو کے معروف دبستانوں سے نکل کر دوسرے دبستانوں تک پھیل جاتا ہے۔ دنیائے اردو دہلی، لکھنو، لاہور، کراچی کے ساتھ بہاول پور، سرگودھا، ملتان اور ساہیوال جیسے ادبی دبستانوں کی خدمات سے روشناس ہو رہی ہے جن کا کردار قابل فخر اور قابل تقلید ہے۔

زیر تجزیہ مقالہ میں مقالہ نگار محمد اسحاق نے ساہیوال کی قدیم شعری روایت کو پیش کر کے یہ بات سائنٹیفک انداز میں دنیا کے سامنے لانے کی کاوش کی ہے کہ اس خطہ کے تہذیبی آثار دنیا کے قدیم ترین تہذیبی آثار ہیں، ہڑپہ کے کھنڈرات سے ملنے والی تختیوں کا تذکرہ، ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق دنیا میں اولین تحریری روایت کا ثبوت ہیں۔ اس خطے میں "بابا فرید" جیسی عظیم روحانی شخصیت جو اردو کے پہلے اور پنجابی شاعری کے بابا آدم مانے جاتے ہیں کا وجود اس خطہ ساہیوال کی شعری روایت میں اولین تقدم کا خوشگوار اور قابل فخر حصہ بنتا ہے۔ اس امر کو مقالہ نگار نے قابل ستائش احساس کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ "وارث شاہ "کا منظوم کلام "ہیر" یہاں کی شعری روایت کے بڑے پن کا احساس دلاتا ہے۔ ساہیوال میں اردو نظم کی روایت میں مجید امجد کا حوالہ دنیائے اردو میں اپنی اہمیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اس مقالے میں ساہیوال میں اردو غزل کی روایت اور گوہر ہوشیار پوری کی خدمات کو سائنٹیفک انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ ساہیوال کے معروف شعری حلقوں کے سفر کو عہد بہ عہد لڑی میں پرو کر پیش کیا گیا ہے جس سے یہاں کی شعری روایت قاری کے سامنے اپنی پوری عمر اور قد و قامت سے نظر آتی ہے۔

گوہر ہوشیار پوری نے ساہیوال کی شعری روایت کو جس اخلاص کے ساتھ آگے بڑھایا اور اسے قومی سطح پر پاکستان ٹیلی ویژن لاہور، دار الحکومت اسلام آباد، ملتان اور قرب و جوار کے شعری حلقوں سے جوڑنے کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کی آٹھ شعری تخلیقات، غیر مطبوعہ کلام اور مکتوبات نے ساہیوال کے ادبی و شعری حلقوں میں احساس تفاخر اور اعتماد سازی کا کام دیا ہے۔ ان کی شخصیت و فن میں حقیقی صوفی شاعر کی زندگی یوں پیش ہوتی ہے کہ عام قاری اور آج کا شاعر و ادیب کامیاب زندگی گزارنے کے مختلف انداز گوہر کی زندگی سے سیکھتا ہے۔ درج بالا مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالے کے ذریعے پہلی بار ساہیوال کی شعری روایت اور اس کے فروغ میں گوہر کی خدمات کو تحقیقی انداز میں محفوظ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس مقالہ کے ذریعے لاہور اور ملتان کے درمیان علمی ادبی روابط کو پیش کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔ گوہر ہوشیار پوری کی شعری کائنات اور جہات کو نہ صرف تحقیقی و تنقیدی انداز میں پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کی ساہیوال کی شعری روایت میں خدمات کو پہلی دفعہ محفوظ کیا گیا ہے۔ گوہر ہوشیار پوری کے غیر مطبوعہ کام تک رسائی حاصل کر کے اسے محفوظ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول ساہیوال کی شعری روایت ہے جس میں تاریخی شواہد کی روشنی میں اس خطہ کی تہذیبی، تاریخی، علمی و ادبی اہمیت کو پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم گوہر ہوشیار پوری کی شخصیت و سوانح پہ مبنی ہے۔ باب سوم "گوہر بحیثیت نظم گو" میں ساہیوال میں نظم اور نعت کی روایت اور گوہر کی نظم اور نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم "گوہر بحیثیت غزل گو" ہے۔ یہ باب ساہیوال میں غزل کی روایت اور گوہر ہوشیا پوری کی غزل کا جامع انداز میں تحقیقی و تنقیدی تجزیہ پیش کرتا ہے۔ باب پنجم "اسلوب گوہر اور محاکمہ" پر مبنی ہے نیز اس باب میں گوہر کے غیر مطبوعہ کلام اور مکتوبات گوہر پر سیر حاصل مباحث پیش کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔

موضوع مقالہ: "مجید امجد کی شاعری میں امیجری"

مقالہ نگار: سدھیر احمد، 2020ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نذر عابد، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

امیجری ایک ایسا فنی حربہ ہے جو ذہنی واردات کے ذریعے لفظوں میں اظہار پاتا ہے اور محسوساتی ادراک کی بازیافت کا حوالہ بن جاتا ہے۔ یہ اظہار بیان کا ایسا جادو ہے جو کلام کے اندر خاص تاثیر اور جاذبیت کا سبب بننے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ تجربات و مشاہدات کو کلی وحدت بھی عطا کرتا ہے۔ اردو شاعری میں امیجری کے مختلف نمونے کلاسیکی شعرا سے لے کر عصر حاضر کے جدید شعرا کے کلام میں مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ تاہم اس روایت کا جو اظہار مجید امجد کی شاعری میں ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد شاید مجید امجد وہ دوسرے بڑے عوامی رنگ کے شاعر ہیں جو زندگی کے ہر موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اور زندہ و پر تاثیر تمثالوں کی صورت میں حیات انسانی کی متحرک تصاویر پیش کرتے ہیں۔

سدھیر احمد کا مقالہ "مجید امجد کی شاعری میں امیجری" مجید امجد کے کلام میں پیکر تراشی کے مطالعے پر مبسوط تنقیدی و تحقیقی مطالعہ ہے۔ مقالہ ہذا کل چھے ابواب پر محیط ہے۔ باب اول کا عنوان "امیجری: تمہیدی مباحث" ہے جس میں امیجری کی مختلف تعریفوں، صورتوں، آغاز وارتقا اور اقسام پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ مزید بر آں امیجری کی روایت، عربی، فارسی، انگریزی اور اردو ادب میں مختلف تحریکوں کے زیر اثر تخلیق ہونے والے امیجری کے مختلف نمونوں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ باب دوم "اردو شاعری میں امیجری" کے عنوان سے موسوم ہے جس میں اردو کلاسیکی شاعری مرثیہ، قصیدہ، مثنوی اور غزل سے جدید نظم و غزل جیسی اصناف میں موجود امیجری کے مختلف نمونوں کو کھوج کر تحقیقی کام کا حصہ بنایا گیا ہے۔ باب سوم "مجید امجد کی شاعری میں بصری امیجری" سے معنون کیا گیا ہے جس میں مجید امجد کے ہاں پائی جانے والی بصری تمثالوں کے مختلف نمونے تلاش کر کے تحقیقی و تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ باب چہارم کو "مجید امجد کی شاعری میں سمعی امیجری" کا عنوان دیا گیا ہے جہاں مختلف لفظوں کے صوتی آہنگ اور مختلف اصوات سے تشکیل پانے والے تجریدی اور تجسیمی مرقعوں کو تنقیدی بحث کا حصہ بنایا گیا ہے۔ مقالے کا پانچواں باب "مجید امجد کی شاعری میں متفرق امیجری" ہے۔ جس میں مجید امجد کے ہاں لمسیاتی، ذائقاتی اور مخلوط امیجری کے مختلف نمونوں پر فنی و فکری حوالوں سے مباحث سمیٹے گئے ہیں۔ مقالے کے آخری اور چھٹے باب کو تحقیقی مقالات کے مروجہ اصولوں کے تحت "محاکمہ" کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس باب میں گزشتہ ابواب کا مجموعی جائزہ و جامع خلاصہ تحریر کرنے کے علاوہ مجید امجد کی مصورانہ شاعری کے خصائص، اثرات اور افادی رجحانات کے ساتھ ساتھ بحیثیت تمثال گر شاعر معاصر شعری منظرنامے میں ان کے مقام و مرتبہ کے تعین پر بھی مباحث شامل ہیں۔

اس مقالے کے تجزیاتی مطالعے کی روشنی میں یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری کے معاصر منظر نامے میں بہت سی شخصیات شہرت اور معیار و اعتبار کی حامل ٹھہری ہیں۔ ان ہی شخصیات میں ایک معروف نام مجید امجد کا ہے جنھوں نے نہ صرف اپنے عہد کے معاشرتی رویوں کی عکاسی کی بلکہ اپنی شاعری میں زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں بھی پیش کیں۔ مجید امجد کے ہاں نظموں میں مختلف ہیئتی تجربات کے ساتھ ساتھ زندگی کی قدروں کا احساس، انسانی رویوں کا بیان، بنتی بگڑتی تہذیبوں کی عکاسی اور ان کے عام انسانوں پر اثرات کی تصویر کشی جس حسن و خوبی کے ساتھ شعری پیکروں میں ڈھلی ہے وہ انھیں عہد جدید کا ایک منفرد اور بڑا شاعر تسلیم کرواتی ہے۔ ان کے ہاں پیکر تراشی کے رنگا رنگ نمونے ان کے عمیق مشاہدہ، شاعرانہ نقش گری اور اختراعی قوت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

موضوع مقالہ: "اُردو میں نعتیہ قصیدہ نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: نوید احمد، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شہزاد احمد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

نعتیہ قصیدہ حضور اکرم ﷺ سے والہانہ عقیدت کا مرصع اظہار ہے۔ قصیدے کا پُر شکوہ اسلوب اسے دیگر اصناف سخن سے ممتاز کرتا ہے۔ اُردو میں نعتیہ قصیدہ نگاری صنف قصیدہ کے اسلوب کے عہد بہ عہد ارتقا کی کہانی تو ہے ہی، ساتھ میں یہ شاعر کے داخلی جذبوں کی سچی تصویر سے آگاہی کی ایک صورت بھی ہے۔ مقالہ بحوالہ عنوان بالا پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ایک سو سولہ شعرا کے قصائد کا خصوصی مطالعہ اور تینتالیس شعرا کا جزوی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلا باب نعت اور قصیدے کے فن کے حوالے سے مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ اسی میں عربی، فارسی اور اُردو میں نعتیہ قصیدے کی روایت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ دوسرا باب اُردو نعتیہ قصیدے کے آغاز سے اورنگ زیب عالم گیر کی وفات یعنی 1707ء تک ہے۔ اس میں دکن کی سیاسی و سماجی صورت حال کا مختصر نقشہ پیش کرنے کے بعد سات شعرا کے نعتیہ قصائد کا فرداً فرداً جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب گیارہ شعرا کے کلام کے خصوصی مطالعے پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے شعرا شامل ہیں اور اس کا اختتام حکیم مومن خاں مومن پر ہوا ہے۔ اس عہد میں اُردو شاعری کے نامور شعرا جیسے "سودا، قائم چاند پوری، مصحفی، محمد روشن جوشش اور نظام الدین ممنون" کے کلام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا باب ۱۹۴۷ء تک نعتیہ قصیدے کی نشو نما اور ارتقا، اس عہد کی مذہبی، سماجی اور سیاسی صورتِ حال

اور موضوعاتی ولسانی تبدیلیوں کے جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس باب میں چھتیس شعرا کا خصوصی مطالعہ اور پچیس شعرا کا جزوی مطالعہ قلم بند کیا گیا ہے۔

پانچواں باب ۱۹۴۷ء کے بعد کے شعرا پر محیط ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں ناقدین صنف قصیدہ کی موت کا اعلان کر چکے تھے اور یہی وہ دور ہے کہ اس میں دیگر تمام ادوار سے زیادہ نعتیہ قصیدہ گو شعرا سامنے آئے ہیں۔ اس باب میں پینتالیس فوت شدہ قصیدہ گو اور اُس وقت کے سترہ حیات شعرا شامل ہیں جب کہ جزوی مطالعے کے طور پر شامل شعرا اس کے علاوہ ہیں۔ اس باب میں "ولی الرحمن ولی، شفیق جون پوری، محمد مصطفیٰ جوہر، سید نظر زیدی، خالد احمد اور ضیا شہبازی " جیسے اہم نام شامل ہیں جنھیں بقول مقالہ نگار پہلی بار متعارف کرایا جا رہا ہے۔ مقالے کی تسوید کے وقت حیات شعرا میں ڈاکٹر مختار الدین مختار، انجم نیازی، انور جمال، جمشید اعظم چشتی، محمد طاہر صدیقی اور شیبا حیدری کو نعتیہ قصیدہ گو کی حیثیت سے نئی دریافت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق محمد طاہر صدیقی کو اُردو نعتیہ قصیدہ نگاری کی تاریخ کا سب سے طویل قصیدہ "قصد نعت" لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اُن کا یہ قصیدہ نو سو (۹۰۰) اشعار پر مشتمل ہے۔

موضوع مقالہ: " انیس ناگی کی تخلیقی و تنقیدی نثر کا مطالعہ "

مقالہ نگار: حبیب الرحمان، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ناول، افسانہ، تراجم، تنقید، تاریخ، نفسیات کلچر اور ثقافت پر انیس ناگی کا ادبی اور قلمی سرمایہ تقریباً اسی کتابوں پر مشتمل ہے، ادب کی سرزمینوں میں اُن کی خدمات سنہری حروف میں لکھی جائیں گی، ان کا شمار جدید ادب کے علمبرداروں میں ہوتا ہے جنہوں نے روایتوں سے بغاوت کا علم بلند کیا، وسعت مطالعہ، عالمی ادب، وجودی نظریات، روایت سے بغاوت ان کی پہچان کا بنیادی اور معتبر حوالہ ہیں۔ ان کے تخلیقی وفور کے سرچشمے کبھی سرد نہ ہوئے۔ اُن کی تخلیقی و تنقیدی نثری خدمات کو مقالہ نگار حبیب الرحمان نے اپنے تحقیقی مقالے میں سمو دیا ہے۔ انہوں نے اس مقالے کے باب اوّل میں انیس ناگی کی حیات، شخصیت اور تصانیف کو پیش کیا ۔ انیس ناگی کی ابتدائی زندگی اور گھریلو ماحول کا ان کے ادب پر گہرا اثر پایا جاتا ہے، ان کے والد مولوی ابراہیم تقسیم سے قبل سیشن جج کے عہدے پر فائز تھے، جو اپنی راست بازی، کٹر مذہبی نظریات اور بے لچک شخصیت کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ وہ گھر میں بھی سخت ماحول کے پابند تھے، ان کی موجودگی میں پورے گھر کا ماحول حبس اور گھٹن زدہ رہتا۔ ان کا یہ مزاج اور درشت رویہ حساس اور زود رنج انیس ناگی کی شخصیت پر گہری

طرح اثر انداز ہوا، اور تمام عمر اس احساس کمتری اور تنہائی سے باہر نہ نکل سکے، اسی ماحول نے ان کے فن کی راہیں متعین کیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی بے تحاشا محبت کی کہانیاں نہیں ملتیں، بلکہ تلخ اور کڑوی حقیقت اور اس سے وابستہ مسائل جابجا ملتے ہیں۔

جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو برصغیر میں فسادات کا دور دورہ، تھا، ہر طرف قتل و غارت نفسا نفسی، انسان اور انسانیت کی بے حرمتی، غرض انسان کی پوری کمینگی اور خود غرضی کو عروج پر دیکھا۔ یہی وہ دور تھا جب ان کا عقیدہ راسخ ہوا کہ انسان اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ایک سفاک مخلوق ہے۔ ان کے والدین نے تقسیم کے بعد لاہور سکونت اختیار کی اور ان کے والد کو امرتسر کی جائیداد کے عوض ٹیپ روڈ پر ایک مکان الاٹ کیا گیا، سنٹرل ماڈل سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر مختلف شہروں میں والد کے تبادلہ کی وجہ سے گھومتے رہے، اسی عہد میں ناآسودگی، کم مائیگی، بے وقعتی اور احساس محرومی نے ان کے آنگن میں ایسا بسرا کیا کہ تمام عمر اس سے نجات نہ پا سکے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ایک ذہین طالب علم اور بہترین تیراک کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ اسی عہد میں بین الاقوامی ادب کا مطالعہ کیا۔ یہیں زاہد ڈار، آغا علی اور سردار مظہر علی کے ساتھ تعارف کا رشتہ استوار ہوا اور قیوم نظر، محمد صفدر میر، حفیظ جالندھری سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا۔ اپنے وسعتِ مطالعہ کے باعث وہ بہت جلد توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور کالج کے مجلہ "راوی" کے مدیر بھی منتخب ہوئے۔ ایم۔ اے اُردو میں گولڈ میڈل حاصل کیا، ایم اے او کالج میں بطور لیکچرار انٹرویو دیا لیکن اس وجہ سے مسترد کئے گئے کہ ان کا ذہنی رجحان بہت زیادہ مغرب زدہ ہے۔

کچھ عرصہ بعد گورنمنٹ کالج لاہور بحیثیت لیکچرار تعیناتی ہوئی، لیکن آزاد خیالی، مغرب زدگی اور سرخوں سے مشابہت نے مارشل لا کی وجہ سے ان سے نوکری چھین لی۔ دوسری طرف ان کا ادبی حلقہ اور مطالعہ اور وسعت اختیار کرتا گیا۔ لائل پور (فیصل آباد) میں ان کی تعیناتی بحیثیت لیکچرار ہوئی لیکن بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ وہ درس و تدریس سے نباہ نہ کر پائیں گے، پھر صوبائی حکومت میں مقابلہ کا امتحان پاس کیا اور بحیثیت ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر، سیالکوٹ تعینات ہوئے، یہاں بھی سول سروسز کی آپس میں رقابت اور ذات برادری نے ان کو مایوس کیا لیکن بہرحال وہ سول سروس میں تمام عمر رہے، اور ریٹائرمنٹ کے بعد گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں بحیثیت وزٹنگ پروفیسر پڑھاتے رہے، وہ اپنی وفات کے وقت ۷ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو پنجاب پبلک لائبریری میں موجود تھے۔ مقالہ نگار کے مطابق ان کی ادبی زندگی کا سب اہم واقعہ

۱۹۶۰ء کی دہائی میں شروع ہونے والی نئی شاعری کی تحریک تھی۔ ان کی شخصیت اور فن دونوں پر "سارتر، دوستو نفیسکی" اور بالخصوص "کامیو" کے وجودی فلسفہ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ان کے ناول اور شاعری پر وجودیت کی گہری چھاپ ہے۔ انہوں نے ناول، تنقید اور تراجم میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

باب دوم میں انیس ناگی کی ناول نگاری کے بنیادی مباحث کا تعارف پیش کیا گیا ہے اس کے علاوہ ناول کی مختصر روایت کا جائزہ بھی لیا گیا اور انیس ناگی کے ناولوں میں مرکزی رجحانات کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو ناول کی تاریخ میں انیس ناگی کا نام انتہائی معتبر ہے۔ انہوں نے "دیوار کے پیچھے" جیسا شاہکار ناول لکھ کر فکشن میں اپنی آمد کا اعلان کیا۔ اس باب میں ان کے ناولوں میں وجودی رجحانات سماجی شعور اور تاریخی عناصر کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ "دیوار کے پیچھے" انیس ناگی کا پہلا ناول ہے۔ اس کا ہیرو شکست ذات اور اپنے ہی وجود کے بحران کا شکار ہے، ایک جان لیوا کرب، تنہائی، خوف اور دہشت اسے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ ایک انتشار اُس کے وجود کو کھائے جا رہا ہے، وہ ہر وقت زوال اور خطرے کی زد پر ہے۔ لایعنیت کا کرب اور دکھ اس کا مقدر بن چکا ہے۔ انہی حالات سے تنگ آ کر وہ خودکشی کی کوشش بھی کرتا ہے مگر موت بھی اسے گلے نہیں لگاتی۔

ناول "میں اور وہ" ایک طرح سے ان کے پہلے ناول کی توسیع ہی ہے، اس ناول کا مرکزی کردار بھی جبر کا شکار ہے، یہی جبر اس کے لئے وجودی صورتِ حال بن جاتی ہے، معاشرتی جبر، تنہائی، انتشار، لایعنیت کی فصیلوں میں گھرا یہ کردار حیات کے دن گننے میں گزار دیتا ہے، ایک طرف دفتر میں اس کے باس کا جبر اور بدمعاشی اور دوسری طرف اس کے رفیق کار اس کی مخبری کرکے اس کی اذیت اور ذہنی اور روحانی کرب میں اضافے کا موجب ہیں۔ اس ناول کا کینوس اور پلاٹ الجزائر کی سرزمین ہے، جہاں روزگار کی تلاش اسے لے جاتی ہے، وجود اور ماحول میں مطابقت نہیں کر پاتا اور بالآخر بے خوابی میں ہو جاتا ہے۔ ناول "زوال" ایک درمیانے درجے کے سرکاری ملازم احسن کی کہانی کے گرد گھومتا ہے، مالی تنگدستی، بے ذائقہ ازدواجی زندگی اور مسلسل علالت اسے موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے، اداسی کی ایک گھمبیر فضا، معاشرتی جبر، بیمار وجود، لاچارگی اور اضطراب اس کو کھا جاتی ہے وہ ایک بیمار وجود کے ساتھ زندگی کی تلخیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ ناول "ایک گرم موسم کی کہانی" تاریخ کے کینوس پر لکھا ہوا ناول ہے۔ اس کا مرکزی کردار جاوید ہے جس کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی مفاد پرستی غداری کے کلچر اور موجودہ بیوروکریٹک نظام کو عیاں کیا گیا ہے کہ کس

طرح معاشرے میں خود غرضی اور طاقتور طبقے کا آج بھی راج ہے۔ ہیرو جیسے پڑھے لکھے باشعور، باضمیر، ایماندار افراد اپنے ہی شعور کی سزا بھگت رہے ہیں۔

"محاصرہ" ایک بھرپور وجودی ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار، سلیم، جبر گھٹن اور بے بسی کا مکمل شاہکار ہے اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو حالات کے مطابق نہیں ڈھال پاتا اور آہستہ آہستہ بے معنویت کا زہر اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ آگہی اور شعور اس کے لئے زوال بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے تہہ خانے میں ایک قیدی کی مانند زندگی کی سانسیں گننے میں مصروف ہے۔ ذہنی نراج اور خلفشار اسے بالاخر تباہ کر دیتے ہیں۔ "قلعہ" انیس ناگی کا عمدہ ناول ہے۔ اس کا مرکزی کردار دارا ہے، جس کا جرم یہ ہے کہ وہ سچ اور دیانت داری کے ذریعے معاشرے میں اخلاقی قدروں کی آبیاری کرنا چاہتا ہے مگر اس کی دیانت داری اس کے لئے شکست ہزیمت، انکار، مزاحمت ،تنہائی، ذلت اور رسوائی کا شاخسانہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کا داخلی کرب اور بحران اسے ایک جہنم کے روبرو لا کھڑا کرتا ہے۔ دیانت اور سچ کے نتیجے میں اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور قلعہ کی دیواریں دارا کا نوحہ تحریر کرتی ہیں۔ یہ انیس ناگی کا اہم وجودی ناول ہے اس ناول کے تمام کردار دارا، زرینہ، آرتھر، خورشید بیگم ناکردہ گناہوں کی سزا جھیل رہے ہیں۔ ایسی زندگی جی رہے ہیں جو بے اختیاری کا شاہکار ہے۔ ناول "چوہوں کی کہانی" ایک درمیانے درجے کے میونسپل آفیسر کے روحانی زوال کی داستان ہے جو تنہائی، بیگانگی اور رشتوں کی بے معنویت کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ مالی تنگدستی اس بیگانگی کے زخم کی خلیج کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔ مرکزی کردار انتہائی حساس ہے اور اپنے مقدر سے نالاں بھی ہے۔ اس ناول میں طاعون کی وبا نفسیاتی سطح پر انسانی لاتعلقی، بیگانگی اور نفسا نفسی کی علامت ہے، مرکزی کردار حالات کے جبر کا شکار ہے۔ جس جرم کی سزا اسے دی جاتی ہے وہ اس نے سرزد ہی نہیں کیا، بے چہرہ، بے شناخت زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے وہ اپنی صفائی میں بہت کچھ پیش کرنا چاہتا ہے مگر سب بے سود، سب بے معنی؟ یہ ہر اس فرد کا مقدر ہے جو تیسری دنیا کا باسی ہے۔ ناول "پتلیاں" کا مرکزی کردار جمیل ہے، ساری کہانی جمیل کی خانگی زندگی کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اس ناول کے تمام کردار وجودی صورتِ حال کا شکار ہیں، تمام کردار بوجھل، تھکی ہوئی بے ثمر زندگی کا بوجھ اٹھائے وقت کے بے رحم ہاتھوں میں پتلیاں بنے نظر آتے ہیں، جن کی ڈور وقت کے بے رحم ہاتھوں میں ہے اور حالات ہمیشہ انسان سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ایک بے اختیاری کی زندگی رگوں میں بے ثمر زندگی کا زہر گھول رہی ہے۔ فرد کی آزادی، بے اختیاری کی صورتِ حال اس ناول کا موضوع ہے۔

انیس ناگی کے ناولوں کا دوسرا بڑا رجحان سماج ہے، سماجی اور معاشرتی صورتِ حال جس کی زد میں آئے ہوئے لاچار اور بے بس کردار بدحواس ہوئے پھرتے ہیں۔ ان کے جن ناولوں میں معاشرتی صورتِ حال کی عکاسی کی گئی ہے اس میں فرد اور معاشرے کا تصادم ہے۔ ایسے ناولوں میں "دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال ، محاصرہ، کیمپ، پتلیاں، ناراض عورتیں اور صاحباں" شامل ہیں۔ باب سوم میں مقالہ نگار نے انیس ناگی کی افسانہ نگاری کا مختصر تعارف پیش کیا ہے، انیس ناگی نے افسانہ نگاری کی طرف کم توجہ دی، ان کا افسانوی جہاں تیس بتیس افسانوں پر مشتمل ہے، ان کی افسانوی کلیات ۲۰۰۱ء میں "بدگمانیاں" کے نام سے شائع ہوئی، اس کے علاوہ ۲۰۰۸ء میں "نئے افسانے کی کہانی" کے عنوان سے ان کی ایک کتاب منظرِ عام پر آئی، جس میں ان کے افسانے اور افسانہ کے فن پر تنقیدی مضمون شامل ہیں۔ انیس ناگی کے افسانوں پر حقیقت نگاری اور علامتی رنگ نمایاں ہے۔ انیس ناگی نے اپنے افسانوں میں معاشرتی و سماجی ٹوٹ پھوٹ اور توڑ پھوڑ کے حامل کرداروں کی ذہنی ناآسودگی سے لے کر معاشی بدحالی اور دفتری استحصال سے لے کر تنہائی جیسے آزاروں پر کھل کر لکھا۔ ان کے افسانوں کا ہیرو ایک ایسا شخص ہے جو اپنے ہی شعور کے ہاتھوں روبہ زوال ہے، تمام افسانے حقیقت پسندانہ اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت کا جھکاؤ زیادہ تر مغربی ادب کی طرف رہا، اسی کو انہوں نے اپنے لئے ایک "رول ماڈل" کے طور پر اپنایا، اسی لئے ان کے ہاں مغربی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جدید اُردو افسانے میں ہیئت اور تکنیک کے کئی تجربات کئے اور افسانے کی تصوراتی تشکیل یا فار مولیشز پر بہت زور دیا، مقالہ نگار حبیب الرحمان اُن کی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"انیس ناگی اس بات کے قائل ہیں کہ افسانہ کہانی کے بغیر بھی لکھا جا سکتا ہے۔
اس کی بنیاد کسی ٹھوس تصور اور خیال پر بھی ہو سکتی ہے"۔(22)

باب چہارم میں انیس ناگی کی ترجمہ نگاری کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے اردو کو شاندار اور بہترین تراجم فراہم کئے، نثری تراجم میں "سسفیس کی کہانی، کایا کلپ، طاعون، تہہ خانے سے" شامل ہیں جبکہ شعری تراجم میں "ہوائیں، جلاوطنی، جہنم میں ایک موسم، ٹی ایس ایلیٹ کی نظمیں اور جدید فرانسیسی شاعری کے عنوانات کے تحت کتابیں شامل ہیں۔ انیس ناگی کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کو اُردو میں ترجمہ کر کے منتقل کیا، بلکہ انہوں نے اُردو ادب کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کروانے کے لئے اُردو ادب کے بھی انگریزی میں تراجم کئے۔ باب پنجم میں انیس ناگی کی تنقید نگاری کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ انیس ناگی کی تنقیدی بصیرت کے سرچشمے مغربی ادب سے پھوٹتے ہیں، انہوں نے اُردو ادب

کے سرمائے کو مغربی اصولوں کی عینک سے پرکھا۔ گہری تنقیدی وسیع مطالعہ، ادب کے تازہ ترین رجحانات سے آگہی اور زبان پر مکمل دسترس نے ان کو اُردو تنقید میں منفرد مقام عطا کیا، انیس ناگی کے تنقیدی نظام میں ان کے موضوعات کی رینج بہت وسیع ہے۔ ان کے تنقیدی سرمائے میں "شعری لسانیات، تنقید شعر، علم المعانی ، کلاسیکی شعر اکا مطالعہ، نفسیات، ساختیات، معاصر ادب کے تجزیاتی مطالعات" وغیرہ تسلسل کے ساتھ منصہ شہود پر آتے رہے۔ انیس ناگی کی تنقید نگاری کو واضح طور پر دو حصوں عملی تنقید اور نظری تنقید میں تقسیم کیا جا سکتا۔ آپ نے ہر دو تنقیدی نظام پر کھل کر بے لاگ تبصرے لکھے، شعر و ادب کے مسائل پر آزادانہ غور و فکر کیا، ادبی مسائل پر ان کی رائے بے لاگ، صاف، کھری اور سچی ہے۔ اُن کے ہاں ہر بات کرنے کا انداز واضح اور قطعی ہے، الجھاؤ، ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے۔

باب ششم میں انیس ناگی کی متفرق تحریروں کا تعارف پیش کیا گیا جن میں ایک "ادھوری سر گذشت، عمومی نفسیات، جنس اور وجود، لاہور جو شہر تھا اور "پاکستانی اردو ادب کی تاریخ" شامل ہیں۔ ایک ادھوری سر گذشت مصنف کی زندگی کے ابتدائی حالات و واقعات، بچپن، گھر کا ماحول، والد کا درشت رویہ اور والدہ کی محبت، شفقت توجہ سے محرومی نے ان کی شخصیت پر جو منفی اثرات مرتب کئے ان واقعات کا تذکرہ اس کتاب ملتا میں ہے۔ اس سر گذشت کی مجموعی فضا اداس اور مضطرب ہے۔ بہت سے مقامات پر انہوں نے اپنا تجزیہ بڑی بے دردی سے کیا، اپنی تحلیل نفسی سے سر گذشت کو ایک کیس ہسٹری بنا دیا ہے، اس خود نوشت کا بیانہ ان کے ناولوں کی مانند واحد متکلم کے بہت قریب ہے۔ "عمومی نفسیات" ایک مختصر کتاب ہے۔ اس میں وجودی اصطلاحات، اضطراب بیگانگی اور بے خوابی کو عمومی معاملات کے طور پر نہایت آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ "جنس اور میں" میں پاکستانی معاشرے میں عورت کی صورتِ حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نفسیات کی تحلیل کے حوالے فرائیڈ اور ایڈلر کے حوالے بھی جا بجا ملتے ہیں۔

"پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ" میں تقسیم کے بعد پاکسانی ادب کی مختلف جہتوں کا معروضی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تاریخ میں پہلی دفعہ پاکستانی اُردو ادب کو ہندوستانی اُردو سے مختلف کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کا نقطہ نظر یہ ہے ممالک کی زبان ایک ہونے سے ان کا ادب ایک نہیں کہلاتا، زبان بھلے ایک ہو، مگر ہر ملک کے ادب کی اپنی منفرد حیثیت ہے۔ اس کتاب میں ۱۹۴۷ء کے بعد کی ایک مکمل تہذیب اور معاشرت کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کتاب میں ادب اور تاریخ میں داخلی ربط کو ایک بنیادی استدلال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ "لاہور جو شہر تھا" انیس ناگی کی اہم تاریخی کتاب ہے۔ اس نہ صرف مصنف کے گہرے

شعور پر روشنی ڈلتی ہے بلکہ مصنف کی دوسری تحریروں کو سمجھنے کے لئے پس منظر کا کام بھی دیتی ہے، اس کتاب میں لاہور کی صدیوں پر محیط تاریخ اور مخصوص شخصیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس کا مطالعہ فکری تناظر میں وسعت پیدا کرتا ہے، پیرایۂ اظہار آسان رواں اور دلچسپ ہے۔

موضوع مقالہ: " اردو میں غیر مسلم ممالک کے سفر نامے: سماجی و ثقافتی مطالعہ (1947ء تا 2017ء) "

مقالہ نگار: زہرا امتیاز، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر وحید الرحمان خان، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

سفر نامہ وہ صنف سخن ہے جس میں گھر میں بیٹھ کر دنیا بھر کی سیاحت سے بغیر کسی مشکل اور صعوبت کے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ زہرا امتیاز نے مذکورہ مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں براعظم ایشیا کے سفر ناموں کے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ایشیائی ممالک میں، چین، جاپان، سنگاپور، سری لنکا، تھائی لینڈ، انڈیا، روس اور نیپال شامل ہیں۔ ان ممالک کی سیاحت کرنے والے مصنفین میں صف اول کے ادیب شامل ہیں۔ دوسرے باب میں ان سفر ناموں کا سماجی اور ثقافتی مطالعہ کیا گیا ہے جو براعظم یورپ سے متعلق ہیں۔ نامور مصنفین نے یورپ کے مختلف ملکوں مثلاً سوئٹزر لینڈ، فرانس، سپین، سویڈن، ناروے، جرمنی، فن لینڈ، ڈنمارک، اٹلی، قازقستان، آسٹریا، انگلینڈ وغیرہ کے سفر ناموں میں جہاں دیگر پہلو نمایاں کیسے ہیں، وہاں سماج اور ثقافت کو خاص اہمیت دی ہے۔ تیسرے باب میں براعظم امریکا کے مختلف ملکوں وغیرہ کے سماجی اور ثقافتی عناصر کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اردو کے اہم سفر نامہ نگاروں نے براعظم امریکہ کی ثقافت اور معاشرت کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ ان ممالک میں کینیڈا، برازیل، کولمبیا، ارجنٹائن، وینزویلا، چلی، کیوبا، پیرو، ناروے وغیرہ شامل ہیں۔ چوتھے باب میں ان سفر ناموں کو شامل کیا گیا ہے جو دیگر براعظموں سے متعلق ہیں یا مختلف براعظموں کے ملکوں کے بارے میں سماجی اور ثقافتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ یوں اس باب میں مخلوط اور متنوع سفر نامے زیر بحث آئے ہیں۔ پانچویں اور آخری باب میں خواتین کے سفر ناموں کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ خواتین سفر نامہ نگاروں نے مختلف براعظموں کے سماج، معاشرت اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں نادر معلومات فراہم کی ہیں۔

موضوع مقالہ: " قیام پاکستان کے بعد اُردو ادب میں بھارت کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "

مقالہ نگار: میاں شیر باچا، 2016ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر سلمان علی، جامعہ پشاور، پشاور

مذکورہ عنوان کے تحت لکھے گئے میاں شیر باچا کے مقالے کے تجزیاتی مطالعے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان سفر ناموں میں بھارت کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ اگر وہاں کے قابل دید مناظر، تاریخی عمارات اور مسلمانوں کے ہاتھ کے شاہکار محلات و مساجد کے علاوہ تاج محل جیسا عجوبہ روزگار جھلمل جھلمل کرتا نظر آتا ہے تو ساتھ ساتھ وہاں کے ادبی، تاریخی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی زندگی کے علاوہ مذہبی موضوعات بھی سفر ناموں میں بکھرے پڑے ہیں۔ مقالہ نگار نے بھارت کے سفر ناموں کے باب اول میں فن سفر نامہ پر بحث کی ہے۔ سفر نامہ کی تعریف و اہمیت، حدود ولوازم سفر و سیاحت یا مسافر و سیاح کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم وجدید سفر نامے کے بارے میں ادب کے مشاہیر کی آرا کی روشنی میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ سفر یا سیاحت کا جزو یعنی مسرت ہر ایک کے نزدیک جدا جدا ہو گی۔ سفر نامے کی دور جدید میں ضرورت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں سفر نامے کی روایت، سفر نامے پر کیے گئے کام کا اجمالی جائزہ اور سفر نامے کی تکنیک کا احاطہ بھی کیا گیا ہے کہ سفر نامہ کس تکنیک کا متقاضی ہے۔ باب دوم میں بھارت کے سفر ناموں کا مختصر تعارف بیان کیا گیا ہے۔ بھارت کے سفر ناموں میں ثقافتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی موضوعات سے متعلق مواد کے حوالے دیے گئے ہیں۔ جن سے سفر ناموں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی تہذیب و ثقافت اور سیاست و مذہب کا کیسے احاطہ کرتے ہیں اور وہاں کی زندگی کی مکمل عکاسی کیونکر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سفر نامہ نگاروں نے جن جن مقامات کو جس جس انداز سے بیان کیا، اس کو انہی کے الفاظ میں پیش کر کے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اس عکاسی اور تصویر کشی میں مصنف کا نقطہ نظر کیا ہے اور ہندوستان کے آثار و امکنہ کو وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی نشانیاں سمجھ کر کس تناظر میں پیش کرتے ہیں۔

باب سوم میں بھارت کے سفر ناموں میں فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سفر نامہ نگار کسی جگہ یا کسی موضوع کے بیان سے ہمیں کس بات پر دماغ سوزی کا اشارہ دیتا ہے۔ بعض کے ہاں کچھ مثبت فکری حوالے پائے جاتے ہیں مثلاً بچوں کو غربت کی بھٹی میں جلتا دیکھ کر یا خواتین کی نسوانیت بالائے باق رکھ کر ان سے مردوں جیسی محنت مشقت لیتا دیکھ کر جذبہ ترحم کا پیدا ہو جانا۔ مگر ایک فکری کمزوری تمام سفر نامہ نگاروں کے ہاں در آئی ہے۔ وہ ہے مذہب کے حوالے سے سرد مہری دکھانا۔ اس پر بھی اس باب میں بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو ادب کے ارتقاء میں بھارت کے سفر ناموں کا حصہ اور کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم میں سفر نامے کا اسلوب اور پھر سفر نامے پر سفر نامہ نگار کی شخصیت کے اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ اس

کے علاوہ بھارت کے سفر ناموں کے اسلوب کا مجموعی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں تمام تحقیقی کام کو سمیٹ کر نتائج اخذ کیے گئے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ بھارت کے سفر ناموں میں قومی سوچ، نظریاتی بالیدگی، تہذیب و ثقافت، معاشی، سماجی، مذہبی اور ادبی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ سفر نامے مقصدیت سے مملو اور ادب کے قاری کے لیے بیش بہا سرمایہ ہیں۔

موضوعِ مقالہ: " پاکستانی مزاح نگاروں کے سفر نامے: تقابلی و تنقیدی مطالعہ "

مقالہ نگار: رضوان اللہ، 2018ء

نگرانِ مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس، جامعہ کراچی، کراچی

فن کار اپنے ذوقِ جمال کی تحسین کرتا ہے تو اسے آرٹ کہتے ہیں۔ الفاظ کے معنی جب خیال کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو اشعار بن جاتے ہیں۔ مجسمہ سازی کا فن ہو یا ادب کا کوئی شاہکار، تعمیر کی کوئی شکل ہو یا خوش آہنگ آوازوں کا زیر و بم! ہر ایک فن پارہ اپنی جگہ فکرِ انسانی کی تعمیر میں سرگرم رہتا ہے۔ فن کی اس چمک دمک میں فنکار کی ذات بالعموم نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے سوانح حیات، خطوط اور سفر نامے پل کا کام کرتے ہیں۔ فنون کی دیگر اقسام کی نسبت مذکورہ اصناف ذاتی، حقیقی اور زیادہ قابل توجہ ہوتی ہیں۔ بالخصوص سفر نامے کو ان اصناف میں بھی امتیاز حاصل ہے جو اپنے مخصوص اجزائے ترکیبی کے باعث نوع بہ نوع دلچسپیوں کا حامل ہوتا ہے۔ جس میں تہذیب کا رچاؤ بھی ہوتا ہے اور سیاسی شعور بھی، اس میں علمیت کا مرقع بھی ملتا ہے اور اسلوب کی چاشنی بھی! یہی وہ عوامل ہیں جو سفر نامے کو دقیق، دلچسپ اور اہم بناتے ہیں۔ اردو ادب میں ادبا نے نہ صرف سفر ناموں کی کہکشاں سجائی بلکہ تحقیق و تنقید کے علمبرداروں نے بھی اس صنف کو درخور اعتنا جانا۔ اس طرح وہ گوشے قارئین کے نظر سے پوشیدہ تھے عیاں ہوئے بلاشبہ اس ضمن میں کافی پیش رفت ہوئی ہے البتہ ابھی بہت کچھ ہے جو کرنے کو باقی ہے۔ بالخصوص اسلوبیات اور تقابل کے حوالے سے تاحال تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ طنز و مزاح بھی اسلوب کا ایسا وصف ہے جو اپنے اندر معنویت کا ایک تازہ جہاں رکھتا ہے۔ طنز و مزاح سے معمور یہ گوشے صفحات پر منتشر حالت میں نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا عنوان کے تحت مربوط کیے گئے مقالے میں مقالہ نگار نے یہ قصد کیا ہے کہ مزاح نگاروں کے تخلیق کئے ہوئے سفر ناموں کے لطیف گوشوں کو اجاگر کیا جائے، کیونکہ طنز و مزاح کے یہ گمنام گوشے نہ صرف لطیف احساس کا پرتو ہیں بلکہ سماج میں اس مزاح کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ادب کی ہر صنف بالخصوص سفر نامہ میں خارجی عوامل ادیب کی فکر کو مہمیز دے کہ براہ راست تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوتے

ہیں۔ سفر نامہ اردو ادب کی وہ بیانیہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگار، مشاہدات تجربات، واقعات اور احساسات کو دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر تحریر کرتا ہے۔

مقالہ نگار رضوان اللہ کا تحریر کردہ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول "اردو ادب میں سفر ناموں کا آغاز و ارتقا" ہے۔ اس باب میں سفر نامہ اور اس کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے گفتگو کی گئی۔ اس باب میں اسلامی حوالے سے انبیاء کرام کے اسفار کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اور پھر قدیم سیاحوں کے سفر نامے، اردو ادب کے پہلے سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش اور اس کے سفر نامے ذکر کیا گیا۔ جعفر تھانسیری کا سفر نامہ "کالا پانی"، سر سید احمد خان کا سفر نامہ " مسافرانِ لندن"، علامہ شبلی نعمانی " سفر نامہ مصر، روم و شام "مولانا محمد حسین آزاد کا سفر نامہ "سیر ایران "اور خواجہ حسن نظامی کا سفر نامہ بھی اس دور کے کامیاب سفر ناموں میں شامل ہے۔ پطرس بخاری نے سفر نامے کو "سفر انگلستان" کے ذریعے ایک نئی سمت پر گامزن کیا اور اپنے اسلوب سے جدت دی۔ گویا صحیح معنوں میں سفر نامے کو طنز و مزاح کی چاٹ یہاں سے لگی ہے۔ باب دوم "اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت" کے نام سے ہے۔ اس باب میں اردو ادب کی تاریخ میں طنز و مزح کے آغاز و ارتقا کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ جعفر زٹلی سے اودھ پنچ تک طنز و مزاح میں خاص ترقی ہوئی جسے متنوع موضوعات اور انداز کے ذریعے فروغ حاصل ہوا۔ اس باب میں سفر نامہ اور طنز و مزح کے تطبیق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن ادیبوں اور مزاح نگاروں نے اپنے سفر ناموں میں طنز و مزح کے حربوں کو استعمال کیا ہے یقیناً یہ ان کی مستحسن کوشش ہے۔ باب سوم " مزاح نگاروں کا تعارف اور ان کی تخلیقات " کے نام سے ہے۔ اس باب میں مزاح نگاروں کا تعارف اور تخلیقات پیش کی گئی ہیں جس میں ان کے حالات زندگی اور تصانیف کا احوال تحریر کیا گیا ہے۔

باب چہارم کا عنوان " پاکستانی مزاح نگاروں کے سفر ناموں کا تقابلی و تنقیدی مطالعہ " ہے۔ یہ اس مقالے کا مرکزی اور اہم باب ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے پاکستانی مزاح نگاروں کے سفر ناموں کا تقابلی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ ہر ادیب اپنا الگ زاویہ نظر رکھتا ہے اور وہ معاشرتی، ثقافتی، سماجی، معاشی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی طور پر مختلف ممالک میں پیش آنے والے واقعات، تجربات اور مناظر کو طنز و مزاح کے پیرائے میں اظہاریے کا وسیلہ بناتا ہے۔ مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ ان کے سفر ناموں کے تقابل سے واضح ہو سکے کہ آج کا مزاح نگار کس مقام و مرتبے پر ہے اور وہ اپنی تحریر کے ذریعے کیا نتائج حاصل کرنا چاہتا

ہے۔باب پنجم میں مزاح نگاروں کے اسالیب کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔اسلوب کی تعریف، اہمیت اور اس کی صفات کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور سفر ناموں سے مزاح نگاروں کے اسالیب کا اجمالی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ششم باب "مزاحیہ سفر ناموں کی افادیت اور فروغ کے امکانات" کے زیر عنوان ترتیب دیا گیا ہے۔اس باب میں مزاحیہ سفر ناموں کی افادیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مذکورہ بالا مقالے میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ طنز ومزاح کا پیرایہ ایک کارگر ہتھیار ہے جو معاشرے میں ناانصافیوں، ناہمواریوں، دشواریوں، نام نہاد روشن خیالی، معاشی بد حالی کے تضادات کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ماضی، حال اور مستقبل کی کشمکش میں الجھے ہوئے لوگوں کے رویے اور استحصال وغیرہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگے تو ادیب طنز وتضحیک کے ذریعے اصلاح کا کام کرتا ہے۔عہدِ حاضر کے مزاحیہ سفر نامے معاشرے کے عکاس ہیں اور مزاح نگاروں نے طنز ومزاح کے ذریعے اس کے چہرے کی گرد صاف کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس پر سے ابن الوقتی اور انانیت کا خول بھی اتارا ہے۔

موضوع مقالہ: " نو آبادیاتی عہد میں اقبال شناسی "

مقالہ نگار: جاوید اقبال،2020ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر الماس خانم، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور

بیسویں صدی کے آغاز میں جب برطانوی نو آبادیاتی نظام مستحکم اور مضبوط ہو چکا تھا، اس وقت برطانیہ کے نو آبادیاتی ہندوستان میں ایک صاحب فہم وادراک شاعر علامہ اقبال پیدا ہوئے جو عالم اسلام کی راہ نمائی کے لیے کمربستہ ہو چکے تھے۔علامہ اقبال اپنی گہری بصیرت اور سیاسی تجزیے کی بنا پر اس تلخ حقیقت سے آگاہ تھے کہ مستقبل میں امت مسلمہ پر نو آبادیاتی نظام کے اثرات انتہائی مہلک اور خطرناک ثابت ہوں گے۔ علامہ اقبال نو آبادیاتی عہد کی سیاست کا گہرا فہم وادراک رکھتے تھے۔وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ایک قوم جو نو آبادیاتی عہد کی پروردہ ہے وہ اخلاقی و تہذیبی، سماجی و سیاسی لحاظ سے کس قدر زوال کا نشانہ بن چکی ہے۔نو آبادیاتی نظام نے امتِ مسلمہ پر گہرے اثرات مرتب کیے، جس کے باعث وہ بے یقینی اور غلامی کا شکار ہو گئی۔

اقبال کی شاعری کا شعری اور نثری سفر بر صغیر میں بر طانوی راج جسے جدید عمرانی اصطلاح میں نو آبادیاتی عہد قرار دیا جاتا ہے، اس لیے ان کی فکر و نظر پر ہندوستان پر مسلط بر طانوی استعماریت کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کے حالات یکسر تبدیل ہو گئے اور انگریزوں نے ہندوستان کی حکمرانی کا تاج پہن لیا تھا۔ اقبال نے نو آبادیاتی عہد کے عروج کے دنوں میں آنکھ کھولی، اس لیے ملوکیت و سامراجیت، استعماریت، نو آبادیاتی نظام کی نوعیت، ماہیت اور حقیقت اقبال کے مزاج اور نفسیات میں برابر پروان چڑھتی رہی۔ اقبال ان بر طانوی حیلوں بہانوں اور حربوں کا بخوبی تجزیہ کرتے رہے جن کی وجہ سے ہندوستانی قوم غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس سفاک و عیار نو آبادیاتی نظام نے اقبال کی ایسی تخلیقی شخصیت سازی کی کہ ان کے یہاں استعماریت کے خلاف جذباتی نوعیت کا رد عمل پیدا ہو گیا جو مستقل ثابت ہوا۔ اقبال نے اس دور کا تاریخی، سیاسی و سماجی اور فلسفیانہ تجزیہ کیا، اس لیے ان کے افکار و خیالات پر استعماری نظام کے نفسیاتی و عمرانی اثرات معنی خیز انداز میں مرتب ہوئے۔ اقبال کی بیشتر شاعری نو آبادیاتی عہد کے تناظر میں محسوس کی جا سکتی ہے۔

علامہ اقبال نو آبادیاتی عہد کی ان نابغہ روزگار شخصیات میں منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، جنھوں نے اپنے افکار و خیالات اور فکر و فن سے نو آبادیاتی عہد کو اور بعد کے زمانے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ علامہ اقبال نہ صرف نو آبادیاتی عہد اور جدید تاریخ کے رجحانات سے واقف تھے بلکہ گہری فکری بصیرت اور سیاسی و سماجی تجزیے کی بدولت مستقبل کے افق سے ابھرنے والی استعماریت اور اجارہ داری کے اثرات کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ علامہ اقبال نو آبادیاتی عہد میں پیدا ہونے والے مختلف حربوں، سفاکی، استعماریت، اجارہ داری، عیاری اور اس کی مختلف شکلوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ فکر اقبال میں غلامی کے خلاف جو شدید رد عمل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نو آبادیاتی عہد کے پروردہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نو آبادیاتی عہد کے اثرات، فکری کج روی کے خلاف ان کا شدید قسم کا رد عمل تھا۔ علامہ اقبال کے نزدیک وہ طبقہ جو ذہنی و فکری طور پر مغرب سے مرعوب ہو چکا ہے وہ کسی بھی طرح مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، تعلیمی اور اخلاقی لحاظ سے راہ نمائی نہیں کر سکتا۔

نو آبادیاتی عہد میں اقبالیاتی ادب کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کے لیے مستشرقین نے گراں قدر اضافہ کیا۔ سب سے پہلے ایک انگریز دانشور پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے علامہ اقبال کے افکارِ عالیہ اور مشہور و منفرد نظریات اور ان کی شاعرانہ پیش کش پر قلم فرسائی کی۔ ڈاکٹر نکلسن نے علامہ اقبال کی مشہور زمانہ

تصنیف" اسرار و خودی" کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کا غیر معمولی معرکہ سر انجام دیا۔ "اسرار و خودی" کے بعد "پیام مشرق، بانگ درا، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز" جیسی فکری و فنی کاوشیں وجود میں آئیں اور ان پر نقد و نظر کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اقبال کا شمار ان مایہ ناز شخصیات میں ہوتا ہے جن کی زندگی میں ہی ان سے متعلق بلند تر ادبی سرمایہ منظر عام پر آ چکا تھا جس میں ان کے کلام کے شعری وسائل سے معمور اور بصیرت انگیز فکر و فنی کارناموں کو زیر بحث لایا گیا تھا۔

علامہ اقبال اپنے علمی و ادبی سرمائے کے باعث تحقیق و تنقید کے حوالے سے مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ عرصہ دراز سے ان کے افکار و خیالات اور فکر و فن پر بے شمار تحقیقی و تنقیدی مقالات و تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ قومی و بین الاقوامی سطح پر مختلف اداروں میں ان پر متعدد تحقیقی مقالے تحریر کیے گئے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے اقبال پر اس قدر کام ہوا ہے کہ اقبالیات کو ایک باقاعدہ دبستان کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں اقبال کی شاعری اور نثر کے منفرد لب ولہجہ اور ان کی فکر کے مختلف پہلوؤں نے ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہندوستان کا نو آبادیاتی عہد تاریخ کا ایک پر آشوب دور ہے جس میں سماجی و سیاسی خلفشار اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ برصغیر میں عمرانی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی اقدار انتشار کا شکار ہو گئی تھیں۔ اس پر آشوب، ہیجان اور اضطراب کی صورت حال میں جن ادبی شخصیات نے قومی ترقی کی طرف توجہ دی ان میں علامہ اقبال کی ذات نہایت اہم اور قابل ذکر ہے۔

زیر تجزیہ تحقیقی مقالے "نو آبادیاتی عہد میں اقبال شناسی" میں مقالہ نگار جاوید اقبال نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال استعماریت و سامراجیت کی نہ دکھائی دینے والی حکمت عملی کے سخت خلاف تھے۔ ان کی روشن فکر اور خرد افروز شخصیت سازی میں برطانوی عہد کا کردار ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کی شاعری نو آبادیاتی عہد کے عصری مباحث کو سامنے لاتی ہے۔ اقبال کی شخصیت اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش کے دور میں پروان چڑھی اس لیے جب ہم افکارِ اقبال کا مطالعہ کرتے ہیں تو نو آبادیاتی عہد فکر اقبال پر اثر انداز دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اپنے گہرے تجزیے، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر نو آبادیاتی نظام کے مقصدی عزائم تک پہنچ گئے اس لیے انھوں نے بھی اپنے معاصرین کی طرح استعماریت کی شکست وریخت کے لیے مغربی تہذیب وسیاست کی مخالفت کی اور اسلام کو ایک عالمی ثقافت اور آفاق گیر مذہب کے طور پر پیش کیا۔

اقبال نے یورپ جانے سے پہلے بھی برطانوی استعماریت کے خلاف آواز بلند کی جس پر اس مقالے میں بحث کی گئی ہے۔

جاوید اقبال کا تسوید کردہ یہ مقالہ پانچ ابواب اور ایک خلاصہ پر مشتمل ہے۔ باب اول "نو آبادیاتی عہد کا پس منظر" میں نو آبادیاتی نظام کے معنی و مفہوم اور پس منظر پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس باب میں نو آبادیاتی عہد کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور ہندوستان میں نو آبادیاتی عہد کے اہم مباحث کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ نو آبادیاتی عہد کے حوالے سے ایڈورڈ سعید، فرانز فینن اور ششی تھرور جیسے نامور مفکرین کے نظریات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور ان کے تنقیدی نظریات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ مقالہ مذکورہ کا دوسرا باب "اقبال کی تخلیقی شخصیت سازی میں نو آبادیاتی عہد کا کردار" کے عنوان سے ہے۔ اس میں نو آبادیاتی عہد کے علامہ اقبال کی شخصیت پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں علامہ اقبال کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کے عہد کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور آغاز سے ۱۹۰۵ء تک اور دوسرا دور ۱۹۰۶ء سے ۱۹۳۸ء تک کا ہے۔ اس باب میں علامہ اقبال کی شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات کو ہندوستان کے نو آبادیاتی عہد کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

زیر تجزیہ مقالہ کا تیسرا باب "نو آبادیاتی عہد میں اقبال شناسی: مطبوعہ کتب کی روشنی میں" ہے۔ اس باب میں ہندوستان کے نو آبادیاتی عہد میں علامہ اقبال کے افکار و خیالات، فکر و فن اور سوانح حیات پر لکھی جانے والی تنقیدی و تحقیقی کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے کا چوتھا باب " نو آبادیاتی عہد میں اقبال شناسی: رسائل و جرائد کی روشنی میں " ہے۔ اس باب میں ہندوستان کے نو آبادیاتی عہد میں اقبال شناسی کی روایت میں اہم کردار ادا کرنے والے رسائل و جرائد اور اخبارات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان رسائل و جرائد میں معروف اقبال نمبر بھی شامل ہیں۔ پانچواں باب "نو آبادیاتی عہد کے اہم اقبال شناس" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں برصغیر اور عالمی اقبال شناسوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے نو آبادیاتی عہد میں اقبالیاتی ادب کی ترویج اور فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مقالہ ہذا کے آخر میں "ماحصل" کے عنوان سے اس تحقیقی مقالے کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں جاوید اقبال نے کوشش کی ہے کہ گزشتہ ابواب کے تمام مباحث کا ایک اجمالی و مختصر خاکہ منظر عام پر لایا جائے۔ "ماحصل" کے طور پر زیر نظر تحقیقی مقالے کے مندرجات کا جواز پیش کیا گیا ہے اور ان ابواب کے مباحث کی اہمیت اور قدر و قیمت بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

شعری اصناف:

اُردو ادب نثر اور نظم (شاعری) پر مشتمل ہے۔ نثر ی کی دو اقسام ہیں جن میں افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر شامل ہیں۔ ان کو داستانوی اور غیر داستانوی اصناف سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اُردو شاعری کی معروف اصناف میں غزل اور نظم شامل ہیں۔ غزل ابتدا میں محبوب کے حسن و جمال کے تذکرے اور گلے شکوے تک محدود تھی۔ مگر جدید عہد میں اس میں غم یار کے ساتھ غم دنیا بھی شامل ہے۔ جس سے اس کے مضامین میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ غزل کے علاوہ نظم کی صنف اردو شاعری کی معروف صنف ہے۔ اس میں کسی خاص موضوع کو سامنے رکھتے ہوئے اسے شعر کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ نظم کے چیدہ چیدہ موضوعات میں حمد، نعت، منقبت، مناجات، مرثیہ، شہر آشوب، ہجو، قصیدہ، واسوخت نمایاں ہیں۔ جبکہ ہیئت کے اعتبار سے مثنوی، رباعی، مسدس، معریٰ، مسمط، ترکیب بند، مستزاد، پابند نظم، آزاد نظم، نثری نظم وغیرہ شامل ہیں۔ ذیل میں اُردو کے شعری ادب کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستانی جامعات میں کی گئی تحقیقی کاوش کا تجزیاتی مطالعہ پیش ہے۔

موضوع مقالہ: " جدید اُردو غزل کے فلسفیانہ پہلو "

مقالہ نگار: سیدہ رابعہ رضوی، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر سعادت سعید، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

تحقیق کوئی بھی ہو یہ انسان سے ایک خاص نوع کی استعداد اور صلاحیت کا تقاضا کرتی ہے، تحقیق میں نفسیاتی اور سماجی عوامل کی چھان بین بہت ضروری ہوتی ہے۔ تخلیقی عمل کو معلوم حقائق کی روشنی میں جانچ پرکھ کر اس کے اندر چھپے ہوئے نامعلوم اور خوابیدہ حقائق کی تلاش کی جائے یا پھر معلوم حقائق کی توسیع یا صحیح کا فریضہ انجام دیا جائے تو یہ کام انہماک، مسلسل توجہ، غور و فکر اور انتہائی گہری احتیاط سے سر انجام پاتا ہے۔ تحقیق کا بنیادی حق ادا کرنا بہت مشکل ہے، محض صفحات کو سیاہ کر دینا ہی تحقیق نہیں۔ اس کا بنیادی فریضہ تگ و دو کرنا ہے اپنے وجود کو تیاگ کر تحقیق کے تقاضوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ مشرق و مغرب کے ادبی و تہذیبی اور سماجی مسائل ہوں یا ہماری اپنی زندگی کے دکھ درد اور غم، ادب اور زندگی کا کوئی معاملہ فلسفے کی دسترس سے باہر نہیں رہا۔

ہر معاشرے وسماج کا اپنا کوئی نہ کوئی فلسفہ حیات ہوتا ہے جس پر اس کی ثقافت، تہذیب اور سماجی اداروں کی اساس ہوتی ہے۔ فلسفے کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ قومی زندگی میں فلسفہ روح کی حیثیت رکھتا ہے ایک عام انسان جو شعوری طور پر فلسفہ حیات سے آگاہ نہ ہو وہ اپنے سماج کے افراد کی اجتماعی اور قومی زندگی کے تقاضوں کا شعور کس طرح حاصل کرتا ہے یہ بہت دشوار ہے۔ خیال کا وجود کے ساتھ تعلق کا سوال بنیادی سوال ہے، کیونکہ اس کے جواب پر دیگر تمام مسائل یعنی کائنات کی وحدت، کائنات کی نشو ونما کے قوانین ، کردار علم کی ماہیت اور دنیا کی آگاہی حاصل کرنے کے طور طریقوں کے مسائل کا انحصار ہے۔ دنیا میں مادی اور روحانی مسائل کے علاوہ کچھ موجود نہیں، چنانچہ فلسفہ کے اس بنیادی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کئے بغیر ایک فلسفیانہ نظام کی تشکیل کرنا ممکن نہیں۔ دور جدید کے فلاسفہ میں برطانوی فلسفی "ہیوم" جو فلسفے کے امام سمجھے جاتے تھے، اس نے منطقی تجربے کی بنا پر ذہن اور ذات اور علمیت کے تعقلات کو نئے مفہوم دیئے اور فہم عامہ کی جہالت کو بھی واضح کیا۔ فلسفے کو فرد کی زندگی، تجربے اور اس کی تاریخی صورت حال سے گہرائی سے مربوط ہونا چاہئے فلسفے کا آغاز چونکہ فرد کی زندگی، تجربے اور شخصی علم سے ہوتا ہے اس لئے اس میں وجودیت، تجریدی نظام سب عمل کرتے ہیں ۔ مارکسیت ، افلاطون کے نظریات، منطق، عقل محض کی آویزش، مابعد الطبیعاتی نظام، انسانی ذات اور ذہن کا منطقی تجزیہ، تعقلات وعلیت، علت ومعلول، لسانی تحلیل، فلسفے کا جنم، فلسفیانہ بصیرت اور اس کا تخلیقی فکر کے ساتھ مربوط ہونا، سائنسی بصیرت، فلسفہ الہیات، دنیا کی وحدت، علم کی ماہیت، دنیا سے آگاہی، انقلابی جدوجہد، ہیراقلیکس کے نظریات، جاگیردرانہ نظام، مغربی فلسفے سے واقفیت کے ایک نظام کو فروغ دیتی ہے۔ جہاں تک عقلی تجربے اور وجدان کی وحدت کا تعلق ہے اس حوالے سے حقیقت کا علم بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے۔

دور جدید میں انسان کی ترقی ، مادی اعتبار سے حیرت انگیز ہے مگر اس کی روح کو آسودگی نہیں ملتی ، مشینی دور کی آمد کے ساتھ انسان کو بعض نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اقدار کی شکست وریخت، دور جدید کے نت نئے فلسفوں اور ہر آن بدلتے خیالات نے شعرا کو بھی نہ صرف حیات وکائنات کی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے بلکہ یہ مسئلہ ان کے لئے عرفان ذات کے حوالے سے اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ جدید شاعروں کے احساس تنہائی، بے بسی، داخلی انتشار، نا آسودگی، روحانی کرب اور مجروح انا کے مختلف روپ شاعری میں نظر آتے ہیں۔ تجریدیت، علامت نگاری، تجریدہ تقسیم کی بحث اور ایسی فلسفیانہ تحریکوں نے اردو ادب میں مغربی اثرات کو فروغ دیا ہے۔ جدید اردو نظم کی اجارہ داری نے جدید غزل میں قدیم کلاسیکی غزل کے خیالات

کو مدہم کر دیا ہے۔ نظم کا جمالیاتی شعور ہر حال میں مقدم ہے، نظم کی اجارہ داری اور اس میں رائج اور نمایاں فلسفہ کسی اجتماعی نقطہ نظر یا اسلوب کی یکسانیت کے بجائے شخصی یا ذاتی طرز احساس پر مشتمل ہے۔ نئی نظم کو ایک ایسی تنظیمی اکائی میں ڈھالا جانے لگا ہے جس میں ہیت اور اسلوب کو تجربہ اور موضوع کے ساتھ یک جان کر کے زبان کے تخلیقی استعمال کو بروئے کار لایا جارہا ہے، ایسے میں نئے فن پارے معرض وجود میں آنے لگے ہیں جو نہ صرف انفرادی تجربوں اور نئی علامتوں کے آمیزہ سے تکمیل کا احساس دلانے لگے ہیں بلکہ تدریجی ارتقا کی بدولت ہر مصرع دوسرے مصرعے سے ایک کُل کے جزو کی طرح مربوط ہو کر تخلیق کو ایک نامیاتی اکائی میں بھی ڈھالنے لگا ہے۔ ایسے دور میں جدید غزل میں آزاد غزل، اینٹی غزل، نثری غزل، بحرین، ذو بحر میں غزل اور مغربی غزل نے بھی اس مخصوص فضا میں تجربے کی تجسیم کی ہے لیکن ایک بنیادی تبدیلی کے ساتھ جہاں انسانی تعلق خاطر (Human concern) کے اساسی تاریخی شعور کے ساتھ منعکس ہوتی ہے وہاں تخلیق کار کی سماجی و شعری حسیت ایک نئے مدار میں داخل ہوتی ہے اور غزل کے فن کو ایک نئی سمت میں ڈال دیتی ہے۔ جدیدیت کی انفرادیت اور پس نو آبادتی(Post colonial) کے منظر نامے سے مربوط دکھائی دینے لگتی ہے۔

اس پس منظر میں جدید غزل پر بات کرنا بہت مشکل ہے جہاں نظم اور غزل کے مضامین ایک ہی نوعیت اختیار کر گئے ہیں، جدید غزل میں بھی مخصوص ہیت اور ساخت کی غزلیں لکھی جارہی ہیں، دور جدید میں نظم کا سانچہ مختلف صورت اختیار کر گیا ہے۔ غزل اپنا ایک سانچہ اور انداز رکھتی ہے لیکن انفرادیت کا رنگ نظموں سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ شعرانے نظم میں شعوری طور پر سائنسی پیش رفتوں اور بعض سائنسی تصورات اور اصطلاحات کو برتا ہے لیکن یہ سائنسی شعور غزل میں بھی نظر آتا ہے وہ ان موضوعات کو اپنے باطن کے ہر رنگ میں بھی پیش کرتے ہیں۔ جدید شعرانے غزل کو زندگی سے ہمکنار ہی نہیں کیا بلکہ فطرت اور کائنات کے مظاہر کو محسوس بھی کیا ہے۔ غزل نے ماضی سے حال تک کا جو سفر طے کیا ہے اس میں وہ جدید غزل تک پہنچتے پہنچتے بہت سے مراحل سے گزری ہے۔

سیدہ رابعہ رضوی کا تسوید کردہ مقالہ بعنوان " جدید اُردو غزل کے فلسفیانہ پہلو "پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "جدید اردو غزل اور فلسفہ: بنیادی مباحث" کے زیر عنوان ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں فلسفہ کی تعریف و توضیح، فلسفہ کی اقسام پر توجہ دی گئی ہے۔ غزل کے بنیادی مباحث کیا ہیں؟ فلسفہ اور شاعری کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ اور جدید اردو غزل میں فلسفیانہ عناصر اور ان کی موجودگی کا تعین کس طرح کیا جائے گا، اس

کے علاوہ ہندوستانی غزل اور ہماری کلاسیکی روایت کیا ہے فلسفہ اس میں اپنے کس رنگ ڈھنگ میں نظر آتا ہے ؟اس باب کے نمایاں موضوعات ہیں۔ مقالے کا دوسرا باب "جدید اردو غزل کا فلسفیانہ تناظر" ہے جس میں مختصراً جدید اردو غزل کا فلسفیانہ تناظر پیش کیا گیا ہے۔

اُردو غزل کی قدیم روایت، کلاسیکی اور جدیدیت کا سنگم، ۱۹۶۰، ۱۹۷۰، ۱۹۸۰ کی دہائی اور بیسویں صدی میں غزل میں کیا تبدیلیاں اور کم و بیش کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں اور شعرا نے جدیدیت کے سنگم پر کھڑی غزل میں اصلاحی اور تفہیمی انداز میں کیا تبدیلیاں کی ہیں؟ کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ تیسرا باب "حالی سے اقبال تک کی غزل" پر محیط ہے۔ مقالے کا چوتھا باب "جوش سے شہزاد احمد تک" پر محیط ہے جس میں تمام نئے اور جدید تر شعرا شامل ہیں، جوش شاعر انقلاب، احسان دانش، فلسفہ، رومانیت، مارکسیت، ہجرت تنہائی، اداسی، جدید تر فلسفیانہ تحریکیں، جدیدیت، وجودیت، لسانی تشکیلات، علامت نگاری کو کس طرح شعرا نے اپنی غزلوں میں اشعار میں استعمال اور برتا ہے، اس باب کے اہم عنوانات ہیں۔ مقالے کا پانچواں باب "محاکمہ" ہے، اس باب میں تمام ابواب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ فلسفہ اور غزل کا تعلق، بنیادی مباحث اُردو غزل، جدید اردو غزل کی حدود و قیود، اس کے متنوع جہات فلسفیانہ تناظر، فلسفیانہ مغربی تحریکوں کے جدید اردو غزل پر اثرات، غزل کی ساخت، ہیت، آزاد، نثری، جنسی غزل کیا ہے اور کن شعرا کے ہاں زیادہ اثرات نمایاں ہیں ان پر بحث کر کے نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: " کلاسیکی اُردو غزل کا احیائے جدید اور سراج الدین ظفر کی ادبی خدمات "

مقالہ نگار: شبانہ امان اللہ، 2015ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کسی بھی زبان کے ادب کو پروان چڑھنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ادبا انفرادی، اجتماعی اور کبھی تحریکوں کی صورت میں ادبی تخلیقات کی آبیاری کرتے ہیں۔ وہ خون جگر سے انھیں سینچ کر تناور درخت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ تراش خراش اور کاٹ چھانٹ کے مراحل طے کرتا ہوا یہ ادب دنیائے علم و ہنر پر ان مٹ نقوش ثبت کر دیتا ہے۔ اُردو زبان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ادبی سرمایہ زمانے کے نشیب و فراز کا سامنا کرتے ہوئے ترقی کی منازل طے کرتا رہا۔ عہد بہ عہد تبدیلیوں کی غمازی کرتا یہ ادب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ہار کے بعد ایک بہت بڑی تبدیلی کا حصہ بنا۔ اصناف نثر و نظم کو بے شمار تغیرات اور تجربات سے گزرنا پڑا۔ یہ واقعہ جہاں ہندوستانیوں کی ہزیمت اور احساس شکست کا باعث بنا وہاں

تہذیب وتمدن اور ادب کے ڈھانچوں کو بھی بدلنے کا سبب بنا۔ پورا معاشرہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار ہوا۔ مغربی دنیا کے اثرات سماج کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی در آئے۔ لہٰذا نظم و نثر بھی ان اثرات سے دامن نہ بچا سکے۔ اردو شاعری میں مغرب پرستی کے نتیجے میں ہدف ملامت اور تنقید کا مرکز بننے والی صنف غزل ٹھہری اور اُردو شاعری کی آبرو کہلانے والی صنف سخن کو نیم وحشی صنف قرار دے کر اس کی گردن مار دینے کی تجاویز سامنے آئیں۔ نظم کو فروغ دے کر غزل سے عمداً اعتماض برتا جانے لگا۔ ان حالات میں غزل کے دفاع کی تحریک اٹھی اور جدید اردو غزل کے فروغ کے لیے حسرت موہانی سے لے کر قیام پاکستان کے بعد تک کوششیں جاری رہیں۔ جن شعرانے اردو غزل کی ثروت میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحتیں وقف کیں ان میں سے ایک سراج الدین ظفر بھی ہیں۔

سراج الدین ظفر اردو غزل کی روایت کی پاسداری اور روایت میں جدیدیت کی آمیخت سے اپنے اسلوب میں منفرد اندازِ سخن رکھتے ہیں۔ ان کا اخانوادہ بھی علمی وادبی خدمات کے ضمن میں اختصاص کا حامل ہے۔ مقالہ نگار شبانہ امان اللہ کا تحریر کردہ یہ تحقیقی مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول سراج الدین ظفر کے خانوادے کی علمی وادبی خدمات اور اُن کے احوال و آثار پر مبنی ہے۔ اس باب کے آخر میں ظفر کی تخلیقات کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم کلاسیکی اُردو غزل کے احیائے جدید کے لیے کی جانے والی کوششوں کے جائزے پر مبنی ہے۔ مدافعین غزل اور معاندین غزل کے نظریات کو پیش کر کے اس صنف سخن کے ارتقا، اس میں کی جانے والی تبدیلیوں اور ظفر کے دور تک غزل کی مقبولیت اور دوام کی وجوہات کا جائزہ لیا گیا۔ باب سوم میں ظفر کی غزلیات کا موضوعاتی اور فکری جائزہ لیا گیا۔ ان کے کلام کا فکری ارتقا اور موضوعات کے تنوع کو اشعار کی مدد سے پیش کر کے ظفر کی شخصیت کے نمایاں خدوخال کو واضح کیا گیا اور اُن کے فکری رویوں کا تعین کیا گیا ہے۔ باب چہارم ان کے غزلیہ کلام کا فنی جائزہ ہے۔ ظفر کے اسلوب کے نمایاں پہلو اجاگر کر کے ان کے انداز سخن میں موجود فنی محاسن کی تفصیل بیان کی گئی۔ علاوہ ازیں ان کے پسندیدہ اوزان پر بحث کر کے نتائج مرتب کیے گئے اور ظفر نے اپنے کلام میں جو ردوبدل اور تبدیلیاں کیں، ان کا جائزہ بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

باب پنجم چار فصلوں پر مبنی ہے۔ فصل اول ان کی نظم گوئی کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اس میں ان کی نظموں کا موضوعاتی اور فنی پہلوؤں سے جائزہ لیا گیا۔ دوسری فصل میں اُن کی رباعیات کا تجزیہ کیا گیا۔ تیسری فصل ظفر کے افسانوی مجموعے "آئینے" کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ چوتھی اور آخری فصل ان کی چند تالیفات

کے جائزے پر محیط ہے۔ آخر میں "محاکمہ" پیش کر کے ظفر کے ادبی مقام و مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔ سراج الدین ظفر اپنے انداز بیاں اور اسلوب کی وبدولت اپنے معاصرین میں ایک الگ مقام کے حامل ہیں۔ ان کا کلام سرمستی، جوش اور زندگی کے تحرک سے عبارت ہے۔ خمریات کے تلازمات سے انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کی کئی رنگوں میں ترجمانی کی۔ اس تحقیقی مقالے کے ذریعے ان کی علمی وادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ قابل توجہ اور لائق تحسین ہے۔

موضوع مقالہ: " بیسویں صدی کی اُردو غزل میں جمالیات "

مقالہ نگار: عالیہ عزیز، 2018ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر تقدیس زہرا، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

جمالیات فلسفہ کی اصطلاح ہے جو حسن، اظہارِ حسن اور اس کے اظہار کے نتیجے میں حاصل شدہ کیف ونشاط کے جذبات پر مشتمل ہے۔ انسانی فطرت جمال کی رنگینیوں اور بوقلمونیوں کے طلسم اور سحر انگیزیوں سے محظوظ ہوتی ہے۔ ادب جو انسانی جذبات واحساسات کا آئینہ دار ہے اس احساس سے دور نہ رہ سکا اور فلسفہ سے ہوتے ہوئے جمالیات تک آ گیا۔ یہیں سے جمالیات کی اصطلاح شعر و ادب میں در آئی اور ایک اہم موضوع کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کے اثرات اول اول اہل یونان کے ہاں ملتے ہیں۔ دیومالائی کردار اور دیویوں کا یہ حسن بعد ازاں رومن فن تعمیر اور فن مجسمہ سازی میں نظر آیا۔ اسی تہذیب کی جمالیات کے اثرات گندھارا آرٹ میں بھی منعکس ہوئے۔ ہندی تہذیب پاربتی، سرسوتی اور لکشمی کے حسن سے مرعوب ہے۔ ایلورا کے غار اسی تہذیبی داستان کے عکاس ہیں۔ جمالیات کا ایک بہت بڑا تصور اسلامی و قرآنی تصور ہے۔ حسن مطلق کائنات اور مابعد کی تخلیق کا پرتو ہے اور اسی توازن اور اعتدال کا مظہر ہے جو جمالیات کا خاصہ ہیں۔ یونانی فلسفی فیثاغورث، افلاطون اور ارسطو بھی حسن کے اظہار اور اس کے حسیاتی اثرات کے قائل ہیں۔ مغربی فلسفی ہیگل، کانٹ اور کروچے جمال کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ فلپ، سڈنی، ورڈز ورتھ اور کالرج جیسے شعرانے فطرت کے حسن، تخیل اور Fantacy کے ذریعے جمالیات کو پیش کیا۔

اُردو غزل کے دو بڑے موضوعات تصوف اور حسن و عشق کا اہم عنصر بھی جمالیات ہی ہے۔ اردو غزل کلاسیکی عہد میں قلی قطب شاہ سے ہوتے ہوئے ولی دکنی اور میر تقی میر تک پہنچتی ہے، اس دور میں جمالیات کا غالب رجحان سراپا نگاری ہے۔ خاص طور پر نسوانی حسن کے مختلف پہلوؤں کا بیان ملتا ہے۔ یوں یہ جمالیات نظری و بصری حد تک نظر آتی ہے۔ جدید غزل گو شعرا میں اصغر گونڈوی، جگر مراد آبادی اور

حسرت موہانی قابل ذکر ہیں۔ اس دور کی جمالیات میں جلووں کے حسن کے ساتھ ساتھ جمال فطرت اور حسن مطلق کے حسن کا اظہار بھی ملتا ہے۔ حسی شاعری اور "یاد" کی جمالیات بھی اسی دور میں اپنی جگہ بناتی نظر آتی ہے۔ اسی زمانے میں "اینٹی غزل" کی فضانے کچھ عرصہ غزل کو گوشہ تنہائی میں جانے پر مجبور کر دیا۔ بیسویں صدی کی رومانی تحریک کے اثرات نے غزل گو شعرا کو دوبارہ غزل کو اپنانے پر آمادہ کیا۔ رومانی شعرانے اگرچہ غزل کہی لیکن رومانی خیالات اور جمالیات کا اظہار زیادہ تر صنف نظم میں کیا جانے لگا۔ علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے جمالیات کو غزل کا حصہ بنایا لیکن محسوس ہوتا ہے کہ غزل کا اختصار اور تنگنائے غزل کا شکوہ اُن کے جمالی تصورات کو غزل میں خاطر خواہ سمو نہ سکا، اس مقام پر ایک بار پھر غزل پر عتاب آیا۔ ترقی پسند شعرا اگرچہ ایک سخت منشور پر عمل پیرا رہے لیکن ان کا یہ موضوع نظم ہی کی زینت بنا ، تاہم غزل پھر اُبھر کر سامنے آئی اور "مخدوم محی الدین، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، جان نثار اختر، ظہیر کاشمیری، مجروح سلطان پوری اور شکیل بدایونی" نے اپنی غزل میں جمالیات کا موضوع بہ حسن وخوبی برتا اور غزل کے تغزل کو مجروح نہ ہونے دیا اور ترقی پسند غیر جذباتی منشور کو اس میں جگہ نہ دی گئی۔ حلقہ ارباب ذوق کے شعرانے زیادہ تر نظم نگاری کو فروغ دیا۔ تاہم "قیوم نظر، انجم رومانی اور حفیظ ہشیار پوری" غزل کے میدان میں اترے اور جلووں کے اژدھام کو حسی اور یادوں کی جمالیات کے ذریعے پیش کیا۔

قیام پاکستان بیسویں صدی کے اہم واقعات میں سے ہے، یہ دور جہاں ہجرت اور جدائی کے غم کا موضوع لے کر آیا وہیں شعرا کو ایک ایسا آسودہ اور پر سکون ماحول میسر آگیا جو غزل کی آبیاری میں ممد و معاون رہا۔ اس دور کے شعرانے بصری جمالیات کے علاوہ "حس سامعہ، شامہ اور لامسہ" کے ذریعے جمالیات کو پیش کیا۔ حسن کو صرف دیکھنے کی چیز نہ سمجھا گیا بلکہ اس کو سننا، چھونا اور اس کی مہک کو محسوس کرنا بھی ایک اہم موضوع رہا، ان شعرا کے ہاں کیفیاتی اور محاکاتی جمالیات بھی کثرت سے نظر آتی ہے۔ "یادیں" بھی غزل میں ایک دھیمی دھیمی آنچ سلگاتی ہیں اور نہ صرف کہنے والا بلکہ سننے والا بھی وہ خوشی محسوس کرتا ہے جو جمالی اظہار کے نتیجے کے طور پر اکتساب ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کی اُردو غزل کا مطالعہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جمالیات غزل کا کوئی سطحی اور عمومی رجحان نہیں بلکہ یہ ہر صورت میں غزل کا حصہ بنتی ہے۔ حسن بذات خود بھی حسن ہے اور اس کا اظہار بھی کیف ونشاط کا سبب ہے۔

غزل ایک لطیف صنف سخن ہے جو اپنے اندر جذبات و احساسات کی لطافت اور نزاکت کو سمو لیتی ہے۔ آغاز سے اب تک غزل میں موضوعاتی تنوع کی وجہ بھی یہی ہے، غزل گو شعرا اپنے اپنے دور اور حالات

کے مطابق اس آسمان میں ستارے ٹانکتے رہے ہیں۔ مسعود سعد سلمان سے لے کر آج تک اس صنف نے کئی سر دو گرم موسم دیکھے لیکن بیسویں صدی نے اس صنف کو موضوعاتی لحاظ سے زیادہ متاثر کیا۔ رومانی شعرا، ترقی پسند شعرا، حلقہ اربابِ ذوق اور پھر قیام پاکستان اور مابعد شعرا نے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اس صنف کا انتخاب کیا۔ عالیہ عزیز کے مطابق اس صدی کی غزل کا مطالعہ ایک دلچسپ امر ہے اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ تمام تر ابعاد کے سامنے "جمالیات" ایک ایسا موضوع ہے جس سے کوئی بھی شاعر صرف نظر نہ کر سکا۔ اپنے اپنے منشور پر عمل پیرا ہونے والے جب غزل کی طرف متوجہ ہوئے تو حسن و جمال اور اس کے اظہار سے دامن نہ چھڑا سکے۔ غزل گو شاعروں نے خواہ کسی بھی تحریک یا رجحان کے زیر اثر شاعری کی ہو۔

یہ طے ہے کہ غزل میں جمالیات سے مفر ممکن نہیں۔ زیر تجزیہ مقالہ کا عنوان "بیسویں صدی کی غزل میں جمالیات" ہے۔ مقالہ نگار عالیہ عزیز نے اس مقالے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے جن میں زمانی اور موضوعاتی اعتبار سے غزل کے ارتقائی سفر کو دیکھتے ہوئے جمالیات کے مختلف عناصر کا جائزہ لیا گیا۔ باب اول "جمالیات: بنیادی مباحث" پر مشتمل ہے جس میں جمال اور جمالیات کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم واضح کیے گئے ہیں۔ تہذیبی، فلسفیانہ اور شعری تصورات نیز اسلامی اور قرآنی حوالوں سے بھی جمالیات کی وضاحت کی گئی ہے۔ باب دوم "اُردو غزل میں جمالیات" کے نام سے معنون ہے۔ اس باب میں کلاسیکی غزل میں جمالیات کی روایت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قلی قطب شاہ سے لے کر داغ دہلوی اور بعد ازاں اصغر گونڈوی سے لے کر حسرت موہانی تک کلاسیکی اور جدید غزل گو شعرا کی جمالیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم "بیسویں صدی کے نصف اول کے شعرا کی غزل میں جمالیات" ہے۔ یہ باب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ "الف" میں رومانی تحریک سے وابستہ شعرا کے ہاں جمالیات کا جائزہ لیا گیا اور حصہ "ب" میں ترقی پسند شعرا کی غزل میں جمالیات کے عناصر تلاش کیے گئے۔ اس باب میں علامہ اقبال سے لے کر حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض سے لے کر شکیل بدایونی تک رومانی و ترقی پسند شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم "بیسویں صدی کے نصف آخر کے شعرا کی غزل میں جمالیات" ہے، یہ باب بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ "الف" حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا پر مشتمل ہے۔ جبکہ حصہ "ب" قیام پاکستان کے بعد کے شعرا کی غزل میں جمالیات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں تقریباً ان تمام غزل گو شعرا کو شامل کیا گیا ہے جن کی غزل میں جمالیات ایک نمایاں رجحان کے

طور پر سامنے آئی ہے۔ چند ہندوستانی غزل گو جو جمالیات کے ضمن میں رجحان ساز ثابت ہوئے وہ بھی اس باب میں شامل ہیں جن میں بشیر بدر نمایاں ہیں۔

موضوعِ مقالہ: " برطانوی ہندوستان میں اُردو کے مغربی شعرا "

مقالہ نگار: عبد السعید، 2016ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

سرزمین ہندوستان پر مختلف مغربی اقوام قریباً ساڑھے چار سو سال یعنی ۱۴۹۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کسی نہ کسی شکل میں مسلط رہیں البتہ اس عرصہ قیام و عمل میں اہلِ انگلستان کو دوسری تمام مغربی اقوام پر فوقیت حاصل ہے، ان اقوام کے ہندوستان میں ورود کا بنیادی مقصد تو تجارت تھا لیکن جب انھیں سولہویں اور ستر ہویں صدی کا ہندوستان قدرتی وسائل، مادی ذخائر، سیاسی استحکام اور علوم فنون سے مالا مال نظر آیا تو یہ اس پر حکمرانی کے خواب بھی دیکھنے لگیں۔ تجارت و سیاست کے اس کھیل میں انھیں ہندوستانی طرز معاشرت اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی علوم و السنہ کے حصول کی ضرورت بھی پیش آئی تو اُس کے نتیجے میں ایسی علمی تحریک برپا ہوئی جس نے اردو زبان و ادب کے تخلیقی سرمائے میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس تخلیقی سرمائے کا ایک اہم حصہ شاعری ہے۔ ہندوستان کو مستقل یا عارضی مسکن بنانے والے مغربی شعرائے اردو میں سے بعض تو نو مشق و نو آموز محض چند اشعار کے حامل تھے لیکن بعض قادر الکلام اور کہنہ مشق شعرا کے طور پر سامنے آئے۔ ان شعرا کے سوانحی احوال اور شعری تخلیقات و تصانیف کا تذکرہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کا ایسا مستقل اور نہایت اہم باب ہے جس کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ تشنہ و نامکمل رہے گی۔

اردو زبان و ادب کے بعض تذکروں، تاریخی کتب، تحقیقی مقالات اور مضامین میں اردو کے مغربی شعرا کا ذکر تو کہیں کہیں مل جاتا ہے لیکن یہ اس قدر نامکمل اور غیر مربوط ہے کہ نہ اس سے قاری کی تشفی ہوتی ہے نہ کسی محقق کو اطمینان بخش رہنمائی میسر آتی ہے جبکہ مذکورہ شعرا کی شاعری اپنی کمیت یا فنی و فکری حیثیت کے حوالے سے ایک یکجا اور مربوط یا فنی مطالعے کی متقاضی تھی۔ مقالہ بحوالہ عنوان بالا اسی علمی تقاضے کا مرہونِ منت ہے جس سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کے ایک تشنہ باب کے مکمل ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ اس مقالے کے تجزیاتی مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قبل ازیں اس اہم علمی وادبی موضوع پر کوئی مربوط اور مکمل تحقیقی مطالعہ پیش نہیں کیا گیا حالانکہ یہ موضوع تاریخی، اہمیت علمی ضرورت اور ادبی وقعت کے سبب تفصیلی مطالعے کا مستحق ہے۔ تحقیق کے میدان میں نوع انسانی کی بہت بڑی خدمت یہ ہے

کہ اس کے عہدِ حاضر کی تمام تر علمی ترقیات کو ماضی کی روایات سے مربوط کر کے مستقبل کی نقشہ گری کی جائے۔یہ تحقیقی مقالہ اسی اصول کی کار فرمائی میں اردو زبان وادب کی ایک گم شدہ کڑی کو بازیافت کرنے کی کوشش ہے۔مقالہ نگار عبد السعید کے مطابق:

> " اس مقالے سے پہلے اردو کے مغربی شعرا کے ذکر،سوانحی معلومات اور نمونہ کلام پر مشتمل رام بابو سکسینہ کی کتاب "Indo European & European Persian & Poets of Urdu" ،شفقت رضوی کی تالیف" اردو کے یورپین شعرا"، محمد سردار علی کا" تذکرہ یورپین شعرائے اردو"' محمد یوسف الدین خواجہ کا" تذکرہ یورپین اور انڈو یورپین شعرائے اردو"،ڈاکٹر مس رضیہ نور محمد کے تحقیقی مقالے "اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ"،ڈاکٹر جواز جعفری کے تحقیقی مقالے "اردو ادب یورپ اور امریکہ میں" اور ڈاکٹر ذوالقرنین احمد (شاداب احسانی) کے تحقیقی مقالے " کوئین فراسو۔ حیات و خدمات بحوالہ خصوصی قصۂ عشق افزا"کے علاوہ کچھ تذکروں اور چند مختصر مضامین میں اردو کے مغربی شعرا کے سوانحی حالات یا نمونہ کلام کے ضمن میں کچھ معلومات تو ضرور ملتی ہیں۔ لیکن ان تالیفات کو معلوماتی مآخذ کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ان میں جا بجا فنی و فکری تجزیے، زمانی ترتیب اور تحقیقی مطالعے کا فقدان نظر آتا ہے"۔(23)

تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ ہر عہد میں عصر حاضر کی علمی ترقیات کو ماضی کی علمی روایات سے مربوط کرنا اہلِ فکر و دانش کی اوّلین ترجیح رہی ہے چنانچہ یہ تحقیقی مقالہ بھی ماضی کی تاریخ اجاگر کرنے اور اہل اردو کے ساتھ ساتھ غیر اردو اقوام میں اردو زبان و ادب کی ترویج نو کا رستہ ہموار کرنے کی ایک کاوش ہے۔ اس مقالے کا باب اول "اُردو شاعری کی روایت "پر مشتمل ہے جس میں اردو زبان کی ابتدا، شعر کے مفہوم ،شاعری کی مختلف تعریفات، اُردو شاعری کے پس منظر، اردو شاعری کے آغاز، اردو شاعری کے ارتقا، چند معروف اور مروجہ اصناف شعر یعنی غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ، حمد، نعت وغیرہ کا تاریخی ،ہیتی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مغربی اقوام کی ہندوستان میں آمد کے زمانے میں ہندوستان کا ادبی و شعری منظر نامہ کیا تھا اور اردو زبان وادب کی ترویج و اشاعت کے لیے علمی فضا کس قدر ساز گار تھی۔

باب دوم بعنوان "اہلِ مغرب کی ہندوستان آمد" دو فصول پر مبنی ہے۔ پہلی فصل مغربی اقوام کے ہندوستان میں ورود کا احاطہ کرتی ہے۔ اس فصل میں تاریخی حقائق اور جغرافیائی حالات کے پیش نظر مغربی اقوام کی ہندوستان آمد اور یہاں قیام کے دوران ان کی تجارتی وسیاسی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس فصل میں مغربی زبانوں کے ہندوستان کی مقامی زبانوں پر اثرات، اہلِ مغرب کی ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو میں دلچسپی اور ان کے قائم کردہ تعلیمی اداروں، اورینٹل سیمینری، فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی اردو زبان وادب کے حوالے سے تدریسی، تصنیفی اور تالیفی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم بھی دو فصول میں منقسم ہے۔ فصلِ اوّل میں اجمالی انداز سے مغربی اقوام میں اردو شاعری کے اولین آثار اور ہندوستان کا شعری منظر نامہ پیش کیا گیا ہے جب کہ فصل دوم اردو زبان کے اکیاون انگریز شعرا کے مختصر سوانحی حالات، تصنیفات و تالیفات، فنی و فکری تجزیے اور نمونہ کلام کی آئینہ دار ہے۔ باب چہارم غیر انگریز مغربی شعرا کی اردو شاعری پر محیط ہے۔ یہ باب بارہ پرتگالی شعرا، دو جرمن شعرا، تین اطالوی شعرا، اٹھارہ فرانسیسی شعرا اور پانچ امریکی شعرا و شاعرات کے سوانحی حالات، تصنیفات و تالیفات ،فنی وفکری تبصرے اور نمونہ کلام کی عکاسی کرتا ہے، اس باب کے بعد محاکمے کی روشنی میں کچھ نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

موضوع مقالہ: " اُردو شاعری میں پاکستانی ثقافت کے عناصر "

مقالہ نگار: طارق محمود، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر رابعہ سرفراز، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

افراد کا مل جل کر رہنا اور مشترک مفاد کے لیے جدوجہد کرنا معاشرے کو جنم دیتا ہے۔ ایک معاشرے میں رہتے ہوئے لوگ رہن سہن کا جو انداز اختیار کرتے ہیں اُس سے ثقافت وجود میں آتی ہے۔ ادب کو معاشرے کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ ادب معاشرہ، تہذیب و تمدن اور ثقافت کا عکاس ہوتا ہے۔ پاکستان کا قیام ۱۹۴۷ء کو ہوا۔ پاکستان کے قیام میں ایک طویل خون سے رنگین جدوجہد شامل ہے۔ اس کے معرض وجود آنے میں دو قومی نظریے کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ دو قومی نظریے کا لب لباب ہے کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم ہیں۔ ان کا رہن سہن یعنی ان کا طرز معاشرت اور طرز حیات غیر مسلم اقوام سے الگ ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت ہندوؤں سے منفرد ہے۔

پاکستان ایک ایسے خطہ ارض کا نام ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ کسی بھی معاشرے کے طرز حیات میں مذہب کو بنیادی اساس کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی ثقافت میں اسلامی جھلک نظر آتی ہے۔ اس معاشرے کی اقدار میں بھی رواداری، صبر و تحمل، برداشت اور ہمدردی شامل ہیں۔ اس طرح رسم و رواج میں بھی دوسری قوموں سے الگ رجحانات نظر آئیں گے۔ ہر زمانے اور زبان کا ادب معاشرتی اور تہذیبی رویوں کا عکاس ہوتا ہے۔ اسی طرح پاکستانی ادب نثر میں ہو یا نظم کی صورت میں، اس میں یہاں کی تہذیب اور معاشرت کے گہرے اور نمایاں نقوش موجود ہیں۔

معاشروں میں روایات واقدار کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ثقافت کی ترسیل زندہ قوموں کی علامت ہے، جو قومیں اپنی ثقافت کی حفاظت نہیں کرتیں وہ اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ ہر معاشرے کی اپنی امتیازی ثقافت ہوتی ہے اور اس پر ہر وقت بیرونی یلغار رہتی ہے۔ اگر اپنی ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لیے آبیاری نہ کی جائے تو پھر بدیسی ثقافت حاوی ہو جاتی ہے۔ ثقافت کی ترسیل اور حفاظت کے بہت سے ذرائع اور وسائل ہیں۔ شاعری اُن میں سے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ آئی۔ اے رچرڈ نے شاعروں کو ثقافتی روایات و اقدار کا امین قرار دیا ہے۔ ماضی کے دریچوں میں جھانکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں کی تہذیب، تمدن اور ثقافت ادب میں پنہاں ہوتی تھی۔ ان نثری و نظمی ادبی اصناف میں معاشرتی تصویر، قوم کا رہن سہن اور رسوم و رواج کو ادیب و شاعر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ مجسم صورت میں سامنے کھڑی نظر آتی ہیں۔ جس طرح ادب، معاشرہ کا ترجمان ہوتا ہے بعینہ ثقافت افکار و عقائد، اقتدار، رسم و رواج اور تہذیب کی عکاس ہوتی ہے۔ اگر ثقافت کی ترسیل رُک جائے اور اس کے فروغ میں رکاوٹ آجائے تو قومی تشخص مجروح ہوتا ہے۔ جدید اردو شاعری میں موجود ثقافتی جھلکیوں کو نمایاں کرنا اور اُن کو زیادہ سے زیادہ ایک جگہ مرقوم کرنا وقت کی آواز بھی ہے اور ضرورت بھی ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں نے بڑی تیزی سے کروٹیں لی ہیں۔ میڈیا نے ترقی کی ہے اور دنیا ایک گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ بین الاقوامی ثقافتی یلغاروں نے پاکستانی ثقافتی تشخص کو ختم کرنے کی بہت سی مساعی کی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی ثقافت کے رجحانات کو نمایاں ہونا چاہیے۔ اب ان کا رنگ ماند پڑتا جا رہا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ دہشت گردی اور تخریب کاری نے پاکستان ثقافت کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ درج بالا وجوہات کی بنا پر پاکستانی معاشرت اور طرز حیات یعنی ثقافت پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں جس سے اخلاقی اقدار کا معیار پست ہوا ہے۔ محبت، اخوت، بھائی چارہ، ایثار و قربانی کا جذبہ مفقود ہو گیا ہے اور

اس کی جگہ ہوس، لالچ، خود غرضی، نفرت و کدورت جیسے اخلاق رذیلہ نے لے لی ہے۔ اگر قیام پاکستان کے قریب تر کے عہد میں دیکھیں تو لوگوں کا جذبہ حریت عروج پر تھا۔ لوگوں کی زندگی میں رونق اور چہروں پر خوشی کے آثار نمایاں تھے اور اس طرح محبت واخوت اور بھائی چارہ کا جذبہ عروج پر تھا۔ افراد میں ملک کے استحکام کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ پھر رفتہ رفتہ روپیہ پیسہ کی دوڑ شروع ہوگئی ہر طرف نفسا نفسی کا عالم چھا گیا۔ معاشرے کے استحکام کی طرف توجہ کم ہوگئی جس سے ثقافتی اقدار کے فروغ کو نقصان پہنچا، کس بھی ملک کے ثقافتی رجحانات پر مذہب کے بعد اقتصادی و سیاسی اور خارجی اثرات کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ثقافتی فروغ کے ادارے اپنے جوہر کے مطابق کام نہیں کر سکتے۔ اسی قسم کے حالات سے پاکستانی ثقافت دوچار ہوتی ہے جس سے اس میں بڑے نشیب و فراز آئے ہیں مگر پاکستانی ادیب اور شاعر اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوئے۔

طارق محمود کے لکھے گئے اس تحقیقی مقالہ سے پاکستانی ثقافت کے عناصر کی نشاندہی کرنے میں ضرور مدد ملے گی اور یہ مقالہ اس کے فروغ میں مدد و معاون ثابت ہو گا۔ اُن کا مذکورہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل "ثقافت اور جدید اردو شاعری کا تعلق: تمہیدی مباحث" ہے۔ اس باب میں پاکستانی ثقافت اور جدید اردو شاعری کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ باب دوم ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء تک کے دور پر محیط ہے۔ جس میں پہلے دور کی غزل، نظم اور دیگر اصناف سخن سے پاکستانی ثقافتی عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب سوم ۱۹۶۱ء تا ۱۹۸۰ء کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں مذکورہ دور کی غزل، نظم اور دیگر اصناف سخن سے پاکستانی ثقافتی عناصر کا جائزہ لینے کی سعی شامل ہے۔ باب چہارم ۱۹۸۱ء تا حال ہے۔ جس میں تیسرے دور کی غزل نظم اور دیگر اصناف سخن سے پاکستانی ثقافتی عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

1947ء سے ۱۹۵۷ء تک شعرا کا طرز بیان بعد کے شعرا سے منفرد ہے۔ بہت سے شعرا حضرات جنھوں نے اپنے کلام میں پاکستانی ثقافت کے رنگ بکھیرے ہیں جیسے "ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیاری، قتیل شفائی، جمیل الدین عالی، مختار صدیقی، ضیاء جالندھری، احمد فراز، حمایت علی شاعر، اظہر نفیس، منیر نیازی، عبداللہ علیم، شہزاد احمد، صہبا اختر، سلیم احمد، مشفق خواجہ، شبنم رومانی، جون ایلیا، شعیب بن عزیز، پروین شاکر، عباس اطہر، عطاء الحق قاسمی، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، ن۔م۔ راشد، فرحت عباس، عبدالعزیز خالد، حبیب جالب، کشور ناہید، قیوم نظر اور اجمل نیازی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور شعرا بھی ہیں جنھوں نے پاکستانی ثقافت کو گاہے بگاہے موضوع شعر بنایا ہے۔ درج بالا ضرورت و اہمیت اس بات کی متقاضی رہی ہے کہ جدید

اردو شاعری میں پاکستانی ثقافت کے رجحانات کی نشان دہی کی جائے اور جس طرح شاعری نے اس کی بقا اور احیا کی کوششیں کی ہیں اس کو ایک مقالے کی صورت میں یکجا کیا جائے تا کہ ثقافت کے فروغ کا اہتمام کیا جا سکے۔ پاکستانی ثقافت کو بین الاقوامی طور پر اُجاگر کرنے کی کوشش کو دوام بخشا جا سکے اور مقامی طور پر بکھرے ہوئے ثقافتی پھولوں کو یکجا کیا جا سکے۔

موضوعِ مقالہ: " جدید اُردو نظم میں انسان دوستی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ "

مقالہ نگار: نصرت جبین، 2017ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی، وفاقی اُردو یونیورسٹی اسلام آباد

انسان دوستی کو انگریزی میں Humanism کہا جاتا ہے، یہ ایسا نظریہ ہے جو انسانی تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی طور موجود رہا ہے لیکن باقاعدہ طور پر ادب و فن میں اس اصطلاح کو یورپی احیائے علوم کی تحریک کے آغاز کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ یہ نظریہ ایک تحریک کی صورت میں بھی اسی عہد میں ابھر کر سامنے آیا۔ تاہم بعد میں اس اصطلاح کو مذہبی اور سیاسی تعلیمات اور تحریکوں میں بھی استعمال کیا گیا ۔ہیومینزم، لاطینی زبان کے لفظ (Humanitas) سے ماخوذ ہے۔ جس کا لفظی مطلب "انسان دوستی" یا "انسانیت" ہے۔ یہ نظریہ عظمت انسانی اور اعلیٰ اقدار کا متقاضی ہے اور چونکہ یہ انسان اور انسانیت کی فلاح و بہبود اور اس کی بہتری کا دعویدار ہے اس لیے آج بھی زندہ و جاوید ہے۔ ہیومنزم دراصل امن کا حامی ہے ایسا امن جس میں انسانیت پروان چڑھ رہی ہو اور اسے اندرونی اور بیرونی طور پر کسی فتنہ و فساد کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ لوگوں کے حقوق محفوظ ہوں۔ معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ کمزور اور زیر دست افراد توانا اور مضبوط ہوں۔ ظالم اور مفسدوں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔ قوم کے افراد میں ہم آہنگی بدرجہ اتم موجود ہو۔ اسی صورت میں انسانیت کی بقا اور ترقی ممکن ہے۔ جن معاشروں میں بدامنی کا راج ہوتا ہے وہ جلد انتشار کا شکار ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اٹلی میں "دوستی" کو نئے سرے سے عروج حاصل ہوا اور اس تحریک کا نام "انسان پرستی" بھی اسی زمانے میں پڑا۔ انسان پرستی کے فلسفے کے تحت انسان کو کائنات کا مرکز و محور سمجھا جاتا ہے۔ یہ فلسفہ مکمل طور پر انسانی زندگی کا مطالعہ اور اس کی ترقی کی کوشش کرتا ہے، اس تحریک نے ایک طرف تو مروجہ دقیانوسی توہمات سے اپنا دامن چھڑایا اور دوسری طرف علمی اور روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے قدیم یونانی اور رومی ادبیات سے اپنا رشتہ قائم کیا۔ انسان پرستی کا نصب العین یہ ہے کہ

وہ انسانی فطرت میں موجود چھپی صلاحیتوں کو سامنے لائے اور انسان کی موجودہ زندگی کو اعلیٰ بنانے کی کوشش کرے۔حیات، بعد الموت، مافوق الفطرت اور توحید کے مسائل سے انسان پرستی کا کوئی تعلق نہیں، ہیومنزم انفرادی آزادی کا بھی قائل ہے اور اس کے تسلیم کیے جانے پر بھی زور دیتا ہے۔ آزادی کی قدر افزائی در حقیقت انسان دوستوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ ان کو ایسی آزادی سے دلچسپی ہے جس کو انسان فطرت اور معاشرے میں بروئے کار لا سکے۔کیونکہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے جسے وہ اپنی دنیا تعمیر کرنے، اسے بدلنے اور ترقی دینے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

انسان دوستی در حقیقت ایک عقیدہ ہے۔ایک ثقافتی تحریک، ایک تعلیمی پروگرام ہے جو صرف انسان سے مخصوص ہے۔ یہ انسان کو دائرہ انسانیت میں رکھتے ہوئے مثالی انسان بناتی ہے۔ انسان کی صلاحیتوں اور کامرانیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے عظیم بناتی ہے۔ انسان دوستی کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو عظیم بنانے والی چیز خود اس کی ذات میں پوشیدہ ہے، وہ کسی اور ذات کی عطا کردہ نہیں ہے۔ انسان کائنات کی افضل ترین مخلوق ہے۔اسے کائنات کا مرکز و محور گردانا جاتا ہے۔ تمام مذاہب عالم میں انسان کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں پروان چڑھیں سب انسانی عظمت کی قائل دکھائی دیتی ہیں۔ تمام مذاہب عالم، مفکرین اور دانشوروں کے ہاں انسانی عظمت، انسانی احترام، مساوات، اخوت اور انسانی محبت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ گویا اس کائنات کی تمام رونق انسان ہی کے دم سے قائم و دائم ہے۔ انسان کے بغیر یہ کائنات بے معنی یا وبے وقعت ہے۔ انسان اس کائنات کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ ۱۴۵۳ ء میں ترکوں نے جب قسطنطنیہ پر قبضہ کیا تو یونانی علما جو قسطنطنیہ میں مقیم تھے اپنی کتابوں کے ذخیرے سمیت وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور اٹلی میں پناہ لی۔ یہ لوگ اٹلی کے مختلف شہروں فلورنس (Florence) بولانا (Bologna، پاڑوا Padua) وینس (venice) اور روم (Rome) وغیرہ میں مقیم ہوئے تو یہ مقامات علم و ادب کا مرکز بن گئے۔ یہ علما لوگوں کو یونانی اور لاطینی زبانوں کی سیکولر ریاست میں تمام پالیسیوں اور قوانین سے آگاہ کرتے جن کا مقصد شہریوں کو سماجی و معاشی طور پر ترقی کے مواقع فراہم کرنا اور اس کے ساتھ ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھنا ہے۔اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیکولرازم سماج مرتکز نظام ہے جو ریاست کی بجائے معاشرے کو اولیت دیتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک انسان دوست نظریہ ہے۔لہٰذا سیکولرازم کی حقیقی ترقی اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں ہر جگہ اور ہر سطح پر سیکولر اقدار کو فروغ دیا

جائے کیونکہ اس کے بغیر سیکولر ریاست کامیاب وکامران نہیں ہو سکتی اور انسان دوست معاشرے کا قیام عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔

اشتراکیت ایک ایسا نظام ہے جس کا تعلق پورے معاشرے کی فلاح بہبود سے ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ فرد کو زندگی کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ کی فکر سے نجات دلائی جائے اور ہر شخص کو بلا تفریق بنیادی سہولیات بہم پہنچائی جائیں۔ ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور ترقی کرنے کا موقع ملے اور معاشرے میں دولت کی منصفانہ اور مناسب تقسیم کا معقول انتظام ہو، اس کا مقصد انصاف، رواداری، آزادی، مساوات اور انسان دوستی کا قیام ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہوا اور ایک سو سال کے اندر زندگی کا نقشہ بدل گیا۔ صنعتی انقلاب نے دنیا کو مشین مہیا کی۔ یہ مشینی دور یا میکانکی دور کی نقیب تھی۔ اگر اس سے تہذیب وتمدن کو فروغ ملا تو بربریت اور ہلاکت آفرینی کو بھی فروغ ملا۔ اس نے امیروں کی تعیشات اور غریبوں کے افلاس میں ایسا فرق واضح کر دیا جو ماضی میں نہیں تھا۔ صنعتی انقلاب کا اہم ترین اثر یہ ہوا کہ پیدائشِ دولت کے طریقے بدل گئے، سرمایہ دارانہ نظام شروع ہوا، ملک میں جگہ جگہ کارخانے قائم ہوگئے، دستکار مشینی دور کا مقابلہ نہ کرنے کے باعث جبراً کارخانوں میں مزدور بن گئے۔ بعض حالات میں مزدوروں کو کئی کئی روز کے فاقے کرنے پڑتے تھے، دو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھانا نصیب نہ ہوتی تھی اور سرمایہ دار مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے فائدہ اٹھا کر کم سے کم مزدوری دیتے تھے۔ محنت کشوں کی کمائی سرمایہ داروں کے پاس چلی جاتی۔ امیر، امیر تر ہو جاتے اور غریب، غریب تر، سرمایہ داروں اور محنت کشوں میں طبقاتی کشمکش کی فضا پیدا ہو گئی تھی جس سے بغض وحسد اور عداوت کے جذبات نشوونما پاتے گئے۔ ہمدردی، اخوت اور شفقت نام کو رہ گئی تھی۔ مقالہ نگار نصرت جبین اپنے مقالے میں لکھتی ہیں:

> "آخر کار اس سرمایہ دار طبقہ اور مزدور کی کشمکش کے دوران جرمن میں ایک ایسا یہودی پیدا ہوا جس نے اپنی تمام زندگی اس غیر منصفانہ تقسیم کے خاتمے کے لیے صرف کر دی اس کا نام کارل مارکس تھا وہ جاگیر داری نظام کا مخالف تھا۔ کارل مارکس نے اپنا مشہور انقلابی Communist Manifisto اشتمالی (منشور) شائع کیا۔ مارکس نے اس مقالے میں سرمایہ دارانہ نظام کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا اور اس بات پر روشنی ڈالی کہ کس طرح سرمایہ دار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور اپنے سرمائے میں اضافہ کیا اور وہ کس طرح امیر سے امیر تر بنتے چلے گئے۔

آخر کار اس نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو متحد ہو کر سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے خلاف جدوجہد کرنے کی دعوت دی اوراپنی انسان دوستی کا بہترین ثبوت پیش کیا"۔(24)

زیر تجزیہ مقالے کے مطالعے سے اُردو ادب میں انسان دوستی کے آثار بھی نمایاں انداز میں سامنے آتے ہیں۔ قلی قطب شاہ، میراں جی شمس العشاق، بابا فرید گنج شکر سے شروع ہونے والی انسان دوستی کی روایت کو شمالی اور جنوبی ہند کے شعرا نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ میرؔ، داغ، ولی دکنی، سوداؔ، مصحفی، غالب اور اقبال کے کلام کا مطالعہ انسان دوستی کی غرض سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کی شاعری میں یہ عنصر واضح اثرات لیے ہوئے ہے جدید دور کے شعرا فیض، ن۔م راشد، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، امجد اسلام امجد، قاسم یعقوب، زاہد امروز، ارشد معراج، عمیر واصف، علی اکبر ناطق، وصی شاہ وغیرہ کے کلام میں بھی انسان دوستی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔

موضوع مقالہ: " کلام اقبال میں فکری تسلسل کی تلاش "

مقالہ نگار: محمد انور جمال، 2011ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر سعادت سعید، جی سی یونیورسٹی، لاہور

یہ کہنا اقبال کی کسر نفسی تھی کہ "اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے" حالانکہ اقبال اپنی زندگی اور شعر کی اصلیت سے اپنی شاعری کے ہر دور میں آگاہ رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکری تسلسل کی تلاش کا منبع و سرچشمہ ان کے جذباتی، فکری اور وجدانی احساسات ہیں۔ انہوں نے ان کے حوالے سے توقیر آدمیت اور عظمت انسان کے تصورات کو بنیاد بنا کر اپنے کلام میں موجود احساسات وافکار کے تانے بانے بنے ہیں۔ علامہ محمد اقبال جو کچھ لکھتے تھے اس کی داخلی اور خارجی نوعیت وماہیت سے آگاہ ہو کر لکھتے تھے۔ اگر انہیں احساس ہو جاتا تھا کہ انہوں نے کسی بات پر غلط زور دیا ہے تو درست بات سمجھ آجانے کے بعد وہ اس سے دستبردار ہونے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلے حافظ شیرازی کے بارے ان کے پہلے موقف اور دوسرے موقف سے مدد لی جاسکتی ہے۔ اقبال کو اس حقیقت کا جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بھی مسلم صوفی انسانی سماج سے دور ہو کر اپنے منصب سے انصاف نہیں کر سکتا۔ اس حوالے سے اس کا رہبانیت اور ترک دنیا کی جانب جانا قرین قیاس نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے حضرت شیخ علی ہجویری، داتا گنج بخش، حضرت معین الدین چشتی، حضرت نظام الدین اولیا اور اپنے زمانے کے کئی مسلم صوفیا کی فکری و عملی خدمات کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اگر اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا تھا تو انہیں معلوم تھا کہ ان کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کے علاوہ اپنے کلام کو براہ راست افغانستان، ایران اور ترکستان کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ "اسرار خودی" کے انگریزی ترجمے نے ان کے خیالات کو ان کی زندگی ہی میں مغربی عوام تک پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے اپنے تصور انسان اور تصور معاشرت کی آفاقیت پر اپنے ابتدائی کلام میں جو زور دیا تھا وہ ان کے آخری دور کے کلام میں بھی اسی شد و مد سے موجود ہے۔ اقبال کی فارسی شاعری میں وسعت ہے، اس کا طرز اظہار و بیان ہمہ گیر ہے۔ اس شاعری میں ان کی فکر کے وسیع امکانات موجود ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے ابتدائی خیالات و احساسات کس طور ایک فلسفے میں ڈھلے ہیں اور کیسے مشرقی علم الکلام کے عام تصورات ایک بلند پایہ مابعد الطبیعاتی نظام فکر میں منتقل ہوئے ہیں اس کا سراغ لگانا آسان کام نہیں ہے۔ ان کے شعری تصورات کو اگر ان کی فکری کتابوں "میٹا فزکس ان پرشیا" اور "ری کنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ" کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو ان کے فکر کی بہت سی ارتقائی صورتوں کو سامنے لانے میں آسانی ہو گی۔ مذکورہ مقالے کے محقق محمد انور جمال نے اقبال کی تصانیف کو بغور مطالعہ کیا اور اُس کی روشنی میں اپنا مقالہ ترتیب دیا۔ اُن کا یہ مقالہ چھ ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلا باب تمہیدی معروضات پر مشتمل ہے۔ موضوع کی مناسبت سے انہوں نے شاعری کے بارے میں عمومی تنقیدی آرا کے ساتھ علامہ اقبال کے تصور شعر کی حد بندی بھی کی ہے۔ اس تناظر میں ان کی ابتدائی اور اواخر عمر کی شاعری میں فکر و فلسفہ کا بھرپور تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے۔ دوسرے باب میں اقبال کی ابتدائی شاعری میں ان کے ان بنیادی تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کا عکس ان کے وسطی اور آخری دور کی شاعری میں بدستور موجود رہا ہے۔ اس حوالے سے علامہ کے تصور فطرت، فلسفہ محبت، عقل و خرد کے نظریے، فقر، عشق، خودی و بے خودی اور انسان کے تصورات کا منظر نامہ مرکز توجہ رہا ہے۔ تیسرے باب میں کلام اقبال کے ان دیگر زاویوں کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ جو ان کے ذہن کے فکری پھیلاؤ کے غماز ہیں۔ ان کے کلام کے یہ عمومی حوالے ان کے ملی، قومی اور بین الاقوامی شعور کے عکاس ہونے کے ناتے فرد عصر اور انسانی حیات کے گوناگوں حوالوں سے مزین ہیں۔ چوتھا باب کلام اقبال کے مذہبی فکری زاویوں کے حوالے سے قلمبند کیا گیا ہے۔ اس میں ان کی قرآنی فکر کو بنیاد بنا کر ان تصورات کو سامنے لایا گیا ہے جو دین اسلام کی عام آدمی سے تعلق کی حکایت کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں مسلمانوں

کے اتحاد کے اصول کی نشاندہی بھی کی گئی ہے اور اس ضمن میں دین، ایمان، پیغمبر، کعبے اور کلمے کے ایک ہونے کا اتحاد بین المسلمین کی بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔

پانچویں باب میں کلام اقبال کے فکری تسلسل کو اسلامی اور آفاقی انسانی اقدار کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں اس امر کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ اسلامی اقدار از خود آفاقی اقدار ہیں اور مادیت کی روشنی میں سامنے آنے والی جدید فکری تحریکوں کی انسانی اور آفاقی اقدار زیادہ تر معروضی زندگی کو اہم جانتی ہیں۔ یوں یہ اقدار یک طرفہ ہیں کہ ان میں انسان کی باطنی، داخلی اور وجدانی زندگی کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ علامہ کی شاعری میں مادی اور روحانی انسان کی ثنویت موجود نہیں ہے۔ اس میں انسان کو باطنی یا روحانی اور خارجی یا مادی انسان کے الگ الگ خانوں میں منقسم نہیں کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں کلام اقبال کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے علامہ اقبال کے ان افکار و جذبات کے تسلسل کو پیش نظر رکھا گیا ہے جن کی بدولت اقبالؒ کی شاعری عظمتوں سے ہمکنار ہوئی ہے۔ اس حوالے سے "مرد مومن" اور "انسان کامل" کو اقبال کے فکری صحیح نظر کی بنیاد جانتے ہوئے ان کے کلام میں موجود، عشق، تصوف اور انسانی عزت نفس یا خودی کے خیالات کے تسلسل کو پرکھا گیا ہے۔ علامہ کے کلام کا مطالعہ ان کے فلسفہ خودی، تصور عشق، خیال انسان کامل، فکر سیاست، معیشت اور معاشرت کے فکری نظام سے آگہی بخشتا ہے۔ اس باب کے آخر میں "محاکمہ" درج ہے۔ اس میں علامہ اقبال کے ان موضوعات کا اختصار سے تذکرہ ہے کہ جو ان کی شاعری میں تسلسل سے سامنے آئے ہیں۔

اس مقالے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال کے شاعرانہ افکار سے ابھرنے والے انسانی فرد اور سماج کے خاکے کو اجمالی طور پر سامنے لایا جاسکے۔ ان کے فلسفی، صوفی اور علمی انسان کے فکری، وجدانی اور تعقلاتی حوالوں کی وسعتوں کو ایک مقالے میں سمیٹنا ممکن نہیں تھا اس لیے کہیں ان کے اشعار کے وسیلے سے، کہیں کسی نکتہ فہم دانشور، صوفی یا فلسفی کے حوالے سے اور کہیں مقالہ نگار نے اپنی فہم کی بنیاد پر ان کے کلام میں موجود اس فکری تسلسل کا سراغ لگانے کی جسارت کی ہے کہ جو ان کے ابتدائی تصورات سے لے کر دور آخر کے افکار تک قریباً چار دہائیوں پر محیط ہے۔

موضوع مقالہ: " جدید اُردو نظم میں ڈرامائی عناصر "

مقالہ نگار: ارم صبا، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر فہمیدہ تبسم، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

جدید اردو نظم اپنے ارتقائی سفر کے دوران مختلف ہیتی، صنفی اور موضوعاتی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ مختلف مقامی اور عالمی تحریکوں کے زیر اثر اس میں بہت سی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ اردو نظم کے حوالے سے بیسویں صدی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس صدی میں ہیئت و موضوعات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مختلف مغربی تحریکوں نے اردو نظم کو بہت متاثر کیا۔ علامت نگاری اور تمثال کاری کے اثرات اردو نظم پر نمایاں نظر آنے لگے۔ بیسویں صدی کی اردو نظم میں خصوصاً اقبال اور راشد کے ہاں نظم میں ڈرامائی عناصر کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ یہی رجحان کلاسیکل اردو نظم میں بھی نظر آتا ہے۔ شاعر اپنی تخلیق کو قاری کے لیے دلکش اور پر تاثیر بنانے کے لیے بیانیہ انداز اپناتا ہے اور کردار و مکالمے سے کام لیتا ہے یا اپنا تزکیہ کرنے کے لیے خود کلامی و مخاطب کا انداز اپناتا ہے۔

اردو نظم کے آغاز سے جدید اردو نظم تک کی مدت اور جدید اردو نظم سے اکیسویں صدی تک کا فنی و فکری سفر ایک طویل داستان ہے۔ اس مفصل موضوع کے منطقی اور مربوط مطالعے کے لیے مقالہ نگار نے مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب " ڈراما نگاری کے بنیادی مباحث " کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مشرقی و مغربی مفکرین کی آرا کے مطابق ڈرامے کا لغوی واصطلاحی مفہوم ،ڈرامے کی تاریخ، یونان سے برصغیر تک ڈرامے کی روایت کا جائزہ اور ڈرامے کے بنیادی عناصر یا اجزائے ترکیبی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ڈراما اور شاعری کے آپس کے تعلق کی وضاحت بھی اسی باب میں کی گئی ہے اور کلاسیکل اردو نظم کی اہم اصناف مثنوی، مرثیہ اور قصیدے میں ڈرامائی تکنیک کے استعمال کو مثالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم میں لفظ جدیدیت کے مفاہیم و مطالب مفکرین کی آرا کے مطابق پیش کیے گئے ہیں اور سر سید اور انجمن پنجاب کے توسط سے نظم میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے بحث کی گئی ہے۔ انجمن پنجاب کے تحت اردو نظم میں "فطرت نگاری" کی روایت نے اردو نظم میں رومانویت کی ابتدائی بنیادیں فراہم کیں۔ انجمنِ پنجاب کے اہم شعرا کی نظموں میں ڈرامائی عناصر کے رجحان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ رومانوی تحریک کے پس منظر اور اہم شعرا کی تخلیقات میں ڈرامائی عناصر کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیسویں صدی کی اردو نظم کا معتبر نام علامہ محمد اقبال اور رومانویت کے جائزے کے بعد اقبال کی تخلیقات میں ڈرامائی عناصر کے رجحان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں ترقی پسند تحریک کا مختصر تاریخی پس منظر پیش کی گیا اور اردو نظم پر مارکسی تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ترقی پسند اردو نظم میں ڈرامائی عناصر کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد اس تحریک کے

نمایاں شعرا کی تخلیقات کے مفصل تجزیے کے بعد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو نظم اور ڈرامائی عناصر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چوتھے باب میں حلقہ اربابِ ذوق کے شعرا پر مغربی ادبیات کے اثرات کو واضح کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس دور میں جدیدیت کے زیر اثر اردو نظم بڑی تبدیلی سے دوچار ہوئی۔ معنوی سطح پر اردو نظم فکری گہرائیوں اور نفسیاتی و وجودی موضوعات سے آشنا ہوئی اور ہیئتی سطح پر آزاد نظم کے کامیاب تجربے سے ہم کنار ہوئی۔ حلقے کے شعرا نے اساطیر، علائم، استعارات اور تمثیل کا نیا جہاں آباد کیا اور ڈرامائی عناصر کو نظم کا لازمی جز بناتے ہوئے عصری مسائل کو نظم کا موضوع بنایا۔ پانچویں باب میں نئی شاعری کا سیاسی، سماجی اور فکری پس منظر پیش کیا گیا ہے اور لسانی تشکیلات کی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے نئی شاعری کے منتخب شعرا کے ہاں ڈرامائی عناصر کے رجحان کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اسی باب میں جدید اردو نظم کا معاصر منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ چند معاصر شعرا کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے ڈرامے کے عناصر اور نظم کے تعلق کے اٹوٹ بندھن کو ثابت کیا گیا ہے اور اکیسویں صدی کی اردو نظم میں ڈرامائی عناصر کے آثار اور اثرات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آخری باب مجموعی جائزے پر مشتمل ہے۔

مذکورہ مقالے میں ارم صبا نے اُردو نظم کے حوالے سے بتایا کہ اردو نظم نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے بدلتے ہوئے حالات میں انگریزی تہذیب و تمدن اور فکر نے برصغیر کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو نظم کی جدید شکل مغربی افکار سے اخذ و استفادہ کے سبب ظہور پذیر ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے مغربی طرز فکر کو اپنانے کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر ادبی اقدار کی تبدیلی پر زور دیا۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے تحت اردو نظم نئے اسالیب سے متعارف ہوئی۔ ان اسالیب میں ڈرامائی اسلوب و ڈرامائی عناصر منفرد اور نمایاں ہیں۔ کلاسیکل اردو نظم میں بھی اگرچہ ڈرامائی عناصر نظم خصوصاً مثنوی کا حصہ رہے ہیں لیکن وہاں ڈرامائی عناصر محض ایک ضرورت یا عنصر تو ہیں لیکن باقاعدہ اسلوب یا وسیلہ بنتے نظر نہیں آتے۔

جدید اردو نظم میں ڈرامائی عناصر کو برتنے کا واضح سبب اردو شعرا کا مغربی ادب کا مطالعہ ہے۔ ڈرامائی اسلوب اپنی پوری توانائی کے ساتھ اقبال کے ہاں نظر آتا ہے۔ راشد نے اس اسلوب کو مستقل ذریعہ اظہار بنا کر اس کے امکانات کو وسعت دی۔ راشد کے معاصرین اور مابعد شعرا نے بھی اس اسلوب کو نظم میں کامیابی سے برتا اور اکیسویں صدی کی اردو نظم میں ڈرامائی عناصر کا رجحان پایا جاتا ہے۔ زیر نظر مقالے میں جدید اردو نظم میں ڈرامائی عناصر کا ایک خالص ادبی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مطالعے کا آغاز کلاسیکل اردو نظم سے کیا گیا

ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق اس مقالے کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ جدید اردو نظم میں ڈرامائی عناصر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ طے کیا جاسکے کہ ان عناصر کی نظم میں موجودگی نے نظم کی اصل ساخت کو کوئی نقصان پہنچایا یا نظم کو صوری و معنوی حسن عطا کیا ہے اور ان عناصر کی نظم میں موجودگی سے جدید اردو نظم عصر جدید کے مسائل کو کس حد تک بیان کرنے کے قابل ہوئی ہے۔

موضوع مقالہ: " اُردو میں بچوں کا منظوم ادب "

مقالہ نگار: کوثر عنایت، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر کنول فیروز، جی سی یونیورسٹی، لاہور

" اُردو میں بچوں کا منظوم ادب" ایک جامع اور وسیع موضوع ہے۔اس وسیع موضوع کو مقالہ نگار کوثر عنایت نے چار ابواب اور محاکے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ باب اوّل " منظوم ادب کی روایت، ضرورت اور اہمیت" کے عنوان سے ہے۔اس باب میں امیر خسرو سے لے کر غالب تک تقریباً ان تمام شعرائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے امیر خسرو کے منظوم ادب کی روایت کو قائم رکھا۔ان میں غالب، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، اسماعیل میرٹھی، نظیر اکبر آبادی، حفیظ جالندھری اور علامہ محمد اقبال شامل ہیں۔مذکورہ باب میں ان شعرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے جنہوں نے کلاسیکی عہد کے شعرا کی منظوم ادب کی روایت کو قائم رکھا اور یہ روایت آج بھی اسی طرح چلی آرہی ہے اور بچوں کے لئے آج بھی منظوم ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔ جن شعرا نے منظوم ادب کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے منظوم ادب تخلیق کیا ان میں سے چند منتخب شعرا کا ذکر مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں کیا ہے۔ان شعرا میں " صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، تلوک چند محروم میلارام وفا، تاجور نجیب آبادی، فیض احمد فیض، عابد علی عابد، جمیل الدین عالی، سراج الدین ظفر، احمد فراز، اختر ہوشیارپوری، محشر بدایونی، ڈاکٹر کنول فیروز اور ثاقبہ رحیم الدین شامل ہیں۔

باب دوم میں بچوں کا منظوم ادب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ حصہ (الف) میں " اُردو ادب میں غیر ملکیوں کی خدمات "کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن غیر ملکیوں نے اُردو ادب میں حصہ ڈالا ان میں "ڈاکٹر جان بور تھوک، گل کرسٹ، ولیم ہنٹر، جان ولیم ٹیلر، کیپٹن تھامسن روبک، کیپٹن ولیم پرائس "پیش پیش ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے علاوہ جو مدارس دوسرے صوبوں میں قائم کئے گئے، اُن کا ذکر بھی اس باب کا حصہ ہے، ان میں کلکتہ مدرسہ، سنسکرت کالج، اورینٹل کالج، ایسٹ انڈیا معلمین، مترجمین کالج شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہندوستان میں اُردو کی ترویج کے لئے جن

مدرسین نے درس و تدریس کا کام کیا ان میں نہال چند لاہوری، کاظم علی جواں، مظہر علی خاں ولا، حیدر بخش حیدری، خلیل علی خاں اشک، میر امن دہلوی، حفیظ الدین احمد، سید منصور علی، محمد بخش، غلام حیدر عزت، سید نور علی، تو تارام، باسط خان باسط، بہادر علی حسینی، للوجی لال کومی، مرزا بیگ، اکرام علی، مولوی امانت علی شیدا، مرزا مغل نشاں، میر شیر علی افسوس، میر معین الدین فیض، تارنی چرن متر، سید حمید الدین بہاری کا ذکر بھی اسی باب میں شامل ہے۔ حصہ (ب) میں مقالہ نگار کی طرف سے منظوم تراجم کے ذکر میں جن شعرا، ادیبوں اور مترجمین نے انگریزی سے اُردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے، انہیں زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان شعرا، ادبا اور مترجمین میں مولانا محمد حسین آزاد، حامد اللہ افسر میرٹھی، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، منشی تلوک چند محروم، احمد عقیل روبی، سیدہ عزیزہ کاظمی، بدرالزماں بدر، سعید الدین خاں سعید، رسا ہمدانی، ضامن کنتوری، عزیز کاظمی، محی الدین اور ٹیگور شامل ہیں۔ انگریزی شعرا جن کی نظموں کا ترجمہ کیا گیا ان میں ولیم کوپر، جین ٹیلر، میری ہووٹ، ولیم بازنس، ایم ایڈورڈ، رالف والڈ ایمرسن، فلیکا ہیمنز، ولیم بلیک، ولیم ورڈزورتھ، کولرج، شیلے، گوڈ فیری، این ٹیلر اور زبیدہ ڈوسل نمایاں ہیں۔

باب سوم میں "منتخب شعری مجموعے" شامل کیے گئے ہیں۔ جن شعرا نے بچوں کے لئے شعری مجموعے تخلیق کیے ہیں ان میں سورج نرائن مہر، صوفی تبسم، عشرت رحمانی، سید ضمیر جعفری، سیفی سیوہاروی، قیوم نظر، قتیل شفائی، شان الحق حقی، حکیم محمد سعید، خاطر غزنوی، ابنِ انشا، خالد بزمی، محمد شفیع الدین نیر، عبد المجید بھٹی ، خالد بٹالوی، حامد علی نقوی، عابد نظامی، اقبال ارشد، حسین سحر، ریاض الرحمان، ناصر زیدی، احمد عقیل، روبی ابصار، عبدالعلی کرامت بخاری، اعزاز احمد آذر، لطیف فاروقی، عبد الرحمن خالد، مظفر محسن، وجاہت حسین، عزیز ہاشمی، ظریف، احسن، شہناز مزمل، اعجاز فیروز اعجاز، نصیر شیدائی، فرات غضنفر اور رمضان گوہر شامل ہیں۔

باب چہارم میں "رسائل وجرائد میں بچوں کا منظوم ادب" بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں پہلے چند اشاعتی ادارے جنہوں نے اُردو ادب خصوصاً بچوں کے ادب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ان میں دارالاشاعت پنجاب، جامعہ ملیہ، مکتبہ جامعہ کے علاوہ اخبارات اور رسائل اور اُردو اخبارات میں شائع ہونے والے بچوں کے صفحات شامل ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق موجودہ دور میں ان میں سے کئی کے نام و نشان تک مٹ چکے ہیں۔ رسائل کے حوالے سے جن رسائل کو بچوں کے منظوم ادب میں شامل کیا گیا ہے ان میں ماہنامہ "پھول، ماہنامہ پھلواری، ماہنامہ تعلیم و تربیت، ماہنامہ بچوں کی دنیا اور ماہنامہ ہمدرد نونہال" نمایاں ہیں۔ ان رسائل میں

جن شعرا کا منظوم کلام شائع ہوتا رہا۔ ان شعرا کے نام اور چند ایک شعر کا منظوم کلام بھی نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح اخبارات میں روزنامہ "امروز، روزنامہ مشرق، روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ پاکستان میں شائع ہونے والے شعرا کے نام اور ان میں سے چند ایک شعرا کا منظوم کلام بھی نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: " جدید اُردو نظم کی بین الموضوعاتی روایت "

مقالہ نگار: حنا کنول، 2011ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر تبسم کاشمیری، جی سی یونیورسٹی، لاہور

اُردو ادب میں شاعری مقبول صنف رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکشن کے مقابلے میں اردو شاعری پر فنی و فکری حوالے سے زیادہ تحقیقی و تنقیدی کام کیا جاچکا ہے۔ اردو شاعری میں جدید اردو نظم نے جس طرح سائنسی و صنعتی دور میں بدلتے نفسی رویوں اور مسائل کی تصویر کشی کی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ مذکورہ بالا مقالے میں "جدید اردو نظم کی بین الموضوعاتی روایت" کی ضرورت اور اہمیت کا جائزہ سماجی علوم کے تحت لیا گیا ہے اور موضوعات کی پیش کش میں تخلیق کاروں نے جس طرح جزئیات سے فکری مواد کو پیش کیا ہے اس کی تفصیل بیان کی گی ہے۔ جدید اردو نظم کی موضوعاتی روایت کا تہذیبی، مذہبی، نفسیاتی اور فلسفیانہ حوالوں سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ موضوع کی تفہیم کے لیے تخلیق کاروں کی علامتوں، اساطیری حوالوں، تلازمات، مونولاگ، امیجری، تلمیحات، کردار نگاری اور شعری لغت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے فکری رویوں کی تفسیر موضوعاتی روایت کے تحت بیان کی گئی۔

مقالے کے پہلے باب میں بین الموضوعاتی روایت، موضوع کی معنویت اور نوعیت کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں جدید اردو نظم کی ابتدا، پس منظر اور اقبال کی نظموں کی بین الموضوعاتی روایت کا جائزہ فکری حوالوں سے لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں رومانوی تحریک کے تحت بین الموضوعاتی مطالعہ شامل ہے اور نمائندہ شعرا کے کلام میں موضوعاتی روایت کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں ترقی پسند تحریک کی تحت بین الموضوعاتی روایت کا مطالعہ کیا گیا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی مقصدیت کو اردو نظم میں کس حد تک موضوع کا حصہ بنایا گیا اور دیگر ہنگامی و عمومی موضوعات کو کیسے پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں حلقہ ارباب ذوق کی تحریک اور جدید اردو نظم کی بین الموضوعاتی روایت کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس باب میں محقق نے حلقہ ارباب ذوق کے تحت تخلیق کاروں نے اردو نظم کی موضوعاتی روایت میں جو اضافے

اور معنوی و فکری توسیع کی اس کا جائزہ لیا ہے۔ چھٹے باب میں نئی شاعری کی تحریک اور جدید اردو نظم میں جدید اور نئی شاعری کی موضوعاتی روایت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ نئی شاعری نے جدید اردو نظم کی بین الموضوعاتی روایت میں جو اضافہ کیا ہے اس پر تنقید کی گئی ہے۔ مذکورہ بالا مقالے کا ساتواں باب جدید اردو نظم کی بین الموضوعاتی روایت کا مکمل جائزہ پیش کرتا ہے۔ جس میں تمام عوامل کو پیش نظر رکھ کر موضوعاتی روایت کا محاکمہ شامل ہے۔

موضوع مقالہ: " اُردو نظم کا فنی و فکری جائزہ (1970ء کے بعد) "

مقالہ نگار: فرح عابد، 2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

اُردو کے ادبی سرمایے میں نظم کی روایت زیادہ قدیم اور با معنی ہے۔ کلاسیکی نظم مرثیہ، مثنوی، قصیدہ، مسدس، مخمس، قطعہ اور رباعی وغیرہ کی ہیت میں لکھی جاتی تھی۔ جبکہ جدید نظم میں نئی ہیئتوں کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی صورت میں پرانی ہیئت میں بھی طبع آزمائی کی جارہی ہے۔ کلاسیکی نظم میں ہیئتیں اپنے فریم کے حوالے سے شناخت کی جاتی تھیں جبکہ جدید نظم میں یہ سانچہ اظہار اور مفہوم کی ترسیل کا ذریعہ ہے۔ جدید نظم کے ابتدائی نقوش نظیر اکبر آبادی کی نظموں میں تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن جدید نظم کا باقاعدہ آغاز حالی اور شبلی نے انجمن پنجاب کے موضوعاتی مشاعروں سے کیا۔ ۶۰ کی دہائی میں نئی نظم کی تحریک کے زیر اثر روایتی سانچوں سے انحراف کر کے نئے لسانی اور فطری پیرائے وضع کیے گئے۔ ۷۰ کی دہائی کے بعد اُبھرنے والے شعرا نے نہ صرف نئی نظم کے تسلسل کو برقرار رکھا بلکہ صحیح معنوں میں نئی نظم کو پروان چڑھایا۔ نئی نظم میں علامت نگاری کے ذریعے فرد کے باطن کی تہ در تہ پرتوں کو خارج کے ساتھ آمیز کر کے متنوع تجربات کیے گئے۔ نئی نظم کا وسیع مشاہدہ ملکی و غیر ملکی مسائل پر گرفت نے اُردو نظم کو موضوعاتی پختگی عطا کی ہے۔

موجودہ دور افسانے کے ساتھ ساتھ نظم کا دور بھی ہے۔ ۷۰ کے بعد کی اُردو نظم کے نمایاں اختصاصات میں اسلوب اور فکر کی سطح پر ہونے والے متنوع تجربات ہیں جو گلوبلائزیشن اور مابعد اور جدید دور کے رد عمل کے طور پر نظم کا حصہ بنے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اُبھرنے والے شعرا کا تعلق ایسے مکتبہ فکر سے ہے جو نظریاتی لحاظ سے کسی سیاسی ادبی گروہ یا تحریک کا حصہ ہیں نہ ہی یہ شعرا کسی مخصوص رجحان یا فکری ڈسکورس کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ تمام شعرا خالصتاً اپنی شاعری کی بنا پر متن کو مرکز مان کر ادب میں تخلیقی مساعیوں میں مصروف کار ہیں۔ ان شعرا کے نزدیک شناخت اور پہچان کا مسئلہ بھی نہیں ہے بلکہ مقام اور

شناخت سے قطع نظر یہ شعرا ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والی نسل میں ثروت حسین، جاوید انور، افضال احمد سید، ذیشان ساحل، علی محمد فرشی، رفیق سندیلوی، روش ندیم، نصیر احمد ناصر، دانیال طریر، مقصود وفا، ارشد معراج، ابرار احمد، سعید احمد، ضیا الحسن، معین نظامی، الیاس بابر اعوان، شعیب آفریدی، اشرف یوسفی، حارث خلیق، فرخ یار، عامر عبداللہ، غائر عالم، طارق ہاشمی، قاسم یعقوب، زاہد امروز، انجم سلیمی، طاہر شیرازی، عامر سہیل علی اکبر ناطق اور فہیم شناس کاظمی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد جن نسائی آوازوں نے اپنی الگ شناخت قائم کی ان میں سارہ شگفتہ، یاسمین حمید، پروین طاہر، حمیدہ شاہین، شاہین مفتی، ثمینہ راجہ، عارفہ شہزاد اور شہناز پروین سحر قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کے ہاں فکری اعتبار سے گزشتہ تمام ادبی تحاریک کا فکری اثاثہ امتزاجی صورت میں نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی مخصوص اجتماعی نظریہ سازی نظر نہیں آتی۔ معاشرتی مسائل، معاشی حالات، سیاسی نقطہ نظر، نفسیاتی و داخلی پیچیدگیوں سمیت بین الاقوامی مسائل اور وجودی افکار ان کی نظموں میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس دور کی نظموں میں معاشرتی ابتری اور تہذیبی زوال کو موضوع نظم بنایا گیا ہے۔

اسلوبیاتی اعتبار سے ۷۰ کے بعد کی نظم علامت، تجرید، ابہام، تمثال کاری، پیکر سازی، کردار نگاری اور براہ راست اظہار کے تاروپود سے تشکیل پاتی ہے۔ جدید شاعر اِن لوازمات سے ادراک کی ترسیل کا کام لیتا ہے۔ امیجری یعنی تصویر سازی بھی ۷۰ کے بعد کی نظم کا اسلوبیاتی اختصاص ہے۔ یہ شعرا نہ صرف سماج کے مختلف طبقات کی نمائندگی تصویر سازی کے ذریعے کرتے ہیں بلکہ زمان و مکاں سے ماورا ہو کر تخیلاتی منظر ناموں کی جھلکیاں بھی دکھاتے ہیں۔ جدید شعرا کا لسانی پیرائیہ زیادہ لچکدار اور تجرباتی ہے۔ ان کے ہاں تاریخ کا شعور اور اساطیر کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ ان عناصر اور رجحانات کو شعری پیرائے میں بیان کرنے کے لیے ان شعرا نے مختصر نظموں کے ساتھ ساتھ طویل نظموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ فرد کی عصری صورتِ حال جس تاریخی و تہذیبی پس منظر کی متقاضی ہے اس کے لیے مختصر نظم کا فریم موزوں نہیں تھا لہذا طویل نظموں میں نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے متنوع تجربات کیے گئے بلکہ اسلوبیاتی اعتبار سے بھی یہ نظمیں انفرادیت کی حامل ہیں۔

مابعد جدید دور میں فرد گوناں گوں مسائل سے دوچار ہے فرد کی دنیا ایسے کرب سے تشکیل پاتی ہے جہاں عدم تکمیلیت کا احساس فرزوں تر ہے۔ اس فرد کا کوئی آدرش کوئی خواب، خواہش، احساس تکمیلیت کے

دائرے کو نہیں چھو پاتا۔ صارفیت، نارسائیت، غیر مختتم ذاتی اغراض اور اشیا پرستانہ نظام کی زد میں آکر انسانیت اپنی طے شدہ منزلیں گم کر چکی ہے۔ معاشرتی حالات بین الاقوامی صارفی معاشرے کا قیام، صنعتی میکانیت کے اثرات نے تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد کو کھوکھلے پن، احساس بے چارگی، بے گانگی اور وجودی کرب کے تحفے عطا کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے دور سے تعلق رکھنے والے انسان کی شخصیت اور ذاتی وقار کو سخت دھچکا پہنچا ہے۔ اسے بحیثیت انسان ذاتی رائے کا استحقاق حاصل ہے اسی استحقاق کو مد نظر رکھتے ہوئے جدید شاعر نئے فرد کی آواز کو نظم میں بیان کر رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد لکھی جانے والی جدید نظم عصری مسائل اور معاصر منظر نامے کا اصل رخ دکھاتی ہے۔ 70 ء کی دہائی کے بعد اردو نظم کی پوری تاریخ میں یہ ایسا دور ہے جو اپنے موضوعات اور اسلوب کی بنا پر بہت حد تک مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مقالے میں اس دور کا احاطہ کرنے کی کاوش کی ہے تاکہ مقالہ میں شامل مواد بعد میں لکھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے سود مند رہے۔

مقالے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ راقمہ نے اپنے تحقیقی مقالے کو موضوع اور عنوان کی مناسبت سے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل بعنوان "اردو نظم آغاز تا ۱۹۶۰ : تخلیقی رجحانات کا مختصر جائزہ" تین بنیادی اجزا میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں نظم کا مفہوم اور صنفی تحدید کے تحت نظم کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم بیان کیے گئے ہیں، ساتھ ساتھ نقادان ادب کی تعریفات کی روشنی میں نظم، مفہوم اور دائرہ کار کا تعین بھی کیا گیا ہے۔ جزو "ب" میں کلاسیکی دور کی نظم کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جز میں چار ذیلی عنوانات کے تحت دکنی دور میں اُردو نظم، دبستان دہلی میں اُردو نظم، دبستان لکھنو میں اُردو نظم اور نظیر اکبر آبادی کا خصوصی مطالعہ شامل کار ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں چونکہ جدید ظم کے ابتدائی نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے نظیر کو خصوصی جگہ دی گئی ہے۔ جزو "ج" میں "نو آبادیاتی دور اور جدید اردو نظم کی ابتدا " کے زیر عنوان حالی اور شبلی کی کاوشوں کا اعتراف کرنے کے بعد "اقبال اور اُردو نظم" کے زیر عنوان اُردو نظم کے فروغ کے سلسلے میں اقبال کی خدمات کا اعتراف شامل کار ہے۔ تیسرے ذیلی عنوان میں "رومانی رجحان اور اردو نظم" چوتھے ذیلی عنوان کے تحت "ترقی پسند تحریک اور اُردو نظم" کے تحت بالترتیب اردو نظم کا مرحلہ وار ارتقائی سفر مختصر بیان کیا گیا ہے۔ چھٹا ذیلی عنوان "غیر وابستہ شعرا" میں ان شعرا کی نظم کا جائزہ شامل ہے جو قیامِ پاکستان کے آس پاس نظم کے منظر نامے پر ابھرے لیکن کسی ادبی تحریک سے وابستگی اختیار نہیں کی۔

باب اول میں چونکہ دکنی دور سے لے کر ۶۰ کی دہائی کی نظم کا جائزہ لیا گیا ہے لہذا اس باب میں طوالت کی بنا پر مقالہ نگار نے شعرا کے صرف تخلیقی رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور شعری مثالوں سے احتراز برتا ہے۔ باب دوم بعنوان "اُردو میں نئی نظم کی تحریک" میں ۶۰ء کی دہائی کے بعد اُبھرنے والے اُن شعرا کی نظم کا جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے ستر اور اسی کی دہائی کے نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس باب کو بالترتیب تین ذیلی عنوانات "نئی نظم، مفہوم اور تحدید، لسانی تشکیلات مفہوم اور تحدید، اور" ۱۹۶۰ء کی دہائی کے دیگر شعرا" میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے نئی نظم کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، لہذا اس باب میں شعرا کے تخلیقی رجحانات کے ساتھ ساتھ شعری مثالیں بھی شامل کی گئیں ہیں۔

باب سوم " ۱۹۷۰ء کے بعد اردو نظم: تخصیصی مطالعہ "کے زیر عنوان ہے۔ یہ باب 70 کی دہائی کے بعد اُبھرنے والے شعرا کی نظم کے فنی و فکری جائزہ پر مشتمل ہے۔ اس باب میں منتخب اہم شعرا کی نظموں میں تخلیقی رجحانات کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے ساتھ ساتھ شعری مثالیں بھی دی گئیں ہیں۔ باب چہارم بعنوان " ۱۹۷۰ء کے بعد اردو نظم کی نسائی آوازیں" میں ۱۹۷۰ء کے بعد اُبھرنے والی شاعرات کی نظموں کا مطالعہ شامل ہے۔ ان شاعرات کی نظموں کو جدید شعریات کی رو سے فن و فکر ہر دو اعتبار سے پرکھا گیا ہے اور ساتھ میں شعری مثالیں بھی دی گئیں ہیں۔ باب پنجم "۱۹۷۰ء کے بعد اردو نظم: عمومی مطالعہ " 70 کی دہائی کے بعد اُبھرنے والے شعرا کی ایک بڑی کھیپ کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ یہ تمام شعرا اردو نظم کے ارتقائی سفر میں نئے امکانات روشن کرنے میں مصروف کار ہیں۔ ان شعرا کی نظموں میں سے مقالہ نگار نے جہاں ضروری خیال کیا شعری مثالیں بھی دی ہیں۔ مذکوہ ابواب کے بعد "ماحصل" کے زیر عنوان جدید اردو نظم کے منظر نامے اور مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں کتابیات کی فہرست بھی دی گئی ہے جس میں بنیادی اور ثانوی ماخذات کی نشاندہی شامل کار ہے۔

موضوع مقالہ: "جدید اُردو نظم میں تصور انسان "

مقالہ نگار: عارفہ بتول، 2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

انسان اس کائنات کا مرکز ہے۔ جب ارض و سما کے خالق نے چاہا کہ اس کو پہچانا جائے تو اس نے انسان کو تخلیق کیا۔ کائنات کی اشرف و افضل مخلوق ہونے کے ناتے دنیائے گل میں جتنے علوم ہیں ان تمام کا محور انسان ہی ہے۔ ایوان ادب میں شاعری انسان کے جذبات واحساسات اور تفکرات و تجربات کے جمالیاتی اظہار

کا نام ہے۔ کل انسان نے کیسی زندگی گزاری اور آج کا انسان کس طور سفر زیست طے کر رہا ہے، اردو شاعر گذشتہ ادوار میں اس سے لاتعلق تھے اور نہ عہد حاضر میں بے خبر ہیں۔ اردو ادب میں صنف شاعری ہر زاویے سے آدم کا کھوج لگاتی رہی ہے۔ بالخصوص جدید اردو نظم تو انسان سے متعلق بنیادی سوالات وہ کون ہے ؟ وہ کیا ہے ؟ کیسا ہے ؟ یا اسے کیسا ہونا چاہیے ؟ کے گرد مضبوط حصار قائم کیے ہوئے ہے۔ جدید اردو نظم بیسویں صدی کے اوائل سے لے کر تاحال اپنے تسلسل اور علامتی و استعاراتی نظام کے ذریعے انسان کی ہمہ جہت شخصیت کی عکس ریزی میں مصروف ہے۔

عارفہ بتول کے مربوط کردہ مقالے کا موضوع "جدید اردو نظم میں تصور انسان" لگ بھگ ایک صدی اوپر کے انسان کے مطالعے پر محیط ہے۔ اس کار تحقیق میں جدید اردو نظم کے موضوعاتی مطالعے کے بجائے نظم گو شاعروں کے ہاں پائے جانے والے انسان کے تصور کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اُن کا یہ مقالہ چھے ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلے باب میں انسان کے لغوی مطالب و معانی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مختلف مذاہب، مکاتب فکر و فلسفہ ، نفسیات اور سیاسی نظاموں میں تصورِ انسان کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ تخلیق انسان کے مختلف نظریات کے علاوہ مذاہب عالم میں انسان کی بطور فرد شخصیت کی تعمیر کے سلسلے میں ملنے والے افکار خصوصی طور پر پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں زمانی ترتیب کے ساتھ ہندومت، بدھ مت، کنفیوشس، زرتشتیت اور دین ابراہیمی میں یہودیت، عیسائیت اور مذہب اسلام میں انسان کی ہدایت اور اس کے کردار کی تشکیل سے متعلق اہم تعلیمات کا بیان کیا گیا ہے۔ فلسفہ انسان کے بنیادی سوالات کیا؟ کیوں؟ کیسے ؟ کے جواب تلاش کرنے کا علم ہے۔ علم فلسفہ میں یونانی فلاسفہ کے ہاں انسان کے بارے میں ملنے والے تصورات زیر بحث آئے ہیں۔ اسلامی مفکرین کے فلسفے میں انسانیت، معاشرتی اخلاق، عظمت آدم خود شناسی اور معرفت خدا کی تاکید جیسے تفکرات کا احاطہ کرنے کے علاوہ مغربی مکتب فکر کو بھی اسی باب میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح مختلف سیاسی نظاموں میں بنائے گئے ریاستی قوانین اور ان کے انسان پر ہونے والے منفی و مثبت اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں کلاسیکی اردو شاعری میں تصورِ انسان کے نمایاں رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں اردو شاعری کے کلاسیکی دور میں دکنی ادب، دبستان دلی اور دبستان لکھنو سے وابستہ شعرا کے کلام میں صورت پذیر انسان کا عمومی تذکرہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک دکنی ادب کا تعلق ہے تو یہ دور حسن و جمال کے دل دادا انسان کا ترجمان ہے اور عہدِ زریں میں معاشی طور پر تباہ حال انسان کی داخلی و خارجی زندگی کا احوال موجود

ہے۔ لکھنو کے شعری دبستان میں فارغ البال ظاہر پرست انسان جبکہ متاخرین شعرائے دہلی کے شعری سرمائے میں دو تہذیبوں کے درمیان معلق انسان کی پیش کش کی گئی ہے۔ اقبال اور ان کے معاصر نظم نگار باب سوم میں شامل ہیں۔ ان نظم نگاروں کی منظومات کو تصور انسان کے تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ اس باب میں علامہ محمد اقبال کے "انسان کامل" پر سیر حاصل گفتگو نظر آتی ہے۔ اردو شاعری میں عصر اقبال سیاسی سطح پر انسان کے عصری شعور کا زمانہ ہے۔ لہذا اقبال کے معاصر شعرا کی نظموں میں وطنیت، اتحادِ ہندوستان، یک جہتی بین المسلمین کے مضامین کا تصور انسان کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کی نظمیں رومان و انقلاب کے امتزاج سے مرکب ہیں لیکن چونکہ یہ اقبال کے ہم عصر ہیں اسی لیے انھیں بھی اسی باب میں شامل کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھی جانے والی اردو نظم کا عمیق تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جان نثار اختر جیسے شعرا کی انسان تحریک سے سیاسی و نظریاتی طور پر وابستگی ہے جبکہ فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز اور ساحر لدھیانوی رومان اور حقیقت کی حسین آمیزش سے انسان کی تشکیل کرتے ہیں اور احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک سے نظریاتی وابستگی کے باوجود عظمت آدم کے مفسر دکھائی دیے۔ باب پنجم میں جدیدیت کے نمائندہ نظم نگاروں کے ہاں پیش کردہ خود مختار انسان کا مطالعہ زیر غور رہا ہے۔ اس باب میں حلقہ ارباب ذوق کے تحت لکھنے والے نظم نگار بھی شامل ہیں اور ایسے شعرا کی نظم بھی مدِ نظر رکھی گئی ہے جو ہر قسم کے نظریاتی گروہ سے لاتعلق رہے۔ اس باب میں یہاں جدیدیت کے نمائندے "ن م راشد، میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر، مجید امجد، اختر الایمان، ضیا جالندھری، منیر نیازی، وزیر آغا اور سہیل احمد خان کے کلام منظوم کو تصور انسان کی ذیل میں پرکھا گیا ہے۔ باب ششم اس مقالے کا آخری باب ہے۔ یہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں منظر عام پر آنے والی "نئی شاعری" کی تحریک کے زیر اثر لکھی جانے والی جدید اردو نظم میں انسان کے تصور کی بازیافت کی گئی ہے۔ حصہ دوم میں نئی شاعری سے غیر وابستہ اہم نظم نگاروں کی منظومات میں مضمر انسان کشید کیا گیا ہے جب کہ حصہ سوم میں اکیسویں صدی تا حال کی جدید نظم کے نمایاں شعرا کے ہاں صورت پذیر انسان پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہاں اس امر کا بیان ضروری ہے کہ موجودہ اردو نظم لکھنے والے شعرا کی کثیر تعداد ابھی اپنے فن کی تشکیل میں مصروف ہے تاہم ان کے چیدہ چیدہ کلام میں بھی ایسا انسان وارد ہوا ہے جو اکیسویں صدی کی حشر سامانیوں سے نبرد آزما ہے۔

موضوع مقالہ: "جدید اُردو نظم میں ہئیت کے تجربے "

مقالہ نگار: محمد یٰسین آفاقی،2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر تحسین فراقی ،پنجاب یونیورسٹی،لاہور

اُردو نظم گذشتہ سات صدیوں میں دو ہے سے لے کر نثری نظم اور نئ شعری اصناف تک جن جن اصناف اور ہیبتی تجربوں سے گزری، ان کا جائزہ ایک بھرپور مطالعے کا متقاضی رہا ہے۔ شعرا کی مخصوص افتاد طبع مختلف رجحانات اور میلانات نے ہی کئی تجربوں اور تبدیلیوں کو جنم دیا۔ یوں اردو نظم متعدد ہئیتوں اور صنفوں سے متعارف ہوئی۔ یک سطری نظموں سے یک کتابی نظموں تک اردو نظم کی مختلف شکلوں کی تعداد اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ ہر ہئیت اور صنف اپنے داخلی مزاج کے حوالے سے جداگانہ رنگ، طرز اور تاثیر رکھتی ہے۔ جدید اردو نظم میں جدت پسندوں نے ہیئتی تجربوں کا سلسلہ شروع کیا جو تجرباتی رنگ و آہنگ کے ساتھ ساتھ حقیقی تجربے کی نازک صورتِ حال کا عکاس بھی تھا۔ انھوں نے اپنے نئے اسلوب کے مطابق اُردو نظم کی نئ ہیئتوں کو رواج دیا۔ ان ہیتی تجربوں نے اردو نظم کو جو شکل و صورت عطا کی، اس کی موجودگی میں نئ شعری ہیئتوں اور اصناف کی تلاش کا عمل آج تک جاری ہے۔ جدید اردو نظم میں ہیئتی تجربوں کے دوران مختلف ہیئتوں اور اصناف میں موضوعات کا تنوع وجود پذیر ہوتا رہا ہے۔ نئ شعری ہیئتیں اپنے عہد کی نئ معنویت کو اپنے اندر سمو لیتی ہیں اور ان میں اپنے عہد کی خوشبو سمٹ آتی ہے۔ اس لیے کامیاب ہیئتی تجربے اپنے عہد کی زندگی کا علامتی اظہار بن جاتے ہیں۔

مغربی علوم و فنون اور ہماری مقامی زبانوں کے زیر اثر اردو نظم کے موضوع اور ہیئت میں اضافہ ہوا ہے۔ زیر نظر مقالے میں محمد یٰسین آفاقی نے کوشش کی ہے کہ اس میں کسی ہیئت اور صنف کا تذکرہ رہ نہ جائے۔ اردو نظم میں جب ہیئت کے تجربوں کا ذکر ہوا ہے تو ہیئت سے عموماً اس کی ظاہری ہئیت (Outer Form) مراد لی گئی ہے جس سے شاعری ساختیاتی دائرے میں بند ہو گئی ہے۔ نظموں کی ہیئت میں مضمر داخلی اور خارجی عناصر کی تفہیم اس طور پر نہیں کی گئی کہ وہ ایک اکائی کی صورت میں نظر آنے لگتیں۔ زیر تجزیہ مقالے میں ہیئت کو اس کی خارجی ساخت تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ موضوع اور معانی کے داخلی تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف شعرا کے ہیئتی تشکیل کے طریق کار کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختلف شعرا نے اپنے تخلیقی تجربے، صناعی اور اختراع کے بل بوتے پر جن نئ ہیئتوں کی تشکیل کی ہے یا جن مروجہ ہیئتوں کی تجدید کی ہے، ان کی تشکیل و تجدید شعرا کے ذہن میں موجود

حقیقت کے کس تصویر کے مطابق ہوئی ہے؟ نئی شعری ہیئتیں زندگی اور کائنات کے کن اصولوں کو زیر دام لاتی ہیں؟ کیا یہ ہیئتی تجربات واقعی ناگزیر تھے یا اردو نظم کی روایت سے محض انحراف کی صورت پیدا کی گئی ہے؟ کیا ہیئتی تجربوں میں کوئی طاقت ور الہامی جذبہ موجود ہے؟ کیا کسی اعلیٰ طرز ادا کی تخلیق ہوئی ہے جو انتخابِ الفاظ، امیجری کے استعمال اور اس اسلوب سے تشکیل پاتا ہے جو محنت سے بنا کر مکمل کیا گیا ہو؟ کیا ہیئت کے تجربات میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے فن کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اس بات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے کہ کیا ہیئت کے تجربے شاعر کے حقیقی تجربے کا حاصل تھے یا ہیئت برائے ہیئت کی ذیل میں آتے ہیں؟۔

مقالہ نگار کے مطابق جدید نظم گو شعرا کی نظموں کی تشکیل پر بحث کرتے ہوئے اس بات کو بھی نظر میں رکھا گیا ہے کہ کیا شاعر کے یہاں ہیئت مواد سے متعین ہوتی ہے؟ نظم کی خارجی ہیئت کسی قسم کے جذبات کو ابھارتی ہے؟ کیا یہ جذبات نظم کی داخلی ہیئت سے بھی پیدا ہوتے ہیں؟ ہیئتی تجربوں کا مطالعہ کرنے کے دوران شعرا کی نظموں کی ہیئت کا مکمل تصور کرنے کے لیے ان کے اجزا کی نامیاتی وحدت کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے کیوں کہ شاعر شعری ہیئت کی تخلیق میں حیات اور کائنات کے معلوم اور نا معلوم اجزا سے ایک ہیئتی کل کی تشکیل کرتا ہے۔ اس ہیئتی کلیت میں مختلف اجزا اپنے طور پر مکمل اور اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور نظم کی ہیئتی تعمیر کے ساتھ نامیاتی طور پر منسلک بھی ہوتے ہیں۔ شعرا کے نفس میں جو تمثالیں اور صوتی تواتر ہوتے ہیں وہ ان پر ایک خاص وضع، ایک خاص شکل کیوں عائد کر دیتے ہیں؟ جن شعرا کے یہاں جو ہیئتیں زیادہ مرغوب اور دل پذیر رہی ہیں ان کی بھی نشاندہی اور وضاحت کی گئی ہے۔

مقالے میں اس بات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے کہ کون کون سے ہیئتی تجربے تنقیدی نظر کا معیار بن گئے ہیں اور کون کون سے ہیئتی تجربے ایسے ہیں جن میں تنقیدی نظر کا معیار بننے کی صلاحیت موجود ہے؟ یہ دیکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ کس کس ہیئت اور صنف میں کن کن شعرا کے ہاں ہیئتی تجربے بھرپور انداز میں جلوہ گر ہوئے اور عہد کا وہ مخصوص اسلوب قائم ہوا جس کو رجحان کا نام دیا جاتا ہے۔ جدید اردو نظم میں مختلف ہیئتوں اور صنفوں کے اختیار کرنے میں جو نفسیاتی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی عوامل کار فرما رہے ہیں، یٰسین آفاقی نے ان کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے جو نہ صرف جدید اردو نظم بلکہ جدید اردو ادب کے پس منظر کو سمجھنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ اردو ادب بالخصوص شاعری اس وقت مختلف النوع تجربات کی جولاں گاہ ہے۔ جدید

اردو نظم میں ہیئت کے تجربات کا دائرہ پھیل رہا ہے۔ اس مقالے سے پاکستان اور ہندوستان میں تخلیقی ذہنوں کی نئی آب وہوا سے شناسائی ہو گی۔

"جدید اُردو نظم میں ہیئت کے تجربے" میں یٰسین آفاقی نے جدید اردو نظم میں ہیئت کے تجربوں کا عہد بہ عہد تجزیہ کیا ہے اور حال کے شعری منظر نامے کے تناظر میں ان امکانات کا جائزہ لیا ہے جو ہیئت اور صنف سے متعلق ہیں۔ یوں جدید اردو نظم کو منضبط جائزے کی روشنی میں تحقیقی مقالے کی شکل میں جمع کیا گیا ہے اور ہیئتی تجربات کے محاسن و معائب کو تعصبات سے بالاتر ہو کر معروضی انداز میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالے میں جدید اردو نظم کے ہیئتی اور صنفی منظر نامے کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں ہیئت کے مباحث سے لے کر اب تک ان کی مختلف صورتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ہیئت کے معانی و مطالب اور تصورات کو جمالیات، اخلاقیات، نفسیات، لسانیات اور اسلوب کی روشنی میں تجزیاتی انداز میں بیان کرنے کے بعد ہیئت کی وضاحت کی گئی ہے۔ نیز ہیئت، ساخت اور وضع کا فرق اجاگر کیا گیا ہے۔ نظم کی خارجی اور داخلی ہیئت کی شناخت، نظم کے معنی کا اس کی ہیئت سے رشتہ، نظم کی تشکیل اور ہیئتی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں نظم کے پھیلاؤ میں ہیئت کے ارتقائی عمل کا جائزہ جیسے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔

دوسرا باب جدید اردو نظم میں ہیئت کے تجربوں کے پس منظر سے متعلق ہے۔ اس میں پہلے نظم، جدید نظم تجربہ، ادبی اور ہیئتی تجربہ، ادبی تجربے کے اجزا، شعری متن میں تجربے کا تصور، روایت اور تجربہ جیسے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی بالخصوص ۱۹۴۷ء کے بعد نئی اردو نظم میں ہیئت کے تجربوں کے محرکات وعوامل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب ۱۹۴۷ء تک جدید اردو نظم میں ہونے والے ہیئت کے تجربوں پر مشتمل ہے۔ اس میں معریٰ نظم، اسٹینزا فارم، سانیٹ اور آزاد نظم کی ہیئت، فنی تصورات اور اردو میں ابتدائی تجربے اور ان کے ارتقا کا ہیئتی جائزہ لیا گیا ہے۔ رومانوی تحریک کے زیر اثر اردو نظم میں ہیئت کے تجربے، م۔ حسن لطیفی کی نظمیہ شاعری، ترقی پسند اردو نظم اور ڈاکٹر تصدق حسین خالد کی نظموں میں ہیئتی تجربوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے ن۔ م۔ راشد، میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور ضیا جالندھری کی نظمیہ شاعری میں ہیئتی تجربوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ حلقہ ارباب ذوق سے باہر پنپنے والے شاعروں میں بالخصوص مجید امجد کی نظمیہ شاعری میں ہیئت کے تجربوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔

چوتھا باب ۱۹۴۷ء کے بعد سے مقالے کی تکمیل تک اردو نظم میں ہونے والے ہیئت اور اسلوب کے نئے تجربوں اور نئی شعری اصناف پر مشتمل ہے۔ ان میں مختصر نظم، ثلاثی، مثلث، ہائیکو، ماہیا، دوہا، طویل نظم، کینٹو، ترائیلے، ترتیل، فرد، نثری نظم، لمرک، نظمانہ، تروینی (تربینی)، کافی، کہہ مکرنی، کنڈلیاں، ٹپے، تکونی، سین ریو اور چھلا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اس میں جدیدیت اور نئی اردو نظم کی اشکال و اوضاع اور معاصر اردو نظم کی تشکیل کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ بھی شامل ہے۔ پانچویں باب میں جدید اردو نظم میں ہیئت کے تجربوں کے اثرات کے ضمن میں جدید اردو نظم کی وسعت، ترقی اور نئے ابعاد کی دریافت نئی شعری اصناف کے ہیئتی تنوعات اور ان کے مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں کتابیات پیش کی گئی ہیں۔ یٰسین آفاقی اپنے مقالے کے تیسرے باب میں شامل بعض شعرا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> " اس مقالے کے تیسرے باب "جدید اردو نظم میں ہیئت کے تجربے ۱۹۴۷ء تک" میں بعض ان شعرا مثلاً ن۔ م۔ راشد، مجید امجد، قیوم نظر، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور ضیاء جالندھری پر بحث کی گئی ہے جن کے ہاں ہیئت کے تجربے ۱۹۴۷ء تک ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن ان شعرا کا اصل دور ۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ ہے"۔(25)

درج بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے ان کے ہیئتی تجربوں اور نظمیہ شاعری کی تشکیل پر بحث مقالے کے تیسرے باب میں کی ہے۔ اردو نظم میں مختصر نظم، طویل نظم، ترائیلے اور ماہیا وغیرہ کا آغاز ۱۹۴۷ء سے پہلے ہوا لیکن ہیئت اور صنف کے طور پر ان کا رواج ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا۔ اس لیے ان پر مقالے کے چوتھے باب میں بحث کی گئی ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو رباعیات پر تصوف کے اثرات"

مقالہ نگار: محمد، 2014ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر راحیلہ تنویر، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

تصوف تزکیۂ نفس کا ایک طریقہ ہے اور قلبی کیفیات و اعمال جیسے توبہ و انابت، خوف و محبت، صبر و شکر، رجا و توکل اور تسلیم و رضا کو روح تصوف قرار دیا جاتا ہے۔ تصوف اولاً تزکیۂ نفس کا ایک طریقہ ہے، ثانیاً قرب الٰہی کے ایک خاص مفہوم کا علم بردار ہے، ثالثاً علم و عرفان ایک مخصوص راہ تجویز کرتا ہے اور رابعاً زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر اور مثالی زندگی کا ایک خاص نقشہ پیش کرتا ہے۔ اکثر صوفیا نے

اسے فقہ باطن، تزکیہ نفس اور سلوک واحسان کا نام دیا ہے۔ صوفیا کے نزیک دو نظریات کار فرما نظر آتے ہیں۔ وحدت الوجود یعنی "ہمہ اوست" کے نظریے سے مراد ہے کہ کائنات میں حقیقی ذات صرف خدا کی ہے۔ باقی سب چیزیں اسی کی ذات کا عکس ہیں۔ وہ حقیقی وجود نہیں رکھتیں۔ وحدت الشہود یعنی "ہمہ از اوست"۔ اس سے مراد ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں اللہ کے نور کا حصہ ہیں۔ اس بحث کے نتیجے میں ایک سالک مختلف مراحل "ابدال، قطب، غوث وغیرہ" طے کرتا ہوا مجذوب ہو جاتا ہے۔

تصوف ایک ایسا طریقہ عمل ہے جس پر سالک یا مسلمان چل کر قرب الٰہی حاصل کرتا ہے۔ تصوف ایک مذہبی طرز عمل ہے، جسے مذہبی حلقوں میں ایک کثیر تعداد نے اپنا رکھا ہے۔ یہ ایک باقاعدہ اور مستقل ادارے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ تصوف نے عام لوگوں کے طرز عمل، رویوں، رہن سہن، انداز و اطوار، تہذیب و تمدن اور کلچر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسی طرح شاعری جو عام معاشرتی رویوں کی عکاس ہوتی ہے، اس پر بھی تصوف کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ لہذا تصوف، ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔

رباعی ایک صنف سخن ہے جس میں عام طور پر چار مصرعوں میں کسی ایک مضمون کو بیان کیا جاتا ہے۔ مقالہ نگار محمد نے اردو رباعیات پر تصوف کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے مختلف نقادوں اور مفکرین کی آرا میں رباعی اور تصوف پر بحث کی ہے۔ اُن کے مطابق اردو میں رباعی کا آغاز دکنی دور سے ہوتا ہے۔ رباعی اپنی امتیازی خصوصیات، اپنے انداز و اسلوب اور اوزان و بحور کی وجہ سے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ دکن کے رباعی گو شعرا نے زندگی کے مختلف تجربات کو نہایت عمدگی کے ساتھ رباعی میں بیان کیا ہے۔ رباعی کے مضامین و موضوعات مخصوص نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایک تنوع اور رنگارنگی ہوتی ہے۔ رباعیات میں اخلاقیات، تصوف اور عشق و محبت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ اُن کا یہ مقالہ اردو رباعی کے تعارف، روایت اور ارتقا کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے قدیم دور سے عصر حاضر کی شاعری پر محیط ہے۔ تاہم اس میں نمائندہ اور صاحب دیوان شعرا کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور ان شعرا کی اہم اور منتخب رباعیات کے اثرات کا جائزہ تصوف کے زیر اثر لیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "جوش ملیح آبادی کی اُردو نظموں کی تدوین"

مقالہ نگار: وسیم عباس گل، 2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شبیر احمد، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

اُردو کے معروف شاعر جوش ملیح آبادی کا رنگ سخن اور اندازِ بیاں علیحدہ اور منفرد ہے۔ لفظیات اور لفظیات کو برتنے کا ڈھنگ اُن کا اپنا ہے۔ اُردو شاعری کے ایوان میں اسی انفرادیت سے ان کا امتیاز قائم ہے۔ جس مشتاقی اور پختگی سے اُنہوں نے لفظیات کے استعمال اور اُن الفاظ و تراکیب کی نشست اور دروبست کا اہتمام کیا ہے اس کی مثال اُردو شاعری میں کم کم ملتی ہے۔ ان کے موقلم کی دلآویز جنبش نے مشکل اور ثقیل الفاظ کو اپنی جولانی اور روانی سے موم کر دیا ہے اور ان میں اپنے اسلوب خاص کا رنگ بھر دیا ہے۔ ان کے اسلوب خاص میں گھن گرج اور دبنگ لہجہ واضح طور پر نمایاں ہے۔ وہ خیال کی ندرت اور فکر کی بلندی کے شاعر تو نہیں لیکن قدرتِ کلام اور اظہار و بیان کے کمال و جمال کے شاعر ہیں۔ جوش ملیح آبادی قدرتِ الفاظ، سلاست و روانی اور معنوی ہم آہنگی و لفظی ربط کا وہ خزانہ اپنے پاس رکھتے تھے جو تاریخ ادب کا آج بیش بہا حصہ ہے۔ ۸۸ سال کے عرصۂ حیات میں وہ کم و بیش ۷۵ سال تک شعر و ادب کے تخلیقی، تہذیبی پہلوؤں سے وابستہ رہے۔ اُن کی زندگی ادب و فن کے اتنے طویل گزری ہے کہ ادبی فنی ادراک کے ساتھ ساتھ اُن کے کثیر التصانیف ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش ایک بڑی قد آور تخلیقی شخصیت ہیں لیکن اشاعت و تشہیر کے حوالے سے ان کا معاملہ اقبالؒ کے برعکس ہے بلکہ فراق و فیض، سجاد ظہیر، سردار جعفری اور پھر راشد، حفیظ ندیم تک کسی کی ادبی تحریریں اس طرح منتشر نہیں ہیں جس بے دردی سے جوش کا ادبی اثاثہ بکھرا ہوا ہے۔ انہوں نے بہت لکھا لیکن ملیح آباد، لکھنؤ، حیدر آباد دکن، دہلی، کراچی اور پھر اسلام آباد میں اُن کی تحریریں یکجا نہیں ہو سکیں۔

ادبی تاریخ کے بیشتر دانشوروں، ادیبوں اور نقادوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ جوش اپنے جملہ شعری و نثری اظہار کے ساتھ آج کے قاری کے سامنے نہیں ہیں۔ ان کی مطبوعات خاص ہیں مگر دستیاب نہیں ہوتیں اور نہ جانے کتنی تحریریں غیر مطبوعہ اور بکھری ہوئی ہیں۔ ایسے میں ان پر کسی بھی تحقیقی و تنقیدی و ادبی کام کی ضرورت و اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مقالہ بحوالہ عنوان بال جوش ملیح آبادی کی اُردو نظموں کی تدوین کے اُس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں جوش کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظموں کو مدون کیا گیا ہے تاکہ اُن کے اردو ادب کے قیمتی سرمائے کو محفوظ کیا جا سکے۔ اسی نقطے کے پیش نظر مقالہ نگار وسیم عباس گل نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔

وسیم عباس گل کا تحریر کردہ یہ مقالہ ابواب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل "جوش ملیح آبادی :احوال و آثار" ہے جس میں نہایت مختصر مگر جامع انداز میں اُن کے حالاتِ زندگی کو بیان کیا ہے۔ باب

دوم "جوش ملیح آبادی کی شاعری کے موضوعات اور خصائص" ہے۔ اس باب میں اُن کی شاعری کے اہم موضوعات اور خصائص کو پیش کیا گیا ہے۔باب سوم 'جوش ملیح آبادی کے مطبوعہ مجموعہ جات کی نظموں کی تدوین" ہے۔اس میں ان کے مطبوعہ مجموعوں "روحِ ادب، آوازۂ حق، شاعر کی راتیں، پیغمبر اسلام، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، حرف و حکایت، آیات و نغمات، عرش و فرش، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، سرودو خروش، سموم و صبا، طلوع فکر، نوادر جوش، الہام و افکار، محراب و مضراب کی نظموں کی تدوین کی گئی ہے۔باب چہارم مختلف رسائل و جرائد میں منتشر جوش ملیح آبادی کی نظموں کی تدوین ہے۔ جس میں "افکار، نقوش، فنون، نقش،، آجکل اور "اوراقِ جوش" میں جوش کی منتشر نظموں کی رسائل کے تاریخی اعتبار سے تدوین کی گئی ہے۔باب پنجم "محاکمہ "پر مشتمل ہے۔اس میں سابقہ ابواب کا خلاصہ شامل کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو نظم میں ہیت کے تجربات"

مقالہ نگار: حشمت خان،2020ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نذر عابد، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

لفظ "نظم" پوری شاعری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور غزل کے علاوہ شاعری کی جتنی بھی اصناف ہیں اُن کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ ان اصناف میں کچھ ہیئت کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں اور کچھ موضوع کے لحاظ سے ۔ ہیئت کے اعتبار سے نظم کی جو اصناف معروف ہیں ان میں "مثنوی، رباعی، قطعہ، مثلث، مربع ، مخمس، مسدس"وغیرہ جیسی اصناف آتی ہیں۔ موضوع کے حوالے سے جو اصناف ارتقائی صورت میں سامنے آئی ہیں اُن میں حمد، نعت، قصیدہ، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت وغیرہ شامل ہیں۔ اس مقالے میں جس نظم کو موضوع بحث بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس کا تعلق نہ کسی خاص ہیئت سے بنتا ہے اور نہ خاص موضوع سے۔ بلکہ یہ وہ صنف سخن ہے جو کسی بھی موضوع پر کسی بھی ہیئت میں تخلیق کی جاسکتی ہے۔ چونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہیئت کے اعتبار سے نظم کے خدو خال میں مزید تبدیلی آئی اور نظم کی تقسیم پابند، معریٰ، آزاد اور نثری نظم میں کر دی گئی۔ اس لیے زیر مطالعہ مقالے میں نظم کی ان ہئیتوں کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مقالہ نگار حشمت خان نے مقالے کو چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں اُردو نظم کے تمہیدی مباحث بیان کیے گئے ہیں۔ باب دوم میں پابند نظم میں جو ہیئتی تجربات کیے گئے ہیں اُن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب سوم میں معریٰ نظم کے ہیئتی سفر کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ چوتھے باب میں

آزاد اُردو نظم میں ہیئت کے اعتبار سے جو متنوع تجربات برتے گئے ہیں، اُن پر بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم میں نثری ہیئت میں تخلیق کی جانے والی نظموں کی روشنی میں منفرد ہیئتی تجربات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے اور باب ششم جو اس مقالے کا آخری باب ہے، اُس میں پچھلے تمام ابواب کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

صنف سخن کے اعتبار سے اُردو نظم کی ایک وسیع دنیا ہے۔ نظم کا لفظ جب ہم غزل کے مقابلے میں استعمال کرتے ہیں تو غزل کے بغیر دیگر تمام شعری سرمایے کو نظم کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ شعری اصناف میں بعض موضوع کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں مثال کے طور پر حمد، نعت، منقبت، شہر آشوب، قصیدہ وغیرہ۔ جب کہ بعض شعری اصناف ہیئت کے اعتبار سے جانی جاتی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو میں ایسی نظم مروج ہونے لگی جسے "نظم جدید" کا نام دیا گیا جس کا تعلق نہ کسی مخصوص موضوع سے بنتا ہے اور نہ خاص ہیئت سے۔ بلکہ یہ صنف سخن کسی بھی ہیئت میں کسی بھی موضوع پر تخلیق کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اس کی بنیاد جعفر زٹلی اور نظیر اکبر آبادی رکھ چکے تھے تاہم ۱۸۵۷ء کے بعد متعدد شعرا اس کی طرف متوجہ ہوئے اور نظم کو اعلیٰ مقام عطا کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُردو نظم روایتی ہیئتوں کے علاوہ جدید ہیئتوں میں بھی تخلیق کی جانے لگی۔ آغاز میں نظم پابند ہیئت میں لکھی جاتی تھی۔ پابند نظم بذات خود ایک وسیع کائنات کی حامل ہے جو قطعہ، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، سانیٹ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، معشر وغیرہ جیسی ہئیتوں میں منقسم ہے۔ ان ہیئتوں میں متعدد شعرا نے طبع آزمائی کر کے پابند نظم کو ثروت مند بنایا۔ آزاد، حالی، شبلی، فیض، مخدوم، قتیل، کیفی، ساحر وغیرہ وہ معروف شعرا ہیں جنھوں نے پابند نظم کو بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں پابند نظم کے ساتھ ساتھ معریٰ نظم کا رواج شروع ہوا جس میں قافیہ و ردیف کی پابندی ختم ہوئی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں معریٰ نظم کے ساتھ ساتھ آزاد نظم تخلیق کی جانے لگی۔ آزاد و معریٰ ہیئتوں میں نظم کا سفر ابھی جاری تھا کہ بیسویں صدی میں ساٹھ کی دہائی میں نظم، نثری ہیئت میں متعارف ہوئی۔ پابند ہیئت سے لے کر نثری ہیئت تک نظم نے جو سفر طے کیا۔ اس دوران میں اُردو کے متعدد شعرا نے مختلف ہیئتی تجربات سے اس کا دامن وسعت آشنا کیا جس پر اُردو نظم ہمیشہ کے لیے نازاں رہے گی۔

موضوع مقالہ: "اسالیب نثر اُردو کے تحولات: آغاز سے وفاتِ غالب تک"

مقالہ نگار: ساجد صدیق نظامی، 2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

"تحول "جدید فارسی تنقید میں استعمال ہونے والی معروف اصطلاح ہے جس کے لغوی معنی Switch, Shift, Transition, Transformation، وضع بہ وضع تبدیلی وغیرہ کے ہیں۔ مقالہ نگار ساجد صدیق نظامی کے مطابق "تحول" اردو نثر کے اسلوبی مطالعے کے لیے موزوں تر اصطلاح محسوس ہوتی ہے۔ اردو نثر اور اس کے کلاسیکی و جدید اسالیب کے مختلف پہلوؤں پر اس سے قبل بھی کام ہو چکا ہے۔ مثلاً اردو ادب کی متعدد تواریخ میں اردو نثر کے مختلف ادوار کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اس فہرست میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو (جلد اوّل تا چہارم) نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر سیدہ جعفر اور ڈاکٹر گیان چند جین کی تاریخ ادب اردو (۱۷۰۰ء تک) (جلد اول تا پنجم) بھی قابل ذکر ہے۔ مگر اس ضمن میں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ تاریخ میں صرف انہی تخلیق کاروں یا رجحانات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو مؤرخ کے نزدیک اہمیت کے حامل ہوں۔ لہٰذا اس صورت میں اردو کی نثری روایت کا تفصیلی مطالعہ کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ مؤخر الذکر تاریخ ادب کے ضمن میں یہ بات واضح ہے کہ یہ ۱۷۰۰ء تک کی تاریخ ہے لہٰذا ۱۷۰۰ء کے بعد اردو ادب کا دور زریں اس کے احاطے سے باہر ہو جاتا ہے لہٰذا اس تاریخ میں بھی نثر نگاری کی روایت کا تفصیلی مطالعہ مفقود ہے۔

تواریخ ادب کے علاوہ صرف نثری روایت پر علیحدہ کتب بھی موجود ہیں۔ اس ضمن میں "داستان تاریخ اردو" از حامد حسن قادری، 'سیر المصنفین: جلد اول و دوم" از محمد یحیی تنہا قابل ذکر ہیں۔ تقریباً پون صدی قبل ان کتابوں میں مصنفین نے اردو کی نثری روایت کا جائزہ لے کر اس دور کے دستیاب وسائل کی مدد سے تاریخ نثر اردو کی ترتیب کا کام انجام دیا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی ان سے استفادہ عام ہے۔ مگر ان کتب میں یہ کمی موجود ہے کہ ان کی تصنیف کے زمانے سے اب تک بہت سے نئے نثر پارے دریافت ہو چکے ہیں۔ بہت سے مباحث پر از سر نو بحث کے بعد ان کا درست مقام و مرتبہ متعین ہوا ہے۔ کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔ لہٰذا ان کی موجودگی کے باوجود ایک ایسے تحقیقی کام کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ان خامیوں سے پاک ہو۔ اسی طرح کچھ کتب اس قسم کی تحریر کی گئی ہیں جن میں محض ایک دور، ایک علاقے، ایک ادارے یا ایک صنف کی بنیاد پر نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں "ارباب نثر اردو" از سید محمد، "بنگال کا اردو ادب: انیسویں صدی میں" از ڈاکٹر جاوید نہال، "اڑیسہ میں اردو" از حفیظ اللہ نیوپوری، "ترقی پسند اردو نثر کے پچاس سال" از سید علی حسنین نقوی، "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" از مولوی

عبد الحق، "قدیم اردو" از مولوی عبد الحق، "راجستھان میں اردو ادب: ۱۸۵۷ء تک" از ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ کتب کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص دور، کسی خاص علاقے یا کسی خاص ادارے سے متعلق کیے گئے تحقیقی کام ہیں۔ اسی طرح "اردو کی نثری داستانیں" از گیان چند، "مرحوم دہلی کالج" از مولوی عبد الحق کے نام بھی لیے جاسکتے ہیں، ان تحقیقی کاموں کا معاملہ بھی مندرجہ بالا کتب جیسا ہی ہے۔ ان تحقیقی کاموں کے علاوہ بعض کتب ایسی بھی ہیں جو براہ راست اسالیب نثر کے موضوع پر تحریر کی گئی ہیں۔ ان کتب میں " اردو کے نثری اسالیب" از شہاب ظفر اعظمی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کے عنوان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے تمام نمایاں نثری اسالیب کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہو گا مگر عملاً اس کتاب میں ۱۸۵۷ء تک کی نثر کا سرسری تذکرہ کیا گیا ہے جبکہ زیادہ زور بیسویں صدی کے نثر نگاروں کی خدمات پر دیا گیا ہے اور ان کے اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب زیر تحقیق موضوع کے دائرے سے باہر ہو جاتی ہے۔

"ادبی نثر کا ارتقا، شمالی ہند میں: ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک" از ڈاکٹر شہناز انجم کا عنوان اس کی جامعیت کو ضرور ظاہر کرتا ہے مگر دو پہلو قابل غور ہیں۔ اول یہ کہ یہ ایک علاقے کی نثر کے جائزے پر ہے، دوم یہ ایک مخصوص دور کی نثر کا جائزہ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ فی الاصل اس کتاب میں اس عہد اور علاقے کے داستانی ادب، مکتوباتی ادب اور صحافتی ادب سے ہی سروکار رکھا گیا ہے۔ "اردو نثر کا ارتقا: آغاز سے ۱۸۵۷ء تک" از ڈاکٹر شگفتہ زکریا اپنے موضوع پر عمدہ کتاب ہے جس میں اجمالاً اردو نثر کے تمام اہم مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مزید یہ کہ اس میں دہلی کالج کا تذکرہ بھی ملتا ہے جو کہ اس موضوع کی دیگر کتب میں عموماً نہیں پایا جاتا تاہم یہ کتاب چند نمایاں نثر نگاروں کے جائزے تک محدود ہے۔

درج بالا مختلف تحقیقی و تنقیدی کاموں کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اردو اسالیب نثر کے ایسے مطالعے کی ضرورت ہے جو اول تو اردو نثر میں بتدریج آتی تبدیلیوں کی نشاندہی کرے دوسرا ان تبدیلیوں کا جامع تجزیہ کرے اور پھر اردو نثر کے نمایاں انفرادیت رکھنے والے نثر نگاروں کے تخلیقی کام کا مفصل جائزہ لے۔ اس کے علاوہ عہد بہ عہد اردو نثر کی صلاحیت اظہار کے اضافے میں کارفرما وجوہات کا پتہ لگائے اور جن اہم شخصیات یا اداروں کی خدمات کا جامع جائزہ اب تک نہیں لیا گیا، اردو نثر کی ترقی میں ان کا صحیح مرتبہ بھی متعین کیا جائے۔

"اسالیب نثر اُردو کے تحولات: آغاز سے وفاتِ غالب تک" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے مذکورہ مقالے کو لکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ البتہ اردو نثر کے پھیلاؤ کو سامنے رکھتے ہوئے مقالہ نگار نے اسالیب نثر کے مطالعے کے لیے زمانی حد بندی ۱۸۶۹ء تک کی ہے۔ یہ سال اس لیے چنا گیا ہے کہ اس سال غالب اور رجب علی بیگ سرور کی وفات ہوئی۔ سر سید انگلستان کے دورے پر روانہ ہوئے۔ جہاں سے واپسی پر انھوں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ ۱۸۶۹ء کے بعد سے ہی محمد حسین آزاد، حالی اور نذیر احمد دہلوی کی تصانیف تسلسل کے ساتھ سامنے آنے لگیں۔ گویا ۱۸۶۹ء کے بعد اردو نثر کے اسالیب کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مقالہ نگار نے اس مقالے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں اسلوب اور تحولِ اسالیب کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ اسلوب کے معنی اور اس کی مختلف تعریفیں، ناقدین کی آرا، مطالعہ اسلوب کے طریقے، اسلوب کے تشکیلی عناصر، اسلوب اور اسلوبیات کا تعلق، مطالعہ اسلوب کے ضمن میں مشہور چند اصطلاحات کے مفاہیم کا تعارف، تحولِ اسالیب، اس باب کے ذیلی موضوعات ہیں۔

دوسرے باب میں اردو نثر کی ابتدا سے ۱۷۰۰ء تک کے اردو نثر کے سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلے مختلف بزرگان سے منسوب متفرق نثری جملوں اور مختلف نثری تحریروں کی اصلیت کی تحقیق کی گئی ہے اور اس کے بعد جمیل جالبی صاحب کی تحقیق کے مطابق "خیر البیان" اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے، کو دلائل سے رد کیا گیا ہے۔ اردو کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف "کلمۃ الحقائق" سے اردو نثر کے دکنی اسالیب کا مفصل جائزہ شروع کیا گیا ہے۔ اس عہد کے نمایاں نثر نگاروں برہان الدین جانم، وجہی، امین الدین اعلیٰ، میراں جی خدا نما، میراں یعقوب کے ساتھ ساتھ اس دور کے مختلف کم اہم مصنفین کے اسالیب نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے مجموعی تجزیے میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی نثری روایات میں فرق اور دکنی دور کی تصانیف میں اسالیب کے تنوع پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرے باب کا عنوان "شمالی ہند کی نثر اور دیگر نثری نمونے ۱۸۰۰ء تک" ہے۔ اس باب میں ۱۷۰۰ء سے ۱۸۰۰ء کے درمیان اردو نثر کی مختلف النوع نثری تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں "عبد الولی عزلت، محمد باقر آگاہ، مرزا رفیع سودا، مرزا علی نقی انصاف" کی متفرق نثری تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں اس صدی کی باقاعدہ نثری تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں "کربل کتھا، قصہ مہر افروز و دلبر، تفسیر مرادیہ، نوطرزِ مرصع قصہ واحوالِ روہیل، موضح قرآن، عجائب

القصص، جذب عشق، قصہ نورتنِ جہاں" جیسی نثری تصانیف کے اسالیب پر نظر ڈالی گئی ہے۔اس صدی سے اردو نثر اپنی شناخت قائم کرنے کی کشمکش سے گزرتی نظر آتی ہے۔اس عہد میں تحولِ اسالیب میں موضوع کی اثر پذیری بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ایک طرف "نوطرزِ مرصع "کا اسلوب نظر آتا ہے تو دوسری جانب " تفسیر مرادیہ اور عجائب القصص "کا اسلوب ملتا ہے۔اس دور کے اُردو نثری کارناموں کے حوالے سے مقالہ نگار ساجد صدیق نظامی لکھتے ہیں:

> "اس دور کے اسالیب بہت ترقی یافتہ تو نہیں مگر اس عہد میں شمالی ہند میں اردو نثر میں پہلی داستان لکھی گئی ہے ، اردو میں پہلا ترجمہ قرآن کیا گیا ہے۔ تاریخ کے موضوع پر پہلی کتاب لکھی گئی ہے اور پہلی تفسیر قرآن لکھنے کی کوشش کی گئی ہے"۔(26)

"اسالیب نثرِ اُردو کے تحولات: آغاز سے وفاتِ غالب تک" کے باب سوم میں شامل مجموعی تجزیے میں اس عہد کے اسالیب نثر کا جائزہ لیا گیا ہے اور خاص کر تصنع آمیزی اور سادگی کی کشمکش کا تجزیہ کیا گیا ہے۔چوتھا باب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین سے متعلق ہے۔پہلے کالج کے قیام کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور پھر فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی مصنفین "میر امن، حیدری، اشک حسینی، حفیظ الدین احمد، شیخ اکرام علی، نہال چند، کاظم علی جوان" کی دستیاب نثری تصانیف اور ان میں پائے جانے والے اسالیب کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ عام خیال کے بر عکس فورٹ ولیم کالج میں اسالیب نثر اردو کا بے حد تنوع پایا جاتا ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے بھی اور مصنفین کے حوالے سے بھی۔اس امر پر مجموعی تجزیے میں تفصیلاً اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پانچواں باب" دیگر اسالیب نثر ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۷ء تک "کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ ۱۸۴۷ء تک حد بندی کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا لکھا گیا پہلا معلوم خط ۱۸۴۷ء کا ہے۔اسالیب نثر پہ غالب کی اثر پذیری ڈھکی چھپی نہیں۔ نیز اسی برس "دلی کالج" اور 'دلی ٹرانس لیشن سوسائٹی" کی مطبوعات تسلسل سے سامنے آنے لگیں تھیں۔اس باب کے مزید پانچ حصے ہیں۔پہلے حصے میں فورٹ ولیم کالج کے معاصر مصنفین جو ہندوستان کے دیگر علاقوں میں نثری کاوشوں میں مصروف تھے، کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ان میں "میر انشا اللہ خاں انشاء، الٰہی بخش، شوق اکبر آبادی، محمد غوث زریں، مہر چند کھتری، محمد بخش مہجور" شامل ہیں۔اس باب کے حصہ اول کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے متوازی ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی اردو نثر کی روایت جاری تھی اور اس میں نئے نئے تجربات ہو رہے تھے۔

اس باب کے دوسرے حصے میں ۱۸۱۰ء سے ۱۸۴۷ء تک کے داستانی، حکایاتی و افسانوی اسالیب کو جگہ دی گئی ہے۔ اس حصے کے نمایاں مصنفین میں "عظمت اللہ نیاز، نرائن جہاں، سعادت یار خاں رنگین، فقیر محمد خاں گویا، لالہ گوبند سنگھ عندلیب، عبد الکریم لکھنوی، رجب علی بیگ سرور" شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں اس عہد کے مذہبی نثری اسالیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حصے کو مزید دو اجزا میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا جزو اسلامی مذہبی نثر کے جائزے پہ مشتمل ہے جبکہ دوسرا جزو اس دور کے لکھے جانے والے عیسوی مذہبی نثر کے جائزے پہ مشتمل ہے۔ چوتھے حصے میں غیر افسانوی اسالیب میں سائنسی، علمی، تاریخی اور صحافتی نثر کے اسالیب شامل تجزیہ کیے گئے ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق اس حصے کو شامل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اندازہ ہو پائے کہ ۱۸۳۰ء کے آتے آتے اردو نثر کی صلاحیت اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ اس میں سائنسی مضامین بھی با آسانی بیان ہو سکیں۔ اس اہمیت کے پیش نظر اس عہد کی مختلف سائنسی و تاریخی تصانیف کے اسالیب نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی حصے میں اس عہد کی صحافتی نثر کا مختصر سا تذکرہ بھی شامل ہے۔ پانچویں حصے میں اس دور کے سفر ناموں "سیاحت نامہ کریم خاں اور عجائباتِ فرنگ" کا اسلوب زیر مطالعہ لایا گیا ہے۔ اس طویل باب کے آخر میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۷ء تک کے اسالیب نثر کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

چھٹا باب ۱۸۴۷ء سے ۱۸۶۹ء کے اسالیب نثر کا احاطہ کرتا ہے جس کا عنوان "غالب اور معاصرین غالب" رکھا گیا ہے۔ اس باب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں داستانی، حکایاتی و افسانوی اسالیب شامل کیے گئے ہیں۔ اسی حصے کے آخر میں اس عہد کی تین شخصیات جنھیں کسی خاص زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا، یعنی غالب، سر سید اور واجد علی شاہ کی نثری خدمات اور ان کے نثری اسالیب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس عہد میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونے والے ناولوں اور چند دوسری کتب کے اسالیب کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں تاریخی و صحافتی نثر کے اسالیب سے اعتنا کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں اس عہد کے معروف مذہبی اسالیب نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں دلی کالج، انجینئر نگ کالج رڑکی، علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی اور متفرق کاوشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح انھوں نے ۱۸۴۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک اردو نثر میں جدید سائنسی و علمی مضامین کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔

اس عہد میں سائنسی، فنی، تکنیکی اسالیب نثر میں یکا یک انقلاب پیدا ہو گیا۔ اردو نثر جو پہلے محض داستان و حکایات میں گھری تھی یکا یک نئی روشنی سے دوچار ہوئی۔ ساجد نظامی کے مطابق اس باب میں تھامسن انجینئر نگ کالج رڑکی کے بارے میں بہت سی معلومات پہلی دفعہ اردو دنیا کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ ۱۸۶۹ء

کے آتے آتے اردو نثر اپنے مختلف اسالیبی تجربات کے نتیجے میں اس قابل ہو چکی تھی کہ اس میں کسی بھی قسم کا مضمون کسی بھی انداز یا اسلوب سے بیان کیا جاسکتا تھا۔ سر سید اور اردو نثر کے "عناصر خمسہ" نے اردو نثر کے دامن کو جن لازوال کارناموں اور اسالیب سے مزین کیا، ان کے پس منظر میں یہی نثری اسالیبی روایت کام کر رہی تھی۔ اردو نثر کے اسالیب کئی طرح کی تبدیلیوں سے گزرے۔ ان میں نئے نئے تجربات ہوئے جو فکر کی سطح پر بھی تھے اور فن کی سطح پر بھی۔ مگر ان کا خاموش مقصد یہی تھا کہ اردو نثر کی قوتِ اظہار میں وسعت لائی جائے۔ ایسی کوششوں میں یقیناً کئی ایسے اسالیب بھی ہوں گے جو آج اَز کار رفتہ ہیں اور جنھیں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا مگر ان کے عہد کے حالات اور علمی ترقی کو پیش نظر رکھا جائے تو اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان ناپسندیدہ اسالیب نے بھی کسی نہ کسی حوالے سے اردو نثر کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ مقالے کا آخری باب "مجموعی جائزے" پر مشتمل ہے۔

اس مقالے کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے کتب، رسائل کے نام خط نسخ میں درج کیے ہیں۔ حواشی کو پاورق میں رکھنے کا بندوبست کیا ہے۔ ہر باب میں متعلقہ کتاب کا پہلا حوالہ مکمل درج کیا ہے جبکہ بقیہ باب میں اس کتاب سے حوالے کے لیے صرف کتاب کا نام اور صفحہ نمبر درج کیا گیا ہے۔ ایسی معلومات یا آرا جو کسی حوالے سے ضروری ہیں مگر مقالے کے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی ہیں انھیں بھی پاورق حواشی میں درج کیا گیا ہے۔ کتابیات میں کتب کو مصنف وار کی ترتیب دی گئی ہے۔ رسائل، لغات کی فہرست کے ساتھ انگریزی کتب کی کتابیات علیحدہ ترتیب دی گئی ہے۔ جہاں جہاں ہجری سنین دیے گئے ہیں ساتھ ہی مطابقت کے عیسوی سنین بھی دیے گئے ہیں۔ البتہ آخری دو ایک ابواب میں صرف عیسوی سنین ہی لکھے گئے ہیں کیونکہ مقالہ نگار کے مطابق اس وقت تک رفتہ رفتہ عیسوی سنین کا چلن بڑھ چکا تھا۔ کتابیات میں جہاں صرف ہجری سنہ دستیاب تھا، وہاں بھی عیسوی سنہ کی مطابقت درج کر دی گئی ہے۔

لسان ولسانیات:

لسان سے مراد زبان ہے اور زبان کے بارے میں علم کو عرف عام میں لسانیات کہا جاتا ہے۔

خوبصورت گفتگو انسان کی پہچان ہوتی ہے اور گفتگو کے ذریعے سے ہی انسان پوری دنیا کو گرویدہ بنا سکتا ہے اور یہی گفتگو اپنوں کو بھی بیگانہ کر سکتی ہے۔ اس حوالے سے اسلامی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے سامنے آپؐ کے جان نثار اصحابؓ اپنی آواز پست رکھتے تھے اور سخت لہجے میں گفتگو

کرنے کو باعث گناہ سمجھتے تھے اسی طرح حضورؐ پر پہلی وحی کا نزول بھی اقراء (پڑھ) سے ہوا۔ مذکورہ بالا دو حوالوں سے ہمیں زبان کی اہمیت سے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی کیا اہمیت ہے۔ جس طرح گفتگو کی اہمیت ہے اس طرح بولنے کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب بھی ضروری ہے۔ الفاظ زبان کے لباس ہوتے ہیں پس منحصر اس بات پر ہے کہ آپ کتنا عمدہ لباس زیب تن کرتے ہیں جس سے ستر پوشی بھی ہو اور اچھا بھی لگے۔

زبان اُردو جو ہماری قومی شناخت ہے، ایک مخلوط زبان ہے جس میں ہندوستان بھر کی مقامی بولیوں کے علاوہ ملکی و غیر ملکی زبانون کے الفاظ کا ذخیرہ شامل ہے۔ اُردو زبان کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی اس میں جذب آسانی سے ہو جاتے ہیں اور یہ الفاظ اپنی بیگانگی کا احساس تک نہیں ہونے دیتے اور یہی ہمارے قومی مزاج کا بھی خاصا ہونا چاہیے۔ زبان کو اظہار خیالات کا وسیلہ بھی کہا جاتا ہے۔ خیالات و افکار کا ابلاغ الفاظ کی بدولت ہوتا ہے۔ علم کی دولت بھی الفاظ ہی کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتی ہے یہ زبان اللہ کا عطیہ ہے یہ نسل انسانی کی خوش بختی ہے کہ زبان اسے ورثے میں ملی ہے۔ ذیل میں پاکستانی جامعات میں لسانیات کے تناظر میں کی جانے والی تحقیق کا تجزیاتی مطالعہ پیش ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو زبان کے غیر آریائی نظریات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: بادشاہ منیر بخاری، 2012ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر نذیر تبسم، جامعہ پشاور، پشاور

اُردو زبان پر مختلف ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہے اور کچھ تاثراتی تجزیے بھی کیے ہیں مگر ادبی انداز میں زبان کی سائنس کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مسعود حسین خان، محی الدین زور اور خلیل صدیقی کے علاوہ کسی نے علم لسانیات کی باقاعدہ تربیت و تعلیم حاصل نہیں کی۔ مسعود حسین خان اور محی الدین زور قادری نے بھی سندی مقالے لکھنے کے بعد اس میدان میں تحقیق کا سلسلہ موقوف کر دیا جبکہ خلیل صدیقی نے تراجم کی طرف زیادہ توجہ دی۔ باقی جتنے اہل علم ہیں وہ اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر اردو لسانیات میں کام کرتے رہے۔ ظاہر ہے تربیت نہ ہونے کے سبب وہ کوئی کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ کچھ ماہرین لسانیات اردو کو آریائی اور معدودے چند ماہرین اسے غیر آریائی قرار دیتے ہیں۔ جو اُردو زبان کو آریائی زبان قرار دیتے ہیں ان کے پاس بھی اپنے دلائل نہیں بلکہ مستشرقین کے وضع کردہ پیمانے ہیں جن پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا گیا اور جو اردو

زبان کو غیر آریائی سمجھتے ہیں وہ مغرب دشمنی میں نظریے تشکیل دیتے رہے۔ غیر آریائی نظریات کے بنیادی دعوے داروں عین الحق فرید کوٹی اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے ہڑپہ اور قدیم ویدوں کا سہارا لے کر اپنی کتابیں تخلیق کیں۔

ان نظریات کے مطالعے میں، مقالہ نگار نے علم آثار قدیمہ اور قدیم تاریخ و جغرافیہ کا مطالعہ کیا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ ہمیشہ پر اسرار رہی ہے۔ ہیروڈوٹس سے لے کر انگریز مستشرقین نے ہندوستان کو ایک طلسماتی دنیا کے طور پر پیش کیا ہے مگر ہندوستان کی حقیقی تاریخ کسی نے بھی نہیں لکھی۔ ہندوستان کی معلوم تاریخ ویدوں کی تحریر کے بعد کے دور کی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے کے دور کے بارے مورخ خاموش ہیں یا وہ قیاسات پر اپنی تاریخ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ عین الحق فرید کوئی نے اس خاموش اور قیاسی تاریخ کا فائدہ اٹھایا ہے مگر وہ تادیر اپنے کمالات کا جادو نہ جگا سکے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے ویدک شبدوں سے اپنا جادو چمکایا ہے مگر ویدک شبد ایک گورکھ دھندہ ہیں۔ ڈاکٹر سہیل بخاری اس گورکھ دھندے کو کسی منطقی انجام تک نہ پہنچا سکے۔

بادشاہ منیر بخاری کا تسوید کردہ یہ مقالہ ایک لسانیاتی، تاریخی، تجزیاتی اور دستاویزی تحقیق پر مشتمل ہے۔ جس میں اردو زبان کی اساس کا متنازعہ مسئلہ بنیادی موضوع ہے۔ اس ضمن میں مروجہ لسانی طریقہ تحقیق کو اپنایا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق انہوں نے اس موضوع پر تحقیق سے پہلے اس حوالے سے موجود مواد کا مطالعہ کیا اور وہ تمام مآخذ تلاش کیے جو اس ضمن میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کی اور ثانوی مآخذ سے بھی استفادہ کیا۔ انہوں نے اس مقالے کو سات ابواب میں سائنسی اور توضیحی طریقہ کار کے مطابق تقسیم کیا ہے۔ ہر باب دوسرے باب سے منسلک اور بتدریج نظر آتا ہے۔ پہلا باب بنیادی طور پر اس مقالے کا تعارف، تحقیقی مقاصد، مسئلے کا بیان، بنیادی مفروضے، تحقیقی فرضیے، حدودکار اور جواز ابواب کے تحت مقالے کے حوالے سے بنیادی معلومات فراہم کرتا ہے۔ دوسرے باب میں موضوع کا پس منظری جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں زبان کی تعریف، بنیادی تصورات، گروہی تقسیم، اردو زبان کے بنیادی آریائی مآخذ کے بارے میں نظریات کا خلاصہ شامل ہے۔ اس باب سے وہ تمام نظریات جو آریائی ہیں سامنے آجاتے ہیں اور موضوع پر مزید تحقیق کے لیے سہولت اور موازنے کے لیے، مواد دستیاب ہو جاتا ہے۔ تیسرے باب میں مستشرقین کے لسانی نظریات اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اُردو پر ابتدائی کام کے حوالے سے بادشاہ منیر بخاری رقمطراز ہیں:

"اردو زبان پر ابتدائی کام مستشرقین نے کیا، بعد میں ان مستشرقین کے خیالات اور نظریات کو ہمارے مقامی علماء نے یا تو دہرایا ہے یا ان پر مزید تحقیق کی ہے۔ اردو زبان پر تین سو برس تک صرف مستشرقین ہی تحقیق کرتے رہے"۔(27)

چوتھے باب میں مقالہ نگار نے عین الحق فرید کوٹی کے لسانی تصورات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ عین الحق فرید کوٹی کا نام ماہرین لسانیات کے اس گروہ سے متعلق ہے جنہوں نے اپنے ذاتی مطالعے اور لسانی تجزیے کی بنا پر اردو زبان کے مآخذ پر اپنے نقطہ نظر سے ایک ایسا نظریہ پیش کیا جو ان کے پیشروؤں سے مختلف، دلچسپ اور نئے در وا کرنے والا ہے۔ عین الحق فرید کوٹی کا خیال ہے کہ اردو زبان کا مآخذ قدیم دراوڑی زبانیں ہیں۔ انہوں نے اپنے اس نظریے کی وضاحت اور دلائل اپنی دو کتابوں، اردو زبان کی قدیم تاریخ اور Pre-Aryan Origins of the Pakistani Languages کے علاوہ مختلف مضامین میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پانچویں باب میں ڈاکٹر سہیل بخاری کے لسانی تصورات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ شامل ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو زبان کو قدیم ویدک زبان سے مشتق قرار دیتے ہیں اور اردو زبان کو غیر آریائی یعنی دراوڑی زبان قرار دیتے ہیں۔ وہ اردو زبان کے بولوں کو قدیم تر زبانوں میں تلاش کی سعی کرتے ہیں اور اس تلاش و مماثلت سے اپنا نظریہ ترتیب دیتے ہیں۔ وہ مہاراشٹری پراکرت کو بنیاد بنا کر اردو کی تشکیل و تکمیل دکھاتے ہیں۔ ان کی کتابوں "اردو کی کہانی، اردو کا روپ" اور لسانی مقالات میں ان کے نظریے کی تکرار ملتی ہے۔ بادشاہ منیر نے چھٹے باب میں دیگر ماہرین لسانیات کے غیر آریائی لسانی تصورات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جن میں "خاطر غزنوی، ڈاکٹر اختر اورنیوی اور وزیر آغا" کے لسانی نظریات پر بحث شامل ہے۔ خاطر غزنوی اپنی کتاب "ہند کو اردو کا مآخذ" ڈاکٹر اختر اورنیوی "بہار میں اردو" اور ڈاکٹر وزیر آغا "اردو شاعری کا مزاج" میں اپنے لسانی نظریات پیش کرتے ہیں جن میں اردو زبان کو غیر آریائی قرار دیا گیا ہے اور اپنے نظریے کے لیے دلائل دیئے گئے ہیں۔ ساتویں باب میں اس مقالے کا حاصل تحقیق، خلاصہ تحقیق، نتائج اور فرضیہ اور فرضیوں کی توثیق اور مستقبل کے محققین کے لیے لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات میں انہوں نے وہ کتب و رسائل الف بائی ترتیب کے ساتھ پیش کیے جن سے اس مقالے میں مدد لی گئی۔

موضوع مقالہ: "پروفیسر فتح محمد ملک کی ادبی و لسانی خدمات کا تحقیقی جائزہ"

مقالہ نگار: عظمیٰ نور، 2018ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد وسیم انجم، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

پروفیسر فتح محمد ملک کو بطور اقبال شناس دیکھا جائے تو ان کی تصانیف "فکر اقبال، اقبال فراموشی اور اقبال کے سیاسی افکار" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اقبال کی طرح فن کی آفاقیت کے قائل ہیں، نہ وہ خود کسی مخصوص سوچ کے حامی ہیں اور نہ خود کو کسی ایک تصور یا سوچ تک محدود کرتے ہیں۔ ان کی سوچ تہذیب، ثقافت، مذہب اور تاریخ کے تناظر میں پنپتی ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کی حقیقت نگاری ایک مخصوص دائرے میں قید نہیں بلکہ وہ فن کی بلندیوں کو چھوتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی سوچ و فکر حدود سے بالاتر ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اقبال کے انقلابی پیغام کی عصری معنویت کو اپنی تصانیف میں اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو کھل کر بیان کیا کہ آج ہم فکرِ اقبال سے شعوری انحراف کی راہ پر چل رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد حالات کا جائزہ لیا جائے تو ہم عرب ملوکیت کی چھاپ سے اسلام کو پاک کرنے کے بجائے اس چھاپ کو اور زیادہ گہرا کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ابھی تک حقیقی اسلام کی بازیافت نہیں کر سکے اور نہ ہی اسلام کے قانون تعلیم اور کلچر کو تحریک دے کر اسلام کی حقیقی روح کو روح عصر سے ہم آہنگ کر سکے۔ اس غفلت کی بدولت آج ہمارا ملک فرقہ وارایت میں گرفتار ہے۔ اس صورتِ حال کو مد نظر رکھ کر پروفیسر فتح محمد ملک اپنی تحریروں کے ذریعے اسلام کی سادگی و پاکیزگی کی جانب متوجہ کرتے ہیں اور اپنے وقت کو اسلام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک کی تصانیف کے مطالعہ کے بعد کسی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں رہتی وہ قاری کے خیالات کو اس سطح تک لے کر جاتے ہیں جہاں تک انسانی ذہن کی رسائی ممکن ہو۔

مقالہ نگار عظمیٰ نور نے اپنے مقالے "پروفیسر فتح محمد ملک کی ادبی و لسانی خدمات کا تحقیقی جائزہ" کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول" پر وفیسر فتح محمد ملک: سوانح، شخصیت اور خدمات" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں "پیدائش، قبیلہ اعوان سے تعلق، قبیلہ اعوان کی تاریخ، دادا کا تعارف، والد کا تعارف، دادا اور والد میں اختلاف، بچوں کی تربیت کا انداز، نانا کا تعارف، والدہ کا تعارف، بہن بھائیوں کی تعداد، ابتدائی تعلیم، کالج میں تعلیم، پنجاب یونیورسٹی سے گولڈ میڈل،، رفیق حیات کا انتخاب، پی ایچ ڈی نہ کرنے کی وجہ، فیڈرل اردو یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا آغاز،، ادبی رسائل میں شائع مضامین، تصانیف میں شامل مضامین، اقبال پر مبنی مضامین، تالیفات، تصانیف، اقبال پر لکھے گئے مضامین جو کتابوں میں شامل ہیں، مضامین جو دوسروں کی مرتب کردہ کتابوں میں شائع ہوئے، پروفیسر فتح محمد ملک پر لکھے گئے مضامین، تنقید نگاری کی ابتداء، تحریر کا باقاعدہ آغاز، پروفیسر فتح محمد ملک کی ادارتی خدمات، پروفیسر فتح محمد ملک کی تصانیفی خدمات،

منتخب افسانے، فلسطین: اردو ادب میں، اقبال اور افغانستان، احمد ندیم قاسمی: شاعر وافسانہ نگار، فیض: شاعری اور سیاست، تحریک آزادی کشمیر: اردو ادب کے آئینے میں، اقبال فراموشی، غلاموں کی غلامی، اقبال کا فکری نظام اور پاکستان کا تصور، سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر، ن م راشد: سیاست وشاعری، احمد فراز کی شاعری: نغمہ دلدار یا شعلہ بیدار؟، اقبال کے سیاسی تصورات، شخصیت اور فن پر یونیورسٹیوں میں کام" کے عنوانات شامل ہیں۔

باب دوم "فتح محمد ملک: تنقیدی خدمات" کے زیر عنوان ہے۔اس باب کے ذیلی عنوانات میں "ادبی تنقید کے موضوعات پر مبنی کتب، مرتب شدہ کتب، رسائل میں شائع ہونے والے ادبی مضامین، تحسین و تردید میں شامل ادبا، اپنی آگ میں شامل ادبا، سعادت حسن منٹو: ایک نئی تعبیر، منتخب افسانے، شاعری پر تنقید" وغیرہ شامل ہیں۔ باب سوم "پروفیسر فتح محمد ملک: لسانی خدمات" کے عنوان سے ہے۔ اس میں جن موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مباحث شامل ہیں اُن میں "پاکستان میں اُردو: سندھ، پاکستان میں اُردو: بلوچستان، پاکستان میں اُردو: اباسین، پاکستان میں اُردو: پنجاب، پاکستان میں اُردو: کشمیر" شامل ہیں۔ باب چہارم میں "پروفیسر فتح محمد ملک: اقبالیات تحقیق" کے عنوان سے اُن کی اقبالیات میں پیش کی گئی خدامات کا جامع جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں پروفیسر فتح محمد ملک کی ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کے بعد "ماحصل" میں سابقہ ابواب کا مجموعی جائزہ شامل کیا گیا ہے۔

موضوعِ مقالہ: "اُردو میں لسانی تحقیق"

مقالہ نگار: فائزہ بٹ، 2016ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر ناصر عباس نیئر، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

زیرِ تجزیہ مقالہ پانچ ابواب اور ایک محاکے پر مشتمل ہے۔ باب اوّل "لسان اور لسانیات" کے عنوان سے ہے۔ یہ باب تعارفی نوعیت کا ہے جو مزید دو فصلوں میں منقسم ہے۔ فصل اول میں زبان کے آغاز وارتقا، زبان میں ہونے والے تغیرات اور اُن کی نوعیت اور اسباب، بولی اور زبان کا باہمی تعلق اور امتیاز، معیاری بولی کی وضاحت اور اسی نوع کے عام لسانی مباحث شامل ہیں۔ فصل کلام میں زبان کے سائنسی مطالعے، لسانیات کا تعارف و وضاحت اور دیگر شعبہ ہائے علوم اور لسانیات کے تعلق سے وجود پانے والے نئے علوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ باب دوم کا عنوان "دنیا کی زبانیں" ہے۔ فصل اول کے تحت دنیا کی زبانوں کی خاندانی درجہ بندی کے مباحث زیر بحث لائے گئے ہیں، اور فصل دوم ہند آریائی زبانوں کے تفصیلی جائزے پر مشتمل ہے۔ باب سوم

میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے مستشرقین اور ہند شناسوں کی لسانی تحقیقات قلم بند کی گئی ہیں۔ اردو میں مستشرقین کی لسانی تحقیقات کے عنوان سے یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے، جن میں مستشرقین کی برصغیر آمد کے بعد ۱۹۴۷ء تک عہد بہ عہد اردو زبان کا ارتقا، مستشرق قواعد نگاروں اور لغت نویسوں کی تالیفات کا تعارف اور مستشرق ماہرین لسانیات کی دیگر لسانی و لسانیاتی تحقیقات کے جائزے کے بعد ان کی قدر اور حقیقی معیار کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم "اردو لسانیات: اردو کی آفرینش اور نشو و نما" کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ اس باب کے تحت اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کے مباحث کو شامل کیا گیا ہے۔ زبان چونکہ ٹھوس شے نہیں کہ جس کی پیدائش کے حوالے سے کسی خاص نقطۂ زمان و مکاں کا تعین کیا جا سکے، لہٰذا اس حوالے سے کوئی بھی حتمی رائے قائم کیے بغیر ماہرین کے اختلافی بیانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب پنجم میں اردو زبان کے مقامی قواعد نگاروں اور لغت نویسوں کی تحقیقات و تالیفات پر مباحث قلم بند کیے گئے ہیں۔ "اردو لسانیات: قواعد و لغت کے مباحث" کے عنوان سے یہ باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ مقالے کے آخر میں محاکمہ ہے جس کے تحت تمام مباحث کا اجمال مع تنقیدی تبصرے کے پیش کر دیا گیا ہے، جس سے اردو لسانیات میں اب تک کی جانے والی تحقیقات کی واضح تصویر سامنے آتی ہے۔ اس سے اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اردو لسانیات پر اب تک کیا کچھ تحقیقات ہوئیں؟ اور کون کون سے پہلو اب بھی تشنہ تحقیق ہیں؟۔ مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے اس مقالے کے تحت اردو میں تا حال ہونے والی لسانی تحقیق کا احاطہ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

"اُردو میں لسانی تحقیق" میں فائزہ بٹ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے ضروری ہے کہ اردو کی ادبی اور لسانی حیثیت کو علیحدہ علیحدہ شعبوں کے تحت تسلیم کرتے ہوئے ان کی ترقی اور ترویج کے حوالے سے منصوبہ بندی کی جائے اور ضروری اقدامات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ لسانی ترقی کے اداروں اور ادبی ترقی کے اداروں میں حد فاصل کھینچنا، اردو کی بحیثیت مجموعی بین الاقوامی ترقی کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ اُن کے مطابق اکیسویں صدی عیسوی کو بجا طور پر اطلاعاتی ٹیکنالوجی (Information Technology) یا اطلاعیات (Informatics) کی صدی کہا جا سکتا ہے۔ کمپیوٹر کے لائے ہوئے انقلاب نے قریباً ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ زبانوں پر بھی اس نے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں اردو زبان نے اگرچہ انیسویں صدی کے آخری عشرے میں قدم رکھا البتہ اس کی ترقی اور پیش

رفت کی باقاعدہ بنیاد بیسویں صدی کی آخر میں رکھی گئی۔ تاہم ۱۹۸۰ء کے عشرے میں جمیل احمد مرزا اور مطلوب الحسن سید کے تیار کردہ نوری نستعلیق کے پروگرام نے اردو طباعت اور اشاعت میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور اخبارات میں کتابت کمپیوٹر پر ہونے لگی ہے۔ مشینی کتابت در حقیقت تکنیکی میدان میں اردو کی بہت بڑی کامیابی ہے، جس نے اسے تکنیکی دنیا میں بقا اور ثابت قدمی کی ضمانت فراہم کی ہے۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کو جدید ٹیکنالوجی سے متعارف کرانے والے ماہرین کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ نہ صرف زبان اور لسانیات کے جدید مباحث سے آگاہ ہیں بلکہ مابعد چومسکی لسانیات (Post-Chomskyan Linguistic) کی مبادیات سے بھی واقف ہیں۔ علاوہ ازیں ادراہ فروغ قومی زبان (مقتدرہ قومی زبان) نے بھی مائکروسوفٹ کے تعاون سے اردو زبان کو جدید لسانیاتی سائنسی و تکنیکی دور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کچھ اہم تکنیکی امور کو اردو میں متعارف کرانے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم پیش رفت اردو انگریزی مشینی ترجمے کی سہولت کی فراہمی کو ممکن بنانے کی کاوش ہے۔ دوسری کوشش 'Optical Character Recognition' ہے، جس کی مدد سے ہاتھ سے لکھی عبارت کو کمپیوٹر کی کمپوز کی ہوئی عبارت میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ تیسرا اہم کام اردو الفاظ و تراکیب کے استعمال کی ان گنت مثالوں کو کمپیوٹر میں محفوظ کر کے اسے عام استفادے کے لیے آن لائن کرنے کا منصوبہ ہے۔ گویا یہ اردو کا کارپس 'Corpus' ہے۔ اس کارپس کو پہلے 'Urdu Data Bank' کا نام دیا گیا اور پھر اس کا متبادل اردو نام "اردو مثال گھر" رکھا گیا۔ ان حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان سائنس اور ٹکنالوجی کے اس انقلاب کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہے، کیوں کہ یہی رویہ نہ صرف اکیسویں صدی بلکہ آنے والی صدیوں میں بھی اردو زبان کی بقا کا ضامن ہے۔

اس مقالے کے تجزیات مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں لسانی اور لسانیاتی تحقیق کا جو کام تین چار صدیوں پہلے شروع ہوا، وہ انیسویں صدی میں کسی قدر باقاعدگی کی طرف گامزن ہے اور بیسویں صدی میں ترقی یافتہ ممالک کے لسانی علم سے استفادے کا رجحان عام ہونے لگا۔ متعدد محققین نے لسانیات کے بہت سے پہلوؤں، تحقیق کا آغاز سائنسی انداز میں کیا۔ اب گزشتہ چند برسوں میں اردو کے محققین لسانیات نے لسانی تحقیق میں جدید ٹیکنالوجی سے مدد لینا شروع کی ہے۔ یہ احساس بھی عام ہونے لگا ہے کہ جامعات کو لسانیات کے الگ شعبے قائم کرنا چاہئیں۔ اس سلسلے میں کچھ پیش رفت دیکھنے میں بھی آئی ہے۔ توقع کی جانا چاہیے کہ مستقبل قریب میں ہمارے ہاں بھی لسانیات میں معیاری تحقیقی کام سائنسی بنیادوں پر کیا جانے لگے گا۔

موضوع مقالہ: "اُردو میں جدید لسانیات کے مباحث"

مقالہ نگار: احسان قادر صدیق ،2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر قاضی عبد الرحمان عابد، بہاؤلدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان

مقالہ نگار احسان قادر صدیق نے اس تحقیقی مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول "لسانی مطالعہ کی قدیم روایات" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں لسانیات کی مذہبی روایات اور فلسفیانہ روایات پر تحقیق کو شامل کیا گیا ہے۔ لسانیات کی قدیم روایات پر روشنی ڈالتے ہوئے مختلف ماہرین کی آرا کی روشنی میں درست حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زمانہ قدیم کی تاریخ اور لسانیات میں پس منظر کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم کا عنوان" جدید لسانیات: ایک تعارف " ہے۔ اس باب میں جدید لسانیات کے تعارف کو شامل کیا گیا ہے۔ مغربی ماہرین لسانیات کے زبان کی ماہیت کے مباحث کو اس باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ لسانیات کی مختلف شاخیں جن میں صوتیات علم الاصوات، صرف نحو، اور معنیات کے حوالے سے بحث کو شامل کی گیا ہے۔ سیاق وسباق کی لسانیات کے عمل میں اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تنقیدی اور منطقی لسانی تبدیلیاں اور ان کی پس منظر میں اہمیت کے بارے میں مباحث کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ لسانیات کی شاخوں کے حوالے سے مباحث میں اردو کے صوتیاتی نظام کے مطالعہ کو شامل کیا گیا ہے۔ صرف کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایسے اصول وضوابط کے تحقیقی مطالعہ کو شامل کیا گیا ہے جو علم صرف کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ مرکب الفاظ کی بناوٹ اور ساخت کے حوالے سے مباحث میں الفاظ کے مطالعے کو باریک بینی سے دیکھا گیا ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ عام لسانیات اور جدید لسانیات کے مباحث کا واضح تعارف پیش کیا جاسکے۔

"اُردو میں جدید لسانیات کے مباحث" کے باب سوم کا عنوان" اردو میں علم الاصوات کا تعارف " ہے۔ باب سوم میں اردو میں صوتیات اور علم الاصوات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جن میں انہوں نے فونیمیات کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کو شامل کیا ہے۔ اس کے علاوہ صوتیات اور اردو رسم الخط کے بارے میں قائم قابل تردید مفروضوں کو تحقیق کی روشنی میں رد کرنے کی تجویز بھی دی ہے۔ اردو رسم الخط کے مسائل کو موضوع بناتے ہوئے ان مسائل کا حل بھی تجویز کیا ہے۔ اردو رسم الخط کی اصلاح کے لیے دی جانے والی تجاویز کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس باب میں اردو صرف ونحو کا تعارف بھی شامل ہے اور مارفیم اور ذیلی مارفیم کو بھی تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔" اردو میں معنیات کے مباحث اور اُن کا اطلاق" اس مقالے کا

چوتھا باب ہے۔ اس میں اردو میں معنیات کے مباحث کے حوالے سے تحقیقی مواد موجود ہے۔ اردو ماہرین لسانیات نے معنیات کو کس طرح اپنایا؟ اور ان کے نقطہ نظر کا مغرب کے ماہرین لسانیات کے ساتھ موازنہ اس باب کے اہم موضوعات ہیں۔ معانی کی افادیت، معنوی تبدیلی اور ثقافتی تغیرات، معانی کا درست اظہار، واضح اور مضمراتی اسلوب میں فرق، ماحولیاتی تناظر میں معنی کی شناخت، معنویاتی اسلوب، گفتگو کے تغیراتی پہلو، معنی میں تبدیلی کی وجوہات، تنقیدی تغیر، لسانیات کی شناخت اور سماجی تناظر کے موضوعات پر تحقیق کو اس باب میں سمویا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متن کی ساخت اور پیچیدگی کے موضوع پر مغرب میں ہونے والی تحقیقات کو بھی شامل کیا ہے جن میں منطقی تغیرات، طبقاتی تفرقات اور معنی میں اختلاف، معاشرہ اور گفتگو کے معیارات، الفاظ کی اہمیت، زبان اور انسان کی فطرت کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔

باب پنجم کا عنوان "اردو میں جدید لسانیات کے مباحث" ہے۔ اس میں جدید لسانیات کے مباحث کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس حوالے سے مغرب میں ہونے والی تحقیقات کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔ بیسویں صدی کے لسانی مراحل و مباحث، ساختیات اور لسانیات کے مباحث، سوسیور کے لسانی ماڈل، جمالیات اور لسانیات کے موضوع پر مباحث کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔" تخلیق کار کی اہمیت، متن کی اہمیت، ساختی تنقید اور لسانی شعور، قاری کی اہمیت، تشریح کے مباحث، لسانیات اور ساخت شکنی کے مباحث " کے علاوہ اردو زبان اور مغربی رجحانات کے حوالے سے تحقیق کو اس باب میں شامل رکھا گیا ہے۔ متن کی ساخت کی اہمیت، امتزاجی تنقید، زبان اور تخیلات، کے ساتھ لسانیات اور ذہنی اتصال، انسانی علم اور لسانیاتی مباحث، زبان کے ناقابل استعمال حصے، لسانی وجدان اور ناؤم چومسکی کے نظریاتی مباحث کو اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ ژاک لاکاں سگمنڈ فرائڈ، اور دیگر ماہرین لسانیات کے لسانی نظریات پر تحقیق کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اردو میں جدیدیت، جدیدیت اور مشرقی شعریات، لسانیات کے عمومی مغربی رجحانات، مغرب کے جدید لسانی مباحث اور ان کے اردو پر اثرات کے بارے میں تحقیق اس باب کا اہم حصہ ہے۔ نیز اس باب میں ساختیاتی لسانیات کی اہم خصوصیات، رومن جیکب سن کا ترسیلی ماڈل، شعریات اور نئی تنقیدی تھیوری، ساختیاتی لسانیات کی اہم خصوصیات متن اور نو آبادیات، یورپ میں ساختیاتی لسانیات کے معروف دبستان، امریک اور لسانیات مباحث، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے لسانی نظریات کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو میں فرہنگ نویسی کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: گل باز، 2015ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر غلام عباس گوندل، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

اردو میں فرہنگ نویسی کا آغاز غیر ادبی فرہنگوں سے ہوا جب انگریز مستشرقین آئے تو انھوں نے اپنی ضرورت کے تحت مختلف علوم و فنون کی فرہنگیں مرتب کروائیں یہ تمام غیر ادبی اور لسانی فرہنگیں تھیں۔ ۱۸۱۱ء میں تھامس روئبک کی مرتب ہونے والی "جہاز رانی کی فرہنگ" پہلی غیر ادبی دستیاب فرہنگ ہے۔ اردو کی پہلی دستیاب ادبی فرہنگ "وثوق صراحت" ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی یہ فرہنگ غالب کے کلام پر مشتمل ہے۔ اردو فرہنگ نویسی کی دو سو سالہ روایت کے باوجود فرہنگ نویسی پر تحقیقی و تنقیدی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ مقالہ نگار گل باز کے مطابق انہوں نے اس مقالہ میں کوشش کی ہے کہ ادبی فرہنگ نویسی کے اصول و ضوابط متعین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی مکمل روایت کو بھی سامنے لایا جائے۔ اگرچہ اردو میں ادبی متون کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فرہنگوں کی تعداد 100 کے قریب ہے لیکن یہ کام آج تک یک جا نہیں ہو سکا اور نہ ہی اس کے طریقہ کار کا تعین کیا جا سکا ہے۔

مقالہ نگار کے مطابق اردو میں صرف تین مضمون ایسے ہیں جن میں ادبی فرہنگ نویسی کے اصول وضوابط کے بارے میں بات کی گئی ہے، جن میں ایک مضمون ڈاکٹر عبد الرشید کا ہے جو ڈاکٹر رؤف پاریکھ کی کتاب "اردو لغات اصول اور تنقید" میں "متن اساس فرہنگیں: مسائل اور صورت حال" کے عنوان سے شائع ہوا جب کہ دوسرا مضمون ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کا ہے جو جامعہ پنجاب کے تحقیقی مجلہ "اورینٹل کالج میگزین" میں شائع ہوا۔ جب کہ ایک اور مضمون ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کا ہے جو ان کے مقالے "اردو مثنوی کی فرہنگ" کا مقدمہ تھا جو بعد میں انڈیا میں بھی الگ رسالے میں شائع ہوا اور ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اس کو بھی اپنی کتاب "لغت نویسی اور لغات: روایت اور تجزیہ" میں "اردو فرہنگ نویسی کا تحقیقی جائزہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ مقالہ نگار گل باز کے مطابق ان کے علاوہ ادبی فرہنگ نویسی کے مباحث پر کوئی تحریر نہیں ملتی، البتہ غیر ادبی فرہنگوں پر ڈاکٹر عطش درانی کا مقالہ "اردو اصطلاحات سازی" میں غیر ادبی فرہنگیں شامل ہو گئی ہیں۔

"اُردو میں فرہنگ نویسی کی روایت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" میں گل باز نے ادبی فرہنگوں کے جامع جائزے کے ساتھ غیر ادبی فرہنگوں پر بھی باب شامل کیا ہے۔ اُن کا یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ مقالے کا پہلا باب ادبی فرہنگ نویسی کے بنیادی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس باب میں فرہنگ نویسی کے لغوی معنی، اصطلاحی معنی، لغت اور فرہنگ میں فرق، لغت اور فرہنگ کا باہمی تعلق، فرہنگ کی ضرورت و اہمیت، فرہنگ

نویسی کی اقسام، فرہنگ میں تعین الفاظ کا مسئلہ، معانی کی تحقیق و جستجو کا مسئلہ، الفاظ و معنی کے اندراج کے طریقہ کار پر بات کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ادبی فرہنگ نویسی کی روایت کو شامل کیا گیا ہے۔ اس بات میں آغاز تا حال ادبی فرہنگ نویسی کی روایت کا جائزہ لیا گیا ہے اور مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ کوئی ادبی فرہنگ اس باب میں شامل ہونے سے رہ نہ جائے۔ اس باب میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں قسم کی فرہنگیں شامل ہیں۔ انہوں نے فرہنگوں کا مختصر تعارف کروایا ہے جس میں فرہنگ کے مصنف کا نام، صفحات، ابواب، طریقہ اندراج اور اہم خصوصیات کا مختصر تعارف شامل ہے۔ اس مطالعہ سے جہاں ادبی فرہنگ نویسی کی روایت کا پتہ چلتا ہے وہیں ایک موضوع پر ایک سے زیادہ بار مرتب ہونے والی فرہنگیں بھی سامنے آتی ہیں۔ اس طرح مختلف جامعات میں ادبی فرہنگ نویسی کی جو روایت موجود ہے اس باب میں اس کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں تمام ایم اے، ایم فل اور پی ایچ۔ڈی کے مقالہ جات شامل ہیں۔

باب سوم غیر ادبی فرہنگوں پر مشتمل ہے جس میں مستشرقین کی ابتدائی کوششوں کے علاوہ مقامی حضرات کی محاورات اور اصطلاحات کی ابتدائی فرہنگیں شامل ہیں۔ مستشرقین نے ابتدا میں اپنی ضروریات کے تحت مختلف علوم و فنون کی فرہنگیں مرتب کیں، اس باب میں مستشرقین کی صرف جہاز رانی سے متعلق اصطلاحات کی ابتدائی فرہنگوں کو شامل کیا گیا ہے کیوں کہ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے ان اصطلاحات پر پہلے کام ہو چکا ہے اور اس باب میں ان کو ضمنی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ظفر الرحمٰن دہلوی کی" اصطلاحات پیشہ وراں" کے علاوہ "مخزن المحاورات" اور اس طرح محاورات کی چند ابتدائی کتابوں کو شامل کیا گیا ہے، کیوں کہ محاورات کی ان تمام فرہنگوں کا ذکر ڈاکٹر انور علی اپنے مقالہ "اردو لغت کا ارتقا" میں کر چکے ہیں۔ جو انھوں نے سندھ یونی ورسٹی جام شورو سے مکمل کیا ہے۔ مذکوہ مقالے کا باب چہارم اہم مطبوعہ ادبی فرہنگوں کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔ ان فرہنگوں کے مطالعہ میں مقالہ نگار گل باز نے یہ طریقہ کار اختیار کیا ہے کہ مقالہ کے پہلے باب میں فرنگ نویسی کے وضع کردہ اصول و ضوابط کے ساتھ ساتھ ان فرہنگوں کے مقدمات میں ان کے مصنفین نے فرہنگ نویسی کے جو اصول وضع کئے ہیں ان کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔ اس باب میں شامل فرہنگوں میں کچھ فرہنگوں کے مقدمے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس باب میں شامل تمام فرہنگوں کے مقدموں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ تمام فرہنگوں میں شامل مفرد الفاظ، مرکبات، تراکیب، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات وغیرہ کے اندراج اور معانی کے تعین کے طریقہ کار کا جائزہ بھی اس باب میں لیا گیا ہے۔

باب پنجم میں اہم غیر مطبوعہ ادبی فرہنگوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں مختلف جامعات میں مرتب ہونے والی اہم فرہنگوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان فرہنگوں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جامعات میں کچھ اساتذہ نے اپنی ذاتی دلچسپی سے فرہنگیں مرتب کروائی ہیں۔ اس باب میں بھی فرہنگوں کے مقدمہ کے علاوہ ان کے متون کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور فرہنگ نویسی کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی خصوصیات کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری باب "ماحصل" کے عنوان سے ہے جس میں نتائج کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس باب میں فرہنگوں کے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ سے حاصل ہونے والے نتائج میں حاصل شدہ ثمرات کے علاوہ اردو میں فرہنگ نویسی کے حوالے سے چند نئے تحقیق طلب پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ مقالہ اپنے موضوع کے حوالے سے جس قدر تحقیقی اور معلوماتی ہے اتنا ہی تحقیق کے نئے در وا کرنے میں معاون بھی ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو عروض: ارتقائی مطالعہ"

مقالہ نگار: محمد زبیر خالد، 2013ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر روبینہ ترین، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

محمد زبیر خالد کا تحریر کردہ مقالہ بحوالہ عنوان بالا پانچ ابواب پر محیط ہے۔ اس مقالے کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے کہ پہلے باب میں انہوں نے عروض کے بنیادی نظری مباحث پر بات کی ہے۔ کلام موزوں اور شاعری کا تعلق، وزن کی ماہیت، آہنگ کے عمومی اور عروضی تصورات، وزن کی اقسام، عروض کے حدود، اس کی ادبی افادیت جیسے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں عربی، فارسی اور اردو عروض کے خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ تاکہ اعلیٰ سطح کے مباحث کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عملاً مستقل بحروں کے اعتبار سے عربی عروض کا فارسی اور اردو سے کیا تعلق ہے۔ اُن کے مطابق یہ غلط فہمی مدت سے رائج ہے کہ عربی عروض ہی اردو اور فارسی کا مصدر اور ماخذ ہے۔ وہ اپنی تحقیق سے یہ حقیقت سامنے لاتے ہیں کہ فارسی میں رائج بحور عربی بحور سے یکسر مختلف ہیں۔ فارسی کی تمام مقبول بحور اردو شاعری میں بھی رائج ہیں۔ اردو عروض صرف فارسی بحور تک محدود نہیں بلکہ اس میں ہندی نژاد بحور بھی شامل ہیں۔ یہ پوری طرح پنگل کے بھی تابع نہیں۔

مقالے کے تیسرے باب میں متداول عروض کے مسائل کی تفصیلاً اور نکتہ وار نشان دہی کی گئی ہے، جس سے اردو عروض کی تشکیل جدید کی ضرورت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ چوتھا باب اردو عروض کے

ارتقاء کے جائزے پر محیط ہے۔ ابتدا میں اردو عروض کا فارسی پس منظر پیش کیا گیا ہے اور پھر فارسی عروض کی بنیاد پر اردو عروض پر تحریری سرمائے کا اجمالی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اردو عروض پر اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر میں ہونے والے انگریزی کام سے مقبول ہند کتاب "ترجمہ حدائق البلاغت" کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس سے مقالہ نگار کے مطابق یہ ناخوش گوار حیرت افزا نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس کتاب کا عروض کا حصّہ ویسا ہی ناقص، غیر مستند سرسری اور اغلاط و تسامحات سے پر ہے جیسے اکثر اردو عروض پر کتابیں اب تک لکھی جارہی ہیں۔ اس مقالے میں انہوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں لکھی گئی سو سے زیادہ کتابوں کے اجمالی جائزے کے بعد گیارہ ایسی کاوشوں کا تفصیلی تکنیکی مطالعہ کیا ہے، جن میں اردو عروض کے لیے نئے نظام وضع کرنے کی کاوشیں کی گئی تھیں۔

پانچویں اور آخری باب میں اخذہ نتائج کے طور پر اردو عروض کی دو مراحل میں تدوین نو کی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ پہلے مرحلے میں متداول عروض کی تنقیح اس طرح کی گئی ہے کہ کم سے کم انحراف کرتے ہوئے پیچیدگیوں کو بھی کم سے کم کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ اردو بحور کا احاطہ کیا جائے۔ دوسرے مرحلے میں روایتی طرز کے عروضی ارکان کے ذریعے ایک نہایت مختصر اور پوری طرح کارآمد نظام عروض مدون کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ گیان چند، جین، ادبی اصناف، گجرات اُردو اکادمی، گجرات، 1989ء، ص:128

2۔ آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، مبارک بک ڈپو، کراچی، 1955ء، ص:150

3۔ گیان چند، جین، تحریریں، ادارہ فروغِ اُردو، لکھنؤ، 1964ء، ص:280

4۔ محمد نعیم، اُردو افسانے میں مغربی تہذیب کے عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2017ء، ص:11

5۔ عدنان احمد،اُردو ناول پر ادبی تحریکوں کے اثرات:تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،فیصل آباد،2016ء، ص:1

6۔ جویریہ انور،اُنیسویں صدی میں اُردو ناول میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور، ص:8

7۔ ریاض حسین،اُردو ناول میں تہذیبوں کے درمیان مکالمہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،اسلامیہ یونیورسٹی،بہاولپور،2016ء،ص:1

8۔ محمد کامران شہزاد،پاکستانی اُردو ناول میں مزاحمتی رجحانات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،فیصل آباد،2019ء،ص:3

9۔ شگفتہ پروین،پاکستانی اُردو ناول میں مظلوم طبقوں کی عکاسی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جی سی یونیورسٹی،لاہور،2017ء،ص:14

10۔ قراۃ العین حیدر،کارجہاں دراز ہے،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی،2003ء،ص:13

11۔ القرآن،پارہ:21،سورۃ:السجدہ، آیت نمبر:7،تاج کمپنی لمٹڈ،لاہور،2005ء

12۔ شیبا عالم،اُردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جی سی یونیورسٹی،لاہور، 2012ء،ص:323

13۔ محمد ثقلین،اُردو ناول میں سیاسی مباحث، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جی سی یونیورسٹی،لاہور2012ء،ص:13

14۔ سفیر حیدر،پاکستانی اُردو ناول میں تصور انسان، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جی سی یونیورسٹی،لاہور،2013ء،ص:202

15۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،انشائیہ کے خدوخال،مکتبہ جامعہ،دہلی،2012ء،ص:19

16۔ مرزا فرحت اللہ بیگ،ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی:کچھ میری کچھ اُن کی زبانی،مرتب:رشید حسن خان،انجمن ترقی اُردو،دہلی،1992ء،ص:7

17۔ عثمان شاہ،ڈاکٹر گیان چند جین:احوال و آثار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،قرطبہ یونیورسٹی،پشاور،2011ء،ص:6

18۔ شاہانہ خانم،تابش دہلوی:احوال و آثار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جامعہ کراچی، کراچی،2018ء،ص:4

19۔ سائرہ بتول، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ:1960ء تا حال، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، نمل، اسلام آباد،2012ء،ص:388

20۔ زاہد حسن چغتائی، عزیز ملک: شخصیت اور علمی و ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جامعہ کراچی، کراچی،2018ء،ص:4

21۔ رابعہ عرفان،رحمان مذنب:احوال و آثار(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،اورینٹل کالج،پنجاب یونیورسٹی،لاہور،2012ء،ص:2

22۔ حبیب الرحمان، انیس ناگی کی تخلیقی و تنقیدی نثر کا مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی،لاہور،2012ء،ص:370

23۔ عبدالسعید، برطانوی ہندوستان میں اُردو کے مغربی شعرا، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،جی سی یونیورسٹی،لاہور،2016ء،ص:10

24۔ نصرت جبین،جدید اُردو نظم میں انسان دوستی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،وفاقی اُردو یونیورسٹی،اسلام آباد،2017ء،ص:546

25۔ محمد یٰسین آفاقی،جدید اُردو نظم میں ہیئت کے تجربے، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،پنجاب یونیورسٹی،لاہور،2012ء،ص:7

26۔ ساجد صدیق نظامی، اسالیبِ اُردو نثر کے تحولات: آغاز سے وفات غالب تک، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)،اورینٹل کالج،پنجاب یونیورسٹی،لاہور،2016ء،ص:12

27۔ بادشاہ منیر بخاری، اُردو زبان کے غیر آریائی نظریات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور،2012ء،ص:7

باب چہارم:

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات کا تجزیہ

(تحقیقی طریقہ کار کے تناظر میں)

دنیا میں جب علوم کا دائرہ کار وسیع ہوا اور نئے نئے علوم متعارف ہوتے گئے تو تحقیق کی مختلف اقسام بھی وجود میں آنے لگیں۔ چنانچہ اب تحقیق کی بے شمار اقسام ہیں جن کو ماہرین فن نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر سے اور مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض ماہرین نے تحقیق کے مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے جبکہ بعض نے تحقیق کے طریق کار کو۔ بعض نے حسب نوعیت اس کی تقسیم کی ہے جبکہ کچھ نے موضوعات کو

اس مقصد کے لیے پیمانہ بنایا ہے۔ غرض تحقیق کی قسموں سے متعلق ماہرین فن کا نقطہ نظر یکساں نہیں۔ زیر تحقیق باب میں چونکہ پاکستانی جامعات میں "تحقیقی طریقہ کار کے تناظر میں" کی جانے والی تحقیق زیر بحث ہے۔اس لیے تحقیقی طریقہ کار کی چند اقسام کا تعارف بھی شامل کیا جاتا ہے تاکہ موضوع کو سمجھنے میں سہولت رہے۔

تحقیق کی پہلی تقسیم مقاصد کے حوالے سے متعین کی گئی ہے۔اس سلسلے میں سلطانہ بخش نے تین اقسام کی نشاندہی کی ہے جن میں "بنیادی تحقیق، اطلاقی تحقیق اور اقدامی تحقیق" شامل ہیں(1)۔بنیادی تحقیق میں صرف نظری مباحث شامل ہیں۔ عمومی اصول وضع کرنا، تعبیر نو کرنا یا نظریے وضع کرنا اس تحقیق کا بڑا مقصد ہوتا ہے۔ اس کو فلسفیانہ تحقیق بھی کہتے ہیں۔ اس میں عموماً محرکات کو جاننا اور صداقت کو پرکھنا شامل ہوتا ہے۔اطلاقی تحقیق میں کسی مسئلے یا شے کے حصول کے طریقے کی افادیت معلوم کی جاتی ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی سے لے کر سماجی صورت حال و ضروریات میں اس قسم کی تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔اس میں تجزیاتی طریق کار بھی شامل ہے۔"اقدامی طریقہ تحقیق" فوری اور محدود نوعیت کے مسائل میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں مسئلے کے حل اور تدارک کے اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی تحقیق سے نظریے یا اصول وضع نہیں ہوتے اس لیے عام طور پر اسے تحقیق شمار نہیں کیا جاتا۔

نوعیت کے لحاظ سے تحقیق کی دو اقسام ہیں جن میں "مقداری تحقیق اور معیاری تحقیق" شامل ہیں۔اول الذکر تحقیق سے مراد ایسی تحقیق ہے جس میں حقائق کو ناپا، تولا یا گنا جا سکے جیسے کسی زبان کے اعداد و شمار، کسی شخصیت کے کوائف یا فن پارے میں استعمال ہونے والے مخصوص الفاظ، محاورات، اصطلاحات یا دیگر مطالعہ جاتی کوائف وغیرہ جمع کیے جاتے ہیں۔ جبکہ ثانی الذکر میں عام طور پر تاریخی، دستاویزی امور زیر بحث لائے جاتے ہیں جنھیں نقد و نظر کے اصولوں پر پرکھا جاتا ہے(2)۔موضوع کے حوالے سے تحقیق کی پانچ اقسام شمار کی گئی ہیں، علمی تحقیق، سائنسی تحقیق، سماجی تحقیق، فنیاتی تحقیق اور تعلیمی تحقیق۔ علمی تحقیق سے مراد ایسے موضوعات پر تحقیق کرنا ہے جن سے طلبہ اور اساتذہ اپنے نظری مطالعے کے حوالے سے علمی وسعت پیدا کر سکیں۔ اس کو سندی تحقیق یا تفویض کار بھی کہتے ہیں۔ اس قسم کو علم برائے علم بھی شمار کر سکتے ہیں۔ جامعات میں طلبہ اور اساتذہ کی تحقیق اس نوعیت سے تعلق رکھتی ہے۔

سائنسی تحقیق میں علمی میدان کے وہ تحقیقی منصوبے شمار ہوتے ہیں۔ جو عموماً اداروں کی طرف سے سائنسی ضروریات یا موضوعات کے لیے انجام دیے جاتے ہیں۔ اس میں مشاہدات اور تجربات کی ضرورت

ہوتی ہے۔ لسانی تحقیق میں اس سے کسی قدر کام لیا جا سکتا ہے۔ انسانیت کے مجموعی تقاضوں، معاشرے کے عمومی رجحانات، رویوں اور تقاضوں پر جو تحقیق کی جاتی ہے وہ سماجی تحقیق کہلاتی ہے۔ ادب کے بعض پہلوؤں پر تحقیق کرنے والے محقق کو اس نوعیت کی تحقیق سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ جدید ترقیاتی، انجنیئرنگ، یا فنیاتی میدانوں میں صنعت و حرفت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ٹیکنالوجی اور انجنیئرنگ کے بعض پہلوؤں پر فنیاتی تحقیق کا استعمال ہوتا ہے۔ جس میں ایسے ذرائع معلوم کئے جاتے ہیں، جو صنعت و حرفت کی حالت اور پیداوار کا جائزہ لے سکیں۔ عام طور پر یہ ادارہ جاتی تحقیق ہوتی ہے۔

تعلیمی تحقیق میں تعلیمی موضوعات یا نظام، اس کے تقاضوں اور ضروریات کے حوالے سے تحقیقات کی جاتی ہیں تاکہ تدریس، نصاب، تعلیمی نظام اور طلبہ اور اساتذہ کی مشکلات کی نشاندہی اور پھر حل تلاش کیا جا سکے۔ عطش درانی نے موضوع کے اعتبار سے ان اقسام میں بجاطور پر ایک اور قسم ادبی و لسانی تحقیق کا اضافہ کیا ہے جس میں زبان و ادب کے حوالے سے ماضی کی گمشدہ کڑیاں دریافت کی جاتی ہیں اور تاریخی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ادب کو اس کے ارتقا کی صورت میں مربوط کیا جاتا ہے۔ زبان و ادب میں ترقی اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں تحقیق کی بدولت ہی آتی ہیں۔ ہر عہد کی شاعری اور ادب کے رجحانات، رفتار اور قدر و قیمت کا تعین تحقیق کے توسط سے ہی ممکن ہے۔ تحقیق کی ایک تقسیم "حسب واسطہ" بھی کی گئی ہے۔ اس تقسیم میں "بالواسطہ تحقیق اور بلاواسطہ تحقیق" شامل ہیں۔

پہلی قسم میں محقق کو خود کسی شے، مسئلے یا حقائق کے حوالے سے چھان بین اور مواد جمع کرنا پڑتا ہے۔ جس میں وہ تمام طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جو تحقیق کار کی ذاتی کوششوں پر منحصر ہوں جبکہ دوسری قسم میں دوسروں سے حاصل کردہ اور معلومات کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ یعنی اس تحقیق میں مواد اور معلومات پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ محقق ان کا تجزیہ کر کے حقائق معلوم کرتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔) طریق کار کے تحت جدید تحقیق کی اقسام میں تاریخی یا دستاویزی تحقیق، بیانیہ یا جائزہ کاری تحقیق اور تجرباتی یا کنٹرول تحقیق" شامل ہیں۔ تاریخی یا دستاویزی تحقیق کو لائبریری تحقیق بھی کہتے ہیں جو عموماً تحریری مواد یا دستاویزات کو چھان پھٹک کر انجام دی جاتی ہے۔ اس کا تعلق ماضی کے شواہد سے ہوتا ہے۔ ادبی اور لسانی تحقیق عموماً اسی سے متعلق ہوتی ہیں اور ان میں زیادہ تر یہی تحقیقی قسم استعمال کی جاتی ہے۔ دوسری قسم کی تحقیق زمانہ حال میں انجام دی جاتی ہے اور عموماً آرا اور سروے کے نتائج مہیا کرتی ہے۔ حالیہ زبان و ادب کے رجحانات اس سے معلوم کیے جا سکتے ہیں اور آئندہ کی تحقیق کے لیے مفروضے بنائے جا سکتے ہیں۔ زبان و ادب

کے ترقیاتی ادارے اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

تجرباتی تحقیق میں متغیرات کو قابو میں لا کر تجربات کے ذریعے نتائج اور کلیات تک پہنچنے کی کوشش ہوتی ہے۔ افراد یا اشیا کے دو گروہوں میں سے ایک پر روایتی اور دوسرے پر مطلوبہ طریقوں سے تجربات کر کے ان دونوں کے نتائج کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ادبی و لسانی رجحانات، نفسیاتی و تعلیمی امور اور سائنسی و تکنیکی کاموں میں سائنسی تجزیے کے لیے اس قسم کی تحقیق سے کام لیا جاتا ہے۔ اقسام تحقیق کے باب میں عطش درانی نے ایک ڈیزائن یا ڈھانچہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "تحقیقی ڈیزائن یا ارادے کے اعتبار سے جدید تحقیق کی چودہ اقسام بنتی ہیں۔ جن میں کمیتی، کیفیتی، تاریخی، بیانیہ یا تجرباتی تحقیق سے ماورا اپنے مقاصد اور طریق کار کو ملحوظ رکھا جاتا ہے"۔(3)

تجزیاتی تحقیق میں اعداد و شمار یا کوائف کے گروپ جمع کیے جاتے ہیں اور یوں ان اصولوں کو ممتاز کیا جاتا ہے جو اقدام (Action) کے رہنما ہوتے ہیں۔ زبان کے مختلف سانچوں اور نمونوں کو اس طریقے سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اس میں تخصص اور مہارت درکار ہوتی ہے۔ شماریاتی جائزے اور تجزیے بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ تقابلی تحقیق Comparative Research احوال کی دو یا دو سے زیادہ صورتوں کا باہمی مطالعہ کر کے ان کے مابین مشابہات، اختلافات اور اثرات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ زبان کے حالیہ رجحانات اور سماجی لسانیات کا مطالعہ اس کے ذریعے بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر باب میں اس طریقہ تحقیق کو بطور خاص اختیار کیا جائے گا۔ ہم ربطی پیش گو Correlational Predicative اس تحقیقی طریق کار کے تحت باہمی متعلق مظاہر میں باہمی تعلق کی مستقل عددی مقداروں کے مابین تعلق تلاش کر کے اس کی تشریح کی جاتی ہے۔ اور اس کی بنیاد پر اس بات کا کھوج لگایا جاتا ہے اور پیش گوئی کی جاتی ہے کہ ایک عامل میں تبدیلی دوسرے میں کس قدر تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے اور پھر ان حاصلات کی تشریح و تعبیر کی جاتی ہے۔ ڈیزائن اور مظاہراتی تحقیقی قسم میں اسباب پر قابو پانے کے منصوبے، رہائی اور مشاورت کے پروگرام، ساز و سامان کی تیاری اور پیشہ ورانہ امور کے پروگرام وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ سماجی منصوبوں میں اس قسم کا ڈیزائن استعمال کیا جاتا ہے۔ سماجی لسانیات اور مطالعاتی ادبی رجحانات وغیرہ پر تحقیق اس طریقے کی مرہون منت ہے۔

ترقیاتی تحقیق میں ایک یا ایک سے زیادہ قابل مشاہدہ عوامل میں اضافے، نمو یا کمی کو خاص دورانیے میں معلوم کر کے چارٹ تیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر سماجی منصوبوں میں اس تحقیق سے مدد لی جاتی ہے۔-

تجرباتی تحقیق کے ذریعے ایک یا ایک سے زیادہ متغیرات کو قابو میں رکھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ میں عمومی حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور ہر دو گروہوں پر کسی عامل کے اثرات کے فرق کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سماجی تحقیق کا یہ اصول سائنسی تحقیق کا مرکزی طریقہ ہے دونوں گروہوں کا ہر لحاظ سے ایک جیسا ہونا ضروری ہے۔ تاریخی یا دستاویزی تحقیق کے تحت ماضی کو تعبیر نو کے لیے افراد، ادبیات یا سرگرمیوں اور واقعات کا مطالعہ اس طور سے کیا جاتا ہے کہ ان کی اثر پذیری کی غیر جانبدارانہ تشریح کی جاسکے اور مستقبل میں ایسے امور کے عروج یا تعمیر نو میں تحقیق کے حوالے سے درجہ بالا اقسام مختلف محققین نے متعلقہ حوالوں سے متعین کیے ہیں۔ ذیل میں درج بالا تحقیق کی اقسام کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستانی جامعات میں "تحقیقی طریقہ کار کے تناظر" میں روایتی، بین العلومی اور، تقابلی تحقیق" پر مبنی تحقیقی مقالات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

موضوع مقالہ: "اختر حسین جعفری کی شاعری: مزاحمتی تناظر میں"

مقالہ نگار: خرم علیم، ۲۰۱٦ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد ہارون قادر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

اختر حسین جعفری کی شاعری کا اسلوب اور تیور ہم عصر شعرا سے مختلف تھا۔ اُن کی شاعری مشرقی شاعری کی روایت سے اپنا رس کشید کرتی ہے اور اُن کے تخلیقی ذہن کی ندرت کو اپنے ساتھ لے کر قرطاس کی زینت بنتی ہے۔ ان کی شاعری پر مشکل پسندی کا لیبل لگایا جاتا تھا کہ وہ بہت مشکل پسند شاعر ہیں اس لیے اُن کی شاعری کی تفہیم کسی تخلیقی عمل سے کم نہیں ہے۔ زیر مطالعہ مقالے میں مقالہ نگار نے اختر حسین جعفری، علامت نگاری،، اردو نظم کے مزاحمتی تصور اور اختر حسین جعفری کے معاصر ادب کے حوالے سے مفید تحقیقی مواد جمع کیا ہے۔ مذکورہ مقالہ "اختر حسین جعفری کی شاعری مزاحمتی تناظر میں" میں مقالہ نگار خرم علیم نے اپنے مقالے کے باب اول میں اختر حسین جعفری کی سوانح اور شخصیت اور شعری نقطہ نظر پر بات کی ہے۔ دوسرے باب میں اردو نظم میں مزاحمت کی روایت کو موضوع بنایا گیا ہے، اس تناظر میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "مزاحمت ہمارے ادب کے خمیر میں رچی بسی ہے کیونکہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط کا ہی نہیں، معاشرتی اور تہذیبی زوال کا عہد بھی ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں ہی مسلمانان برصغیر کے زوال کا آغاز ہو چکا تھا۔ تاہم سیاسی زوال وانحطاط کی تاریخ میں 1857ء ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت

رکھتا ہے کیونکہ ایک طرف تو مسلمانوں کے ساڑھے چھ سو برس کے اقتدار کا
خاتمہ ہوا اور دوسری طرف غلامی کے دور کا بھی آغاز ہوا"۔(4)

مذکورہ مقالے کا تیسرا باب اختر حسین جعفری کی کتاب "آئینہ خانہ" کے حوالے سے ہے جس کا عنوان "آئینہ خانہ: مزاحمتی تناظر میں" رکھا گیا ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے اُن کی نظموں کی تفہیم بھی کی ہے اور جعفری صاحب کے مزاحمتی رویے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ باب چہارم کا عنوان" جہاں دریا اترتا ہے: مزاحمتی تناظر میں" ہے۔ اس میں بھی اختر حسین جعفری کی نظموں کی تفہیم اور مزاحمتی رویوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ پانچواں باب ان نظموں کے حوالے سے ہے جو نظمیں اختر حسین جعفری نے شخصیات کے حوالے سے لکھی ہیں۔ چھٹے باب میں اختر حسین جعفری کی غزلوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ساتواں اور آخری باب اختر حسین جعفری کی شاعری مزاحمتی تناظر میں (مجموعی جائزہ) کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے مقالے میں ہونے والی ساری گفتگو کو سمیٹا ہے۔ یہ اس مقالے کا ایک اجمالی خاکہ بھی ہے۔

موضوعِ مقالہ: "تہذیبی آویزش کی روایت اور فکرِ اقبال"

مقالہ نگار: منیبہ صائمہ، ۲۰۱۸ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر ناہید قمر، وفاقی جامعہ اُردو برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

تہذیب کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں ایک نظام پیدا کیا جائے۔ انسان کو قوانین وضوابط کا پابند بنا کر اس کی خواہشات وصلاحیتوں کو مثبت رخ عطا کیا جائے تاکہ وہ آئینہ فطرت میں اپنی خودی کو دکھا سکے۔ فطرت کی تباہ کاریوں اور مزاحمتی عناصر پر قابو پاتے پاتے آج انسان نے تہذیب کے اعلیٰ مدارج طے کیے ہیں۔ تہذیب جہاں ارتقائی مراحل سے گزرتی ہوئی اس مقام پر پہنچی ہے وہیں تہذیبوں کے درمیان آویزش بھی پروان چڑھتی نظر آتی ہے۔ نظریاتِ، حیات افکار واعمال اور جغرافیائی وسیاسی صورتحال کے ساتھ ساتھ، اقدارِ حیات اور فلسفہ زندگی کی بنیاد پر تہذیبی اختلاف وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ رجحانات خواہ موضوعی ہوں یا معروضی، کسی تہذیب سے جب متصادم ہوتے ہیں تو وہ اس قوم کی مجموعی زندگی میں تحریک کا باعث بنتے ہیں۔ یہ آویزش ہزار ہا سال کسی تہذیب کی بنت میں جب جگہ پالیتی ہے تو تہذیبی تصادم کا وہ ثمر بار آور ہوتا ہے جو کسی قوم کا طرزِ زندگی بدل دیتا ہے۔ انسان کیوں جینا چاہتا ہے؟ وہ کیوں جان دے دیتا ہے، اس کے لیے کبھی کبھی ایک قدر کی خاطر اپنی جان سے گزر جانا اور کسی کی جان لے لینا اتنا ضروری کیوں ہو جاتا ہے؟ وہ کس

مقصد کی خاطر بھوک اور پیاس برداشت کرلیتا ہے؟ روز ازل سے انسان کی تگ و دو کیا صرف کھانے پینے، اوڑھنے، پہننے یا دیگر ضروریات کے حصول کے لیے ہے یا اس کا محرک کچھ اور بھی ہے۔

اگر مسلمان عقیدہ آخرت کی وجہ سے اپنی جان سے گزر جاتے ہیں تو دیگر تہذیبوں کے لوگ کس بنیاد پر اپنی جان دیتے اور کسی کی جان لیتے ہیں؟ اس کے پس منظر میں صرف بنیادی ضروریات کے حصول کی لڑائی ہی نہیں بلکہ تہذیبی آویزش ہے جو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ جس نے کبھی ملوکیت، اشتراکیت یا سامراجیت کا لبادہ اوڑھ کے انسانیت پر شب خون مارا تو کبھی نو آبادیاتی نظام کی صورت میں انسانیت کو ڈسا، تہذیبی آویزش کا وہ سلسلہ جو پتھر کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، عہد حاضر میں بھیانک صورت اختیار کرچکا ہے۔ حکومتوں کا زوال ہو یا کمزور ممالک کے وسائل پر قبضہ، مارشل لا کا نفاذ ہو یا ترقی پذیر بالخصوص اسلامی ممالک کے مابین جنگ، میڈیائی یلغار ہو یا نام نہاد تجارتی و عسکری معاہدے، تہذیبی آویزش کی ہولناک صورتیں ہیں جو سامراجی مقاصد کی تکمیل کرتے ہوئے، یک تہذیبی فارمولے پر عمل پیرا ہیں۔ تہذیبی آویزش کی یہ صورتیں جدید ہیں لیکن ان کے مقاصد وہی پرانے ہیں۔

خدا کی طرف سے ہر دور میں ایسی ہستیاں بھیجیں گئیں جن کی سوچ بلند، نظر وقیع اور دوررس، عقل نورایمان سے منور اور روح وجدان کی دولت سے مالامال تھی۔ جن کے افکار نے انسانیت کو سیدھا راستہ دکھایا۔ حکیم الامت شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا شمار بھی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے انسانیت کی فلاح، بالخصوص مسلمانوں کی بیداری کے لئے اپنے دِنوں کی تپش اور شبوں کے گداز کو وقف کردیا۔ اقبال کے تہذیبی رویے مذہب اسلام کی روشنی میں بنتے ہیں اور جو بات بھی اسلام کے تہذیبی اصولوں سے متصادم ہوتی ہے وہ تہذیبی آویزش کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ اقبال کی شاعری یا نثر میں تہذیبی آویزش کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہ تہذیبی آویزش نثر میں اس صورت میں نہیں، جسے اسلامی اور مغربی یا مشرقی اور مغربی تہذیب کی جنگ اور تصادم کا نام دیا جاسکے۔ جیسے بعض مغربی تہذیب کے نمائندوں (آلون ٹافلر، سیموئیل پی ہن ٹنگٹن "وغیرہ نے تہذیبی تصادم کا نظریہ پیش کیا۔

اقبال کے ہاں تہذیبی آویزش کی روایت کا سراغ اس صورت میں ملتا ہے جب تہذیب حاضر اخلاقی وروحانی اقدار کو پس پشت ڈالتے ہوئے مادیت پرستی کا شکار ہوجاتی ہے اور تہذیب و ثقافت کے معاملات میں مادی اور طبعی اصولوں کی بالادستی کو قبول کرلیتی ہے۔ اقبال کی بصیرت نے مختلف تہذیبوں کی جن خامیوں پر تنقید کی آج وہی خامیاں سیاسی اور مادی مصلحتوں پر مبنی جارحیت کی بنا پر تہذیبی تصادم کو فروغ دے رہی

ہیں۔ اقبال نے نہ صرف مغربی تہذیب کے ان عناصر پر تنقید کی جو تہذیبی آویزش کو فروغ دیتے ہیں بلکہ مشرقی تہذیب کے ان عناصر کو بھی نمایاں کیا جن کی اسلامی تہذیب سے آویزش ہے۔

"تہذیبی آویزش کی روایت اور فکرِ اقبال" کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ برصغیر پاک وہند کی تہذیب میں صدیوں کی وہ آویزش چلی آرہی ہے جو پے درپے یہاں مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھنے والی قوموں کی آمد سے واقع ہوئی۔ اقبال کا تہذیبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قوموں کے عروج وزوال کی داستان ہو یا تہذیبوں کے زندہ اور مردہ ہونے کے رموز، وہ ان سب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ برصغیر پاک وہند کی مٹی میں تہذیبی آویزش کا جو بیج صدیوں سے پنپ رہا تھا وہ پاکستان کی صورت میں بار آور ہوا۔ جس کی بنیاد دو قومی نظریہ بنا۔ لیکن یہ نظریہ ایک دن میں قائم نہیں ہوا بلکہ ان کے پیچھے صدیوں کے وہ تہذیبی حادثے اورآویزش ہے جس نے اس اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی اور اسی وجدان نے خطبہ الہ آباد ۱۹۳۰ء میں ببانگ دہل اس مملکت کا نقشہ کھینچ کر خاص وعام کے سامنے رکھ دیا۔

منیبہ صائمہ کے مطابق اقبال تہذیبی تصادم اور تہذیبی آویزش کی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اوراسے انسانیت کیلئے مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ فکر اقبال میں تہذیبی آویزش کا تصور ادب کے لطیف سانچوں میں ڈھلا ہوا ملتا ہے۔ ادب تاریخی حقائق اور فلسفیانہ افکار کا بیان ہی نہیں بلکہ فن کے تقاضے پورے کرنا اس کی اولین شرط ہے اور اقبال کے ہاں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اقبال کے افکار کی تفہیم، اس تناظر میں جتنی آج ضروری ہے اتنی شاید کبھی بھی نہ تھی۔ نائن الیون کا واقعہ ہو یا عراق، افغانستان، فلسطین، شام اور دیگر مسلمان ممالک پر غاصبانہ قبضہ اور لوٹ مار، عہدِ حاضر کے اس عفریت کو افکار اقبال کی روشنی میں قابو کیا جاسکتا ہے۔ تہذیبی آویزش یا تہذیبی تصادم کے مسئلے کا حل فکر اقبال کی روشنی میں ڈھونڈا جاسکتا ہے جو عین اسلامی ہے۔

مقالہ نگار منیبہ صائمہ نے " تہذیبی آویزش کی روایت اور فکرِ اقبال" کے باب اول میں تہذیب کی تعریف اوراس کے نظری مباحث شامل کیے ہیں۔ عام طور پر کسی تہذیب کے اجزا میں اس کا طرز تمدن، طرزِ حکومت، نظام تعلیم، نظام افکار وعقائد، قوانین وروایات اور عمومی معاشرتی رویے شامل ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام اجزا کے پس منظر میں کوئی مشترکہ فکر یا رویہ بھی کارفرما ہوتا ہے جو کسی قوم کے ان تمام تہذیبی مظاہر کو عیاں کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار نے تہذیب کی ابتدا وارتقا اور مختلف تہذیبوں کا تعارف بھی اسی باب میں کروایا ہے۔ باب دوم میں تہذیبی آویزش کا مفہوم اور بیسویں صدی میں تہذیبی تصادم کے نظریے

کی وضاحت کی گئی ہے۔ تہذیبی آویزش کی بنیاد دراصل وہ فکر یا رویہ ہے جو تہذیب کے عناصر ترکیبی یا اجزا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، یہ کسی بھی رویے، نظریے کی دو متضاد صورتیں ہوتی ہیں۔ تہذیبی آویزش نظریاتی اختلاف سے بھی پید ہو سکتی ہے اور سیاسی و سماجی عوامل بھی اسے پیدا کر سکتے ہیں۔ جبکہ تہذیبی آویزش بذاتِ خود بھی ان پر اثرانداز ہوتی ہے۔ باب دوم میں ہی "اردو ادب میں تہذیبی آویزش" کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں تہذیبی تصادم یا تہذیبی آویزش کے اثرات، مزاحمتی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ تہذیبی آویزش نے نہ صرف زبان کو متاثر کیا بلکہ ادبی موضوعات، اسالیب اور اصنافِ ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس عنوان کے تحت وہ لکھتی ہیں:

> "کسی بھی زبان میں ادب کا ابتدائی روپ شاعری کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور مسلمانون کی آمد کے بعد اسلامی تہذیب اور مقامی تہذیبوں کی آویزش اور سیاسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ تہذیبی و فکری رجحانات کا دھارا بیجاپور اور گولکنڈہ کی ادب نواز مسلمان ریاستوں کے حوالے سے حسن شوقی اور پھر ولی دکنی کی غزل میں منتقل ہو کر اس کے ساتھ دہلی پہنچتا ہے۔ اس طرح اردو شاعری کے حوالے سے تہذیبی سفر کا ایک دائرہ مکمل ہو جاتا ہے"۔(5)

زیر مطالعہ مقالے کے باب سوم میں اقبال کی شخصیت کا تہذیبی تناظر میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے کس ماحول میں پرورش پائی اور تعلیم و تربیت حاصل کی نیز عہد اقبال میں تہذیبی آویزش نے فکر اقبال پر کیا اثرات مرتب کیے، اسی باب میں " فکرِ اقبال کی تہذیبی آویزش اور تہذیبی تشخص کی علامات، پردہ اور تہذیبی آویزش، تہذیبی آویزش اور نظریہ وطینت و قومیت اور ملت، تہذیبی آویزش اور تہذیبی شخصیات، ارکانِ اسلام اور تہذیبی آویزش" کے عنوانات کے تحت مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ سب فکرِ اقبال کے معروضی مباحث ہیں۔ جبکہ موضوعی مباحث کا مطالعہ باب چہارم میں کیا گیا ہے منیبہ صائمہ نے باب چہارم میں فکرِ اقبال کے موضوعی مباحث کا مطالعہ تہذیبی آویزش کے تناظر میں کیا ہے جن میں اقدار و اخلاق اور تہذیبی آویزش، حیا ایک اہم تہذیبی قدر، فلسفہ خودی اور تہذیبی آویزش تہذیبی آویزش اور عورت کا مقام تہذیبی آویزش اور اقبال کا نظریہ علم و تعلیم، فنونِ لطیفہ اور تہذیبی آویزش، تہذیبی آویزش اور سیاسیات، تہذیبی آویزش اور نظریہ زمان و مکان شامل ہیں۔

موضوع مقالہ: "خیبر پختونخوا میں اُردو نصاب: تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ"

مقالہ نگار: محمد حامد، ۲۰۱۵ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، شعبہ اُردو جامعہ، پشاور

علم و عرفان انسان کی بقا، فلاح اور ترقی و ارتقا کی کلید ہے۔ اس کی بنیاد پر بعض انسانوں کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اور وہ باقی دنیا سے کئی قدم آگے چلتے ہیں اور دنیا کی امامت کا فریضہ ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ انسانی معاشرتی ارتقا میں تعلیم کا نظام اس مقصد کے لیے وجود میں آیا ہے۔ تعلیم کا پورا نظام نصاب پر گردش کرتا ہے۔ نصاب کی بہتری نظام کی بہتری کی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر تعلیم بے سمت ہو سکتی ہے۔ نصابی تحقیق، تعلیمی نصاب کی تیاری، اس کی افادیت اور مطلوبہ مقاصد کے حصول کا جائزہ لیتی ہے۔ محمد حامد کا مربوط و مبسوط کردہ زیر نظر مقالہ بھی نصابی تحقیق کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اردو میں نصابی تحقیق پر کام کم ہوا ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی نے جامعات کے شعبہ جات اردو سے یہی گلہ کیا ہے کہ تدریسیات کا میدان اردو کے حوالے سے علم التعلیم (Education) کے شعبے نے تو چھوڑ ہی رکھا ہے، اردو کا شعبہ بھی اسے نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ "خیبر پختونخوا میں اُردو نصاب: تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ "پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا میں مروج اردو نصابات کی تحقیق و تجزیے پر مشتمل ہے۔ اس مقالے کا موضوع خیبر پختونخوا میں سرکاری تعلیمی اداروں میں پہلی (کچی) جماعت سے لے کر پی ایچ ڈی تک پڑھائے جانے والے اردو نصابات ہیں۔ صوبے میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں مختلف قسم کے نصابات پڑھائے جاتے ہیں جن کے معیار کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی لیکن سرکاری اداروں میں ایک خاص نظامِ معیار کے مطابق نصابات تیار کیے جاتے ہیں۔ چونکہ صوبے کی اکثریت سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتی ہے اس لیے ان کے نصابات کا قومی تشکیل و تعمیر میں کردار بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں کے نصابات ایک خاص طریق کار کے مطابق تیار کیے جاتے ہیں اور ان پر کافی غور و خوض کیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی وقت کے تقاضوں، علم کی صورتِ حال اور معاشرے کی رفتار میں ہونے والی تیز تر تبدیلیوں کے پیش نظر نصابات کا جائزہ ضروری ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ نصابات کردار سازی، فراہمی علم اور تعلیمی مہارت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ نصاب سازی میں پہلا قدم " تجزیہ حالات"(Situation Analysis) کا ہوتا ہے کیونکہ حالات مسلسل تغیر و تبدل سے روشناس ہوتے رہتے ہیں۔

محمد حامد کا لکھا گیا یہ مقالہ موجودہ نصابات کا جائزہ پیش کرتا ہے، مطلب یہ یک زمانی مطالعہ (Synchronic) (Study ہے نہ کہ کثیر زمانی (Diachronic)۔ اُن کا یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب نصاب کی تعریف اور اہمیت سے بحث کرتا ہے اور پاکستان میں نصاب سازی کے طریق کار و مراحل پر روشنی ڈالتا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کی قومی تعلیمی پالیسیوں کی روشنی میں قومی تعلیمی ترجیحات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں صوبہ خیبر پختونخوا میں رائج اردو لازمی (نرسری تا دوازدہم) کے نصاب کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ نصابی تجزیہ مقاصدِ نصاب کے معروف اجزا، علمی، تاثراتی مہارتی کے ذریعے کیا گیا ہے اور مشمولات نصاب کا فلسفیانہ، ادبیاتی، زمانی اور نفسیاتی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا طریقہ کار تعلیمی جائزوں کے لیے دنیا بھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق علمی، تاثراتی اور مہارتی حلقہ جات اور ان کی درجہ بندیاں (Taxonomies) عالمگیر سطح پر نصابی جائزوں کے معروف اوزار ہیں۔ فلسفہ حیات اور آئیڈیالوجی بھی نصاب و نظام تعلیم کا بنیادی جزو ہے۔ ادب و زبان کے نصاب کا جائزہ ادبیاتی جائزے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور زمانی جائزہ ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے جانچ پرکھ کرتا ہے۔ اس میں خاص طور سے مستقبل کو نظر میں رکھا جاتا ہے۔ نفسیاتی جائزہ بھی نصاب کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ یہ جائزہ نصاب کو تدریس کے نفسیاتی اصولوں سے مطابقت کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ پاکستان کی قومی تعلیمی پالیسیوں میں بھی نصاب کے لیے ان اجزا کی ہدایت کی گئی ہے۔ تیسرا باب پاکستان میں شروع سے رائج روایتی نظام کے درجات بی اے وایم اے کے اردو نصابات کی تحلیل و تجزیے پر مبنی ہے جبکہ چوتھے باب میں نئے متعارف شدہ نظام بی ایس اردو کے نصاب کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ چونکہ یہ دونوں اجزا بی اے وایم اے اور بی ایس ایک دوسرے کے متبادل ہیں اور طالب علم کو کسی ایک کو پڑھ کر آگے جانا ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

پانچواں باب ایم فل و پی ایچ ڈی اردو کے نصابات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس باب میں تعلیمی مخروط کے اعلیٰ ترین درجات کے کورس ورک میں شامل کورسز اور ماضی میں کیے گئے تحقیقی کام کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا اور نتائج پیش کیے گئے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام ابواب میں آخری جزو جائزہ رکھا گیا ہے جو باب کے مضبوط و کمزور پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے اور ذمہ داروں کی توجہ ان نکات کی طرف دلاتا ہے۔ آخری باب "حاصل تحقیق" ہے جس میں مقالے کا مجموعی محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور نتائج وسفارشات بھی واضح انداز میں قاری کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ مقالہ نگار محمد حامد نے اس مقالے میں زیادہ استفادہ بنیادی آخذ سے کیا گیا ہے۔ ثانوی آخذ کا استعمال وہاں کیا گیا ہے جہاں تائید، تردید، تبصرے یا پس منظری مطالعے کی ضرورت ہو۔ زیر نظر مقالے کے بنیادی آخذ: قومی تعلیمی پالیسیاں، نصاب ساز اداروں کی سفارشات اور ہدایاتی کتابچے، نصابی کتب و

دستاویزات، ہائر ایجو کیشن کمیشن کی ہدایات و دستاویزات اور دیگر سرکاری دستاویزات سے بطورِ خاص استفادہ کیا گیا ہے جبکہ ثانوی مآخذ میں نصاب و تعلیم پر لکھی گئی مقامی ملکی اور بین الاقوامی اردو و انگریزی کتب / جرائد / اخبارات سے مدد لی گئی ہے۔ ان کے علاوہ انٹرنیٹ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

موضوعِ مقالہ: "جمشید نواز نایابؔ کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: فہد جمال، ۲۰۱۸ء

نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر روبینہ شاہین، شعبہ اُردو جامعہ، پشاور

خیبر پختونخوا میں ادبی لحاظ سے ۹۰ء کی دہائی کافی زرخیز رہی۔ خیبر پختون خوا اور خاص کر اس کے جنوبی اضلاع کی یہ خوش قسمتی رہی کہ اس دہائی میں کافی زرخیز ذہن کے مالک شعرا اور نثر نگار منظر عام پر آئے جنھوں نے اردو ادب کو وہ ادبی سرمایہ دیا جو ہمیشہ ادبی تاریخ میں سنہرے حروف سے محفوظ رہے گا۔ مثلاً سعید احمد اختر، غلام محمد قاصر، مقبول عامر تسلیم فیروز اور خورشید ربانی اس خطے کے وہ بڑے نام ہیں جن کے اردو ادب پر احسانات ان گنت اور نا قابلِ فراموش ہیں۔ اِسی دہائی میں اس خطے سے تعلق رکھنے والے جدید شاعر قاصرؔ اور مقبول عامرؔ کے ترانے فضاؤں میں گونج رہے تھے ایک اور مقبول آواز جمشید نایاب جیسے شاعر اور نثر نگار کی بھی تھی لیکن ناقدین ادب کی عدم توجہی کے باعث اس گوہر آبدار پر ناواقفیت کا غلاف چڑھا رہا۔

جمشید نایاب کا نام دو چار لوگ بھی نہیں جانتے تھے حالانکہ ایک خاص رنگ سخن کے اعتبار سے وہ نہ صرف بہت بہتر شاعری کر گئے بلکہ بہت سے معروف و مشہور شعرا سے زیادہ جاندار اشعار کی تخلیق پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری فرد کی دلی امنگوں کے ساتھ ساتھ سماج اور زندگی سے جڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات اور معاملات عشق و محبت کو نہایت مہذب اور دل نشین انداز میں شعر کا حصہ بنایا اور اپنا موقف جرات اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا۔ مقالہ نگار فہد جمال کے مطابق جمشید نایاب کا موازنہ اس کے ہم عصر شعرا سے کریں تو "نایاب" کا پلڑا اس لحاظ سے بھاری نظر آتا ہے کہ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کو بھی اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمشید نایاب کا بھی اردو ادب میں وہی مقام ہے جو اُن کے ہم عصر شعرا کے حصے میں آیا۔

جمشید نایاب کی شخصیت اور فن پر "جمشید نواز نایابؔ کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" سے پہلے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ "نایاب" کے ایک قریبی دوست ارشاد حسین شاہ نے نایاب کی شخصیت اور موت پر کچھ مضامین ضرور لکھے ہیں لیکن وہ ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے ناکافی ہیں۔

مذکورہ مقالے میں مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ نایاب کی شخصیت، کلام اور فلسفے کو فکری اور فنی دونوں حوالوں سے تمام تر رعنائیوں اور باریکیوں کے ساتھ منظر عام پیش کیا جاسکے۔ اس مقالے کے تجزیاتی مباحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ نایاب کی شخصیت، کلام اور فلسفہ سے اُن کی واقفیت سامنے آگئی ہے اور وہ اپنے اوصاف کے باعث صوبہ خیبر پختونخوا کے صف اول کے شعرا اور نثر نگاروں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

مقالہ نگار نے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "سوانح و شخصیت" کے عنوان سے ہے جس میں جمشید نایاب کی پیدائش، خاندانی پس منظر، تعلیم، ملازمت، ادبی شعور کے آغاز اور شخصیت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مقالے کے اس تعارفی باب کی ضرورت اس لیے بھی تھی کہ شخصیت کا مکمل احاطہ کیے بغیر ان کی شاعری کے داخلی سرچشموں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔ دوسرا باب "جمشید نایاب کی غزل کا فکری و فنی جائزہ" کے عنوان سے ہے جس میں اُن کی غزل میں موجود فکری پیغامات پر مفصل بحث کی گئی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح "نایاب" نے بھی بہت اہم موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے اور اپنی غزل کو فنی نزاکتوں سے جمالیات کا ایک خوبصورت شاہکار بنایا ہے۔

تیسرا باب "جمشید نایاب کی نظم کا فکری و فنی جائزہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ان کی نظم میں موجود موضوعات اور فنی نزاکتوں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ نظم جمشید نایاب کا اصلی میدان ہے اور انہوں نے اپنے ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار اس میں کھل کر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں یہ بتانے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ اُن کی نظم میں کہاں تک پھیلاؤ، ہمہ گیری اور وسعت پائی جاتی ہے اور ماحول کی جزئیات پر نظر ڈال کر اس کے منظر اور پس منظر کو اپنی بصارت کی گرفت میں لے کر اور اسے وسعت دیتے ہوئے ساری کائنات پر پھیلا دینے میں کہاں تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "جمشید نایاب اپنی نظموں میں اکثر اپنے دل سے ہمکلام رہتے ہیں اور اپنے دل کو خوش فہم قرار دیتے ہیں۔ ہجر و فراق کے معاملے میں اُن کا دل حد درجہ خوش فہم اور پر اعتماد ہے۔ ہجر کی تکالیف اور محبوب کی جدائی کا جمشید نایاب پر پکا یقین ہو گیا ہے اور ایسے میں دل کا پر امید رہنا، ناکامیوں کے زہر کو امرت بنا دینے کے مترادف ہے"۔(6)

اُن کے مقالے کا چوتھا باب "جمشید نایاب کے فلسفہ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں نایاب کے فلسفہ پر بحث کی گئی ہے۔ مغربی فلسفہ سے اُن کی واقفیت اور اُن سے جنون کی حد تک

عشق کو زیر بحث لایا گیا ہے۔اس باب میں جمشید نایاب کے پسندید و نظام حیات کو تفصیلاً موضوع بنایا گیا ہے۔پانچواں باب حاصل بحث پر مبنی ہے جو پہلے ابواب پر مشتمل بحث کا مجموعی تجزیاتی جائزہ پیش کرتا ہے ۔مقالہ نگار کے مطابق اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور بنیادی و ثانوی مآخذات کے حصول کے سلسلے میں ، انہوں نے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا، جن میں شعبۂ اردو جامعہ پشاور کا کتب خانہ ، شعبہ اردو اسلامیہ کالج لائبریری پشاور اور مفتی محمود لائبریری کا ذخیرہ کتب نمایاں ہیں۔

موضوع مقالہ: "شمس العلما تاجور نجیب آبادی کی علمی و ادبی خدمات"

مقالہ نگار: محمد خالد لطیف، ۲۰۱۹ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

شمس العلما بلیغ الملک تاجور نجیب آبادی کی ذات، علمی و ادبی اعتبار سے اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔ بحیثیت ناقد، انشا پرداز، صحافی، شاعر، بچوں کے ادیب، مزاح نگار اور مرتب ان کی ادبی شخصیت متعدد پہلوؤں کی حامل تھی۔ پنجاب میں اردو زبان کی جو خدمت انہوں نے کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔انہوں نے ایسے موسم اور ایسے حالات میں علم و ادب کی محفل آراستہ کی جب عام لوگ شعر و ادب کے نام سے بھی تقریباً نا آشنا تھے۔پنجاب کے لوگوں کے لیے اُردو ایک اجنبی اور نامانوس زبان تھی اور شعر و ادب نادر اور عجوبہ روز گار شے! اس میں شک نہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی وغیرہ پنجاب میں بزم ادب کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور سر عبد القادر، علامہ اقبال اور ان کے رفقا ادب کو فروغ دینے میں خلوص دل سے کوشاں تھے لیکن اس زمانے تک یہ مساعی خواص تک محدود تھیں۔انہیں عوامی رنگ علامہ تاجور کی کوششوں سے ملا۔ بالخصوص پنجاب کے ہندو اور سکھ نوجوانوں کے بارے میں تو یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی غالب اکثریت علامہ تاجور ہی کی تربیت یافتہ تھی۔ علامہ تاجور نے اس زمانے میں ان اقوام میں اردو ادب کا ذوق پیدا کیا جب ہندوؤں کے بڑے لیڈر ہندی زبان کے فروغ و استحکام کی تحریک شروع کر چکے تھے اور کھلے لفظوں میں اُردو کو قرآنی زبان (یعنی مسلمانوں کی زبان) قرار دیتے تھے۔

مقالہ نگار محمد خالد لطیف نے تحقیقی نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "سوانح و شخصیت" دو حصوں میں تقسیم ہے۔پہلے حصے کی حیثیت سوانحی ہے جس میں مواد کی فراہمی کے سلسلے میں علامہ تاجور کے خاندان کے افراد اور تاجور کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے سوانحی حالات سے مدد لی گئی ہے۔اس حصے میں علامہ تاجور کے خاندان، تعلیم، قیام گاہوں اور ادبی مصروفیات کا ذکر

کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق علامہ تاجور کی تاریخ پیدائش اور وفات، تصفیہ طلب تھی اُس کا تصفیہ کیا گیا ہے۔ باب اول کے دوسرے حصے میں حلیے، معمولات اور عادت و خصائل کا ذکر ہے اور ان کی مذہبی و علمی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے۔

باب دوم "علامہ تاجور بحیثیت نقاد و انشا پرداز" میں علامہ کے لکھے ہوئے اداریے، ادارتی نوٹ، تبصرے، تقریظات، مضامین، دیباچے اور مقدمات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بیشتر کام علامہ تاجور کے زیر ادارت شائع ہونے والے رسائل سے کیا گیا ہے۔ علامہ تاجور کی مرتبہ کتابوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں ایسے مضامین پر بحث کی گئی ہے جو شخصیت نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان مضامین میں علامہ تاجور نے جن شخصیات کا ذکر کیا ہے ان میں جارج پنجم، مسٹر وولنر، پروفیسر آرنلڈ، ریڈیارڈ کپلنگ، سر میر عثمان علی خان، سلطان جہاں بیگم، نواب یوسف علی خان، پرنس معظم شاہ، سر شہاب الدین، سر فضل حسین، چودھری ظفر اللہ خاں، سردار سکندر حیات، سر چھوٹو رام اور سر عبد القادر شامل ہیں۔

"شمس العلما تاجور نجیب آبادی کی علمی و ادبی خدمات" کے باب سوم "علامہ تاجور بحیثیت ماہر زبان" میں علامہ تاجور کی ایسی تحریروں کو زیر بحث لایا گیا ہے جن کا تعلق اُردو قواعد، لغات اور تاریخ زبان سے متعلق ہے۔ تاجور کی لکھی ہوئی "تاج اللغات" عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور نے شائع کی ہے اور اسے اردو مرکز، لاہور کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اس لغات پر تاجور کا نام بطور مرتب درج نہیں کیا گیا۔ اس باب میں ایسے شواہد پیش کیے گئے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس لغت کے اصل مرتب "علامہ تاجور" ہی ہیں۔ اس کے علاوہ "تاریخ زبان اردو" پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب مسلسل مضامین پر مشتمل ایک سلسلہ ہے جس میں زبان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات کو پیش کیا گیا ہے۔ ان مضامین سے علامہ تاجور کی لسانی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس باب میں علامہ تاجور کے عربی سے اردو میں کیے ہوئے چند تراجم کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ علامہ تاجور کی عربی و فارسی پر دسترس کے حوالے سے محمد خالد لطیف لکھتے ہیں:

> "شمس العلما تاجور نجیب آبادی کو عربی فارسی اور اردو زبان و ادب پر کامل دسترس حاصل تھی۔ اس کا اظہار ان مضامین اور ادبی کالموں سے ہوتا ہے جو مختلف ادوار میں ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی گفتگو میں بھی اُردو زبان و قواعد کے اصولوں کو پیش نظر رکھتے تھے"۔(7)

زیر مطالعہ مقالے کے باب چہارم میں علامہ تاجور کی صحافیانہ حیثیت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ علامہ تاجور کی زندگی کا بیشتر حصہ ادبی رسائل کی ترتیب و اشاعت کی نذر ہوا۔ وہ مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا اور شاہکار جیسے اہم رسائل کے مدیر رہے۔ اس باب میں علامہ تاجور کے لکھے ہوئے "شذرات" کے ذریعے ادبی شخصیات کی تحریروں پر بحث کی گئی ہے اور تاجور کی سیاسی صحافت کے موضوعات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ باب پنجم، علامہ تاجور کی دیگر ادبی حیثیات پر مشتمل ہے۔ "شمس العلما تاجور نجیب آبادی کی علمی و ادبی خدمات میں مقالہ نگار خالد لطیف نے "علامہ تاجور بطور شاعر" میں تاجور کی غزل گوئی اور نظم گوئی کو علیحدہ علیحدہ طور پر پیش کرنے کے ساتھ ان کی شاعرانہ حیثیت کا تعین کیا ہے۔ "علامہ تاجور بطور مرتب" میں اردو مرکز کے تحت مرتبہ تینتیس جلدوں کا تفصیلی تجزیہ بھی مقالہ نگار نے پیش کیا۔ جنہیں عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ علامہ تاجور کی مرتبہ کتابیں جو شمشیر سنگھ اینڈ کمپنی، لاہور کی طرف سے شائع ہوئی ہیں ان پر بھی بحث کی گئی ہے۔ "علامہ تاجور بطور بچوں کے ادیب" میں رسالہ پریم کی اشاعت کے مقاصد، اس کے ٹائٹل اور مندرجات کا فنی و فکری تجزیہ اور اُس میں شائع ہونے والی خبروں کی نوعیت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں "شاہکار میں شامل صفحہ اطفال" کے لیے لکھی گئی علامہ تاجور کی تحریروں کی تفصیل اور جائزہ درج ہے اور بچوں کے لیے لکھی گئی سوانحی کتب کا ذکر بھی ہے۔

"علامہ تاجور بطور ماہر تعلیم" کے تحت تعلیمی اداروں میں علمی و اخلاقی ماحول اور دیال سنگھ کالج میں علامہ تاجور کے شاگردوں کا ذکر ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقی و علمی کمیٹیوں میں علامہ تاجور کی نمائندگی کا جائزہ لیا گیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کے بارے میں تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا ذکر ہے۔ "علامہ تاجور بطور مزاح نگار" کے عنوان کے تحت علامہ تاجور کی مزاحیہ تحریریں جو شاہکار، ادبی دنیا اور "ہمارا پنجاب" میں شائع ہوئی ہیں ان کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں محاکمہ لکھا گیا ہے جس میں علامہ تاجور کی ادبی، تنقیدی اور سماجی حیثیت کا تعین کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کا ارتقا: تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: عامر اقبال، ۲۰۱۹ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد وسیم انجم، وفاقی جامعہ اردو برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی، اسلام آباد

منڈی بہاؤالدین وفا شعار، ہنر مند، دانشور، ادیب، شعرا، محقق، اور جرات مند لوگوں کی مردم خیز زمین ہے۔ منڈی بہاؤالدین کا شمار قدیم اور تاریخی شہروں میں ہوتا ہے۔ اس کی تہذیب و ثقافت قبل مسیح کے

زمانے سے موجود ہے۔مقالہ نگار عامر اقبال" منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کا ارتقا: تحقیقی و تنقیدی جائزہ" میں یہ بات درج ہے کہ راجاپورس، سکندراعظم، سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، شیر شاہ سوری، جلال الدین محمد اکبر اور راجار نجیت سنگھ سمیت جتنے بھی جنگجو یہاں سے گزرے ہیں، انہوں نے یہاں کی تہذیب وتمدن، ادب اور ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس خطہ پر آنے والے بڑے بڑے فاتحین کے ساتھ ساتھ سینکڑوں ماہرین فن کے علاوہ درجنوں شعرا اور فنون لطیفہ کے ماہرین نے بھی سکونت اختیار کی۔ منڈی بہاؤالدین میں علم و ادب کے حوالے سے قیام پاکستان سے قبل بھی روایت رہی ہے۔اس روایت میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ شعرا کی فکری وفنی صلاحیتوں کا بھی بہت بڑا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی روایت بھی منڈی بہاؤالدین کا حصہ رہی ہے۔ شاہ جہاں کے دور شہنشاہی میں حضرت نوشہ گنج بخش اردو اور پنجابی کے اولین شعرا میں سے ہیں۔

فرنگی دور میں منڈی بہاؤ الدین میں دوماہنامے نمایاں حیثیت رکھتے تھے جو تواتر سے چھپتے اور مسلمانان برصغیر کے مسائل کے سدباب کی نشاندہی کرتے تھے۔ماہنامہ "عصمت" جو کہ مصور غم علامہ راشد الخیری کی ادارت میں چھپتا تھا اور دوسرا "صوفی "رسالہ جس کے مالک و ایڈیٹر صوفی ملک محمد الدین اعوان تھے۔ یہ منڈی بہاؤالدین سے تواتر کے ساتھ چھپتا تھا۔ اس رسالے کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ اسے متحدہ ہندوستان کا سال کا کثیر الاشاعت رسالہ قرار دیا گیا۔ اس کے قلمی معاونین میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، نیاز فتح پوری، سید سلیمان ندوی، غلام قادر گرامی، سیماب اکبر آبادی، عبد الحلیم شرر، میر ولی اللہ، مولانا ظفر علی خان، جوش ملیح آبادی، مولانا حسرت موہانی، احمد ندیم قاسمی سید عابد علی عابد، یوسف سلیم چشتی، محمد دین تاثیر، عبد الماجد دریا آبادی، حجاب امتیاز علی اور مولانا عبد الحسن ندوی وغیرہ شامل ہیں۔
مقالہ نگار نے اپنے مقالے میں منڈی بہاؤالدین کا جغرافیائی نقشہ بھی کھینچا ہے، ان کے مطابق:

> " جہاں تک سرسبز، زرخیز اور قدرتی مناظر سے بھرپور ضلع منڈی بہاؤالدین کے حدود اربعہ اور محل و قوع کا تعلق ہے تو منڈی بہاؤالدین کے مشرق میں ضلع گجرات، مغرب میں ضلع سرگودھا، شمال میں ضلع جہلم اور جنوب میں ضلع حافظ آباد واقع ہیں۔ ضلع کا کل رقبہ ۲۶۷۳ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کی تین تحصیلیں، تحصیل پھالیہ، تحصیل ملکوال، تحصیل منڈ بہاؤالدین ہیں"۔(8)

عامر اقبال کا مربوط و مبسوط کردہ مقالہ "منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کا ارتقا: تحقیقی و تنقیدی جائزہ" پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے باب میں منڈی بہاؤالدین کے تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، تعلیمی، مذہبی، معاشی، سیاسی اور ادبی پس منظر کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں منڈی بہاؤالدین میں اردو شاعری کے ارتقا پر بحث کی گئی ہے جس میں نظم، غزل، حمد، نعت، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مرثیہ، منقبت اور مثنوی کے خدو خال واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں عامر اقبال نے منڈی بہاؤالدین میں اردو نثر کے ارتقاء کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان اصناف میں نثر، ناول، افسانہ، ڈرامہ، داستان، سفر نامہ نگاری، سوانح نگاری اور تاریخ نگاری جیسی اصناف ادب کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ باب چہارم میں منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کے ارتقا میں مختلف رسائل و جرائد، روز نامہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ رسائل کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ باب پنجم میں منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کا مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے ابواب اور ماحصل کے بعد کتابیات کو موضوعات کے اعتبار سے علیحدہ کیا ہے جن میں تحقیق و تنقید کے موضوعات کی کتب، تاریخی کتب، شعری مجموعے اور رسائل و جرائد وغیرہ شامل ہیں۔

موضوع مقالہ: "اختر ہوشیار پوری: احوال و آثار"

مقالہ نگار: وجیہہ شاہین ،۲۰۱۷ء

نگران مقالہ: نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد وسیم انجم، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

اختر ہوشیار پوری نے غزل میں ایک خاص اسلوب کی طرح ڈالی۔ وہ بنیادی طور پر غزل گو تھے تاہم انہوں نے نعت، مرثیہ، ہائیکو اور نظموں میں بھی گراں قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ "اختر ہوشیار پوری: احوال و آثار" کو مقالہ نگار وجہیہ شاہین نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل "اختر ہوشیار پوری کی داستانِ حیات" کے عنوان سے ہے جس میں ان کے خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، عملی زندگی کا آغاز، ادبی زندگی کا آغاز، ادبی سرگرمیاں، تصانیف، ادبی خدمات و اعزازات کے بارے بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے اختر ہوشیار پوری کی شخصیت و فن پر مختلف ادبا و شعرا کی آرا بھی پیش کی ہے۔ باب دوم "اختر ہوشیار پوری بحیثیت غزل گو" کے عنوان سے ہے۔ جس میں اختر ہوشیار پوری کی غزل کے فکر و فن، اختر ہوشیار پوری کی غزل کا اسلوب، اختر ہوشیار پوری معاصرین کی نظر میں اور غزل گوئی میں مقام و مرتبہ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ وجہیہ شاہین اُن کی غزل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"اختر ہوشیار پوری کی شاعری میں داخلیت کا عنصر نمایاں ہے۔در حقیقت اختر ہوشیار پوری داخلیت کی آنکھ سے خارجیت کو دیکھتے ہیں۔اختر ہوشیار پوری ایک خاموش طبع اور تنہائی پسند آدمی تھے،اپنی ذات میں گم رہتے تھے۔سوچ وبچار کرتے رہتے تھے۔گویاخود کلامی کی کیفیت میں رہتے تھے"۔(9)

وجیہہ شاہین نے باب سوم کا"اختر ہوشیار پوری بحیثیت نعت گو" کے زیر عنوان ترتیب دیا ہے۔اس باب میں اختر ہوشیار پوری کی نعتیہ شاعری اور نعت گوئی میں اختر ہوشیار پوری کے مقام ومرتبہ کو زیر بحث لایا گیاہے۔ باب چہارم "اختر ہوشیار پوری کی دیگر ادبی خدمات" کے عنوان سے ہے جس میں اختر ہوشیار پوری کی شاعری میں مختلف تجربات، اختر ہوشیار پوری کی مرثیہ نگاری، ہائیکو نگاری اور نظم نگاری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔باب پنجم "اجمالی جائزہ" کے عنوان سے ہے۔ جس میں ابتدائی ابواب میں زیر بحث لائے گئے موضوعات کا مجموعی جائزہ لے کر محاکمہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور اس حوالے سے نتائج کو پیش کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "احمد فراز کی شاعری کا فنی اور اسلوبیاتی مطالعہ"

مقالہ نگار: محمد افضل صفی،2016ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

احمد فراز بیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں میں شعری منظر نامے پر ظاہر ہونے والے مقبول ترین شاعر ہیں۔ اُن کی نظم و غزل متنوع موضوعات کی حامل ہے۔ فراز کی شاعری میں زبان و بیان کی متنوع صورتیں ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کی غماز ہیں۔صنائع بدائع کا استعمال, تشبیہات و استعارات کا استعمال, الفاظ کی دروبست، تراکیب سازی وغیرہ میں وہ اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ محمد افضل صفی کے مقالے سے پہلے بھیاحمد فراز کے فکری موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا رہا ہے۔ تاہم مقالہ نگار کے مطابق انہوں نے کوشش کی ہے کہ فکر سے ہٹ کر احمد فراز کی شاعری کا فنی اور اسلوبیاتی مطالعہ پیش کیا جائے۔ انہوں نے اپنے مقالے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔باب اوّل: فن شاعری اور اسلوبیات کے مباحث، باب دوم: احمد فراز اور معاصر شعری منظر نامہ، باب سوم: احمد فراز کی شاعری کا علم بیان کی روشنی میں مطالعہ باب چہارم: احمد فراز کی شاعری کا بدیعی مطالعہ، باب پنجم: احمد فراز کی نظموں کا عروضی اور ہیئتی مطالعہ، باب ششم: احمد فراز کی

شاعری کا صرفی و نحوی مطالعہ ،باب ہفتم : احمد فراز کی شاعری کا صوتی مطالعہ : جبکہ باب ہشتم:احمد فراز کی شاعری کامعنیاتی مطالعہ "کے زیر عنوان ہے۔

پہلا باب: فن شاعری اور اسلوبیات کے مباحث پر مشتمل ہے۔اس باب کے پہلے حصے میں انہوں نے فن شعر کو زیر بحث لایا ہے، مثلاً شعر کیا ہوتا ہے اور اس کے فنی مباحث کیا ہیں۔ دوسرے حصے میں اسلوبیات کوزیر بحث لایا گیاہے۔اسلوبیات توضیحی لسانیات کی شاخ ہے۔اس میں اسلوب کالسانی مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ خصائص کا تجزیاتی اور معروضی سطح پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔دوسرے باب میں احمد فراز کے معاصر شعری منظر نامے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس عہد میں فراز میدان شعر میں جلوہ گر تھے اس عہد کی مجموعی صورت حال کیا تھی؟۔کون سے بنیادی رجحانات شعر وادب کو متاثر کر رہے تھے؟احمد فراز کے ہم عصر شعرا کس ڈگر پر چل رہے تھے اور فراز نے اپنی انفرادیت کیسے متعین کی؟۔ یہ وہ نکات ہیں جو باب دوم میں پیش کیے گئے۔اس ضمن میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"احمد فراز ایک خاص نظریے کے پابند تھے۔انہوں نے مزاحمت اور رومان کو ملا کر اپنی نظریاتی ساتھ کا ثبوت دیا۔فراز کی نظم"طلسم ہوشربا" ہی دیکھ لیں،دومالائی اور اساطیری انداز کے باوجود ان کے نظریے سے اہم ہے"۔(10)

مقالے نگار نے تیسرے باب میں فراز کی شاعری کا علم بیان کی روشنی میں مطالعہ پیش کیا ہے۔فراز نے تشبیہات و استعارات میں کیا کیا صورتیں پیش کیں اور علامت مجاز مرسل اور کنائے کا کیسے استعمال کیا،اس باب کے نمایاں موضوعات ہین۔چوتھے باب میں احمد فراز کی شاعری کابدیعی مطالعہ پیش کیا گیاہے۔ احمد فراز نے صنائع بدائع کا استعمال کیسے کیا۔کون کون سی صنائع لفظی و معنوی کوشاعری میں برتا نیز صنائع بدائع کے استعمال نے فراز کی شاعری میں کیا کردار ادا کیا۔مقالہ نگار محمد افضل صفی کے مطابق:

"احمد فراز کی شاعر میں مراعاۃ النظیر کے خوبصورت نمونے موجود ہیں۔احمد فراز مراعاۃ نظیر کے ذریعے کسی بھی امر واقع کی ایسی مجموعی تشکیل بندی کرتا ہے کہ اس صنعت کی بدولت ان اشعار کی بصری تشکیل متشکل ہو جاتی ہے۔اس سے محاکاتی انداز پیدا ہوتا ہے اور معنوی تفہیم میں آسانی ہو جاتی ہے۔مزید یہ کہ موضوع کی مجموعی تصویر ابھر کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے"۔(11)

مقالہ نگار نے پانچویں باب میں احمد فراز کی نظموں کا عروضی اور ہیتی مطالعہ پیش کیا گیاہے۔اس باب کے دوحصے ہیں۔پہلے حصے میں عروضی مطالعہ پیش کیا گیاہے کہ فراز نے کون کون سی بحریں استعمال کیں۔

دوسرے حصے میں ہئیتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے کہ فراز نے ہیئت کے کیا کیا تجربات کیے۔ چھٹے باب میں احمد فراز کی شاعری کا صرفی و نحوی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں صرف و نحو کے مختصر تعارف کے بعد احمد فراز کی غزلوں نظموں کا صرفی و نحوی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ فاعل فعل ، مفعول کی تقدیم و تاخیر ، تراکیب و مرکبات سازی اور صرف و نحو کی دیگر صورتوں پر بات کی گئی ہے۔ ساتویں باب میں احمد فراز کی شاعری کا صوتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ فراز کی شاعری میں موجود مختلف مصمتوں مصوتوں کو زیر بحث لایا گیا۔ صوتی انتخاب و انحراف کے ساتھ ساتھ طویل و مختصر مصوتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں احمد فراز کی شاعری کا معنیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے کہ فراز کے ہاں لفظ و معنی کی کیا صورتیں نکلتی ہیں۔ مختلف حالات میں لفظ و معنی میں کیسے تغیر و تبدیل رونما ہوتا رہتا ہے۔ فراز نے الفاظ کو نئی معنویت میں کیسے برتا ہے یہ تمام موضوعات اس باب کا حصہ ہیں۔ آخر میں ماحصل کے عنوان سے مقالے کا خلاصہ بھی مقالہ نگار کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے واضح ہوتا کہ مقالہ نگار نے اجمال سے کام لیا ہے۔ ناقدین و محققین کی آراسے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے حسب ضرورت شعری مثالیں اور اقتباسات درج کیے جبکہ غیر ضروری اقتباسات اور مثالوں سے گریز کیا ہے۔

موضوع مقالہ: " جدید ادبی تناظر میں ناصر شہزاد کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"

مقالہ نگار: ناصر محمود، 2017ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

اُردو شاعری نے انجذاب و قبول کی کئی صورتوں اور رویوں کو اپنے دامن میں پناہ دی ہے۔ فکری کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے انداز بیاں، اسلوب اور ہیئت کے جو تجربے ہوئے، ان کی انسانی زندگی میں بہت اہمیت ہے۔ یہ معاشرے کی بدلتی ہوئی جذباتی زندگی کی پیداوار ہیں اور انہوں نے خود زندگی کے اُن پہلوؤں کو متاثر کیا۔ ان کے لئے نئی راہیں نکالیں اور نئے میدان تلاش کیے، اس طرح شاعری نے زندگی اور زندگی نے شاعری کو بدلا۔ یوں زندگی بھی ایک نئے راستے پر گامزن رہی اور شاعری نے بھی ہر دور میں نئی منزلوں کا سفر جاری رکھا۔ یہی جدت پسندی ہے جس کی روایت اُردو شاعری میں بہت پرانی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعری کی ہر صنف نے ہر زمانے میں اپنے آپ کو بدلا ہے اور اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے کہ وہ ہر دور میں جدت سے ہم کنار رہی اور اس کا ہر دور، دوسرے دور کے مقابلے میں جدید نظر آتا ہے۔ ایک زمانے کے شاعر دوسرے

زمانے کے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ جدت پسند معلوم ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کے یہاں جدت کی ایک انقلابی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

"ناصر شہزاد" کی شاعری بھی جدت کے اسی رواں دھارے میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ اُن کی شاعری کی نوعیت بیک وقت تہذیبی، لسانی، تاریخی، تلمیحی، مذہبی واساطیری اور جغرافیائی ہے۔ اپنی شاعری میں انہوں نے علائم ورموز، تشبیہات و استعارات کو کھل کر قبول کیا ہے۔ ناصر شہزاد نے مقامی ماحول سے گہری رغبت اور برصغیر کی اجتماعی تہذیب سے جنم لینے والی تہذیبی و ثقافتی ضرورت کے تحت صدیوں پرانے تہذیبی خیالات کو نئے معنی و مفہوم سے آشنا کرنے کیلئے لسانی اجتہاد کیا ہے اور زباں وبیاں کے حوالے سے غزل میں اپنی منفرد "ڈکشن" اور اسلوب متعارف کرایا ہے۔ یہ گیت رنگ غزلیں اگر ایک طرف برصغیر کی اجتماعی تہذیب کی آواز بنی ہیں تو دوسری طرف ناصر شہزاد نے ان شعری تجربات سے نئی غزل کے خدوخال متعین کرنے اور ان میں نئے موضوعات اور کئی رائج موضوعات اور رویوں کو نئے رنگ سے شامل کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی فکری وفنی ضرورت کے تحت بعض ایسے نئے لسانی پیرائے تراشے ہیں جو غزل کی قدیم روایت سے الگ اپنی ایک اجتہادی بنیاد رکھتے ہیں۔

گیت کی شکل میں بالخصوص ناصر شہزاد نے زندگی کے گوناگوں رنگوں، مختلف پہلوؤں اور متنوع موضوعات کی جلوہ ریزیاں بکھیر دی ہیں۔ انہوں نے موضوع کی حد تک ہی گیت کو ایک مزاج سے آشنا نہیں کیا بلکہ اس کی زبان اور اسلوب میں بھی جدت پیدا کی ہے۔ انہوں نے ہندی اور اُردو زبان کی آمیزش سے ایک ایسی کومل زبان کی بنیاد رکھی جو گیت کو نہ صرف جمنا تہذیب کا ہم مزاج بناتی ہے بلکہ ہندی کے کومل اور مترنم الفاظ کو بھی ساتھ لے کر چلتی ہے۔ انہوں نے گیت کی سرزمین کو نت نئی لفظیات کی آبیاری سے تروتازہ رکھا ہے۔ اُن کے ہاں جہاں گیت کے رنگ و آہنگ میں تنوع پیدا ہوا ہے وہاں گیت کا فکری کینوس بھی پھیلا ہے اور اس کا امکان بھی بڑھا ہے۔ علاوہ ازیں نظم نگاری میں انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی ہیں۔

ناصر شہزاد نے شاعری اور نثر دونوں سمتوں میں سفر کیا ہے۔ ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پختہ نثر نگاری اُن کی ادبی شخصیت کا دوسرا معتبر حوالہ ہے جو ادبی خطوط نگاری، دیباچہ نگاری اور مضمون نگاری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ نثر نگاری میں اُن کا ایک وقیع کارنامہ مجید امجد کی حیات اور شعری کائنات پر تحریر کردہ کتاب "کون دیس گیئو" ہے جو مجید امجد کے بارے میں سوانحی، شخصی، فکری وفنی معلومات اور ساہیوال کے دو دہائیوں پر محیط زرخیز ادبی دور کے تذکروں کی بدولت مجید امجد شناسی اور دبستانِ ساہیوال کی

ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہند ایرانی روایت، موسیقی سے دلچسپی اور ہندی زبان سے گہرے لگاؤ کی بدولت زبان کا جو حربہ انہوں نے شاعری میں استعمال کیا ہے اس سے ان کی نثر بھی مزین ہے۔ ناصر شہزاد کے فکر و فن کے سنجیدہ مطالعے کے بعد یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انہوں نے بہت جلدی جدت پسندی کو اپنا شعار بنایا۔ انہوں نے اوائل شاعری سے ہی نئے تصورات کے بیاں کے لئے نئے رنگ اور نئے زاویے ڈھونڈے۔ یہ تجربہ اپنے ساتھ نئے الفاظ اور تراکیب لایا جس سے اُن کے ہاں نئے موسم اور ایک نئی دنیا وجود میں آئی ہے۔ عصری تقاضوں کے اظہار نے ناصر شہزاد کے ہاں ایک نئی کروٹ لی ہے جس سے ان کے اشعار میں پرانی روایتیں نئے زمانوں کی ہواؤں میں محلول ہو کر آئی ہیں۔ یہ جدید رویے اُن کی رجحان سازی کے عکاس ہیں۔

" جدید ادبی تناظر میں ناصر شہزاد کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "ناصر شہزاد کے حوالے سے اہم تحقیقی کاوش ہے۔ناصر شہزاد کی ادبی خدمات پر مشتمل اس مقالے کو مقالہ نگار ناصر محمود نے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب "جدید اردو شاعری کا فکری و معنوی پس منظر " ہے جس میں جدید شاعری کی جملہ اصناف کا ناصر شہزاد تک عہد بہ عہد مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب " ناصر شہزاد۔ ایک تعارف " ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے اُن کی "سوانح ، شخصیت اور " جدید ادبی تناظر بحوالہ ساہیوال " کو شامل بحث کیا ہے۔ مقالہ نگار نے ناصر شہزاد کے اعزا و اقربا، مریدین، دوستوں اور معاصرین سے ذاتی گفتگو اور مختلف کتب اور رسائل کی روشنی میں اُن کا سوانحی اور شخصی حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ ساہیوال کی جملہ ادبی روایت جو مختلف مشاعروں، محافل اور تحریکوں کی صورت میں عہد بہ عہد تشکیل پاتی رہی ہے،اس کا بیان بھی ناصر محمود نے باب دوم کا حصہ بنایا ہے۔

زیر مطالعہ مقالے کے تیسرے باب کا عنوان "ناصر شہزاد کی تخلیقات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ " ہے۔ اس باب میں ناصر شہزاد کی شعری تخلیقات کا تحقیقی و تنقیدی تعارف دیا گیا ہے۔ مذکورہ مقالے کے مطالعاتی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر شہزاد کے پہلے اور دوسرے شعری مجموعے میں لگ بھگ چالیس سال کا وقفہ ہے۔ اِس دوران ان کا جملہ کلام برصغیر کے موقر رسائل و جرائد میں تواتر سے چھپتا رہا۔ مقالہ نگار نے ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے کلام کی تلاش کے بعد مطبوعہ تصانیف میں موجود کلام کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے متنی امتیازات و مماثلات شامل تحریر کیے ہیں۔ اس تقابل میں اُن کی متعدد قلمی تحریروں میں قطع و برید کی مختلف صورتوں کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔ چوتھا باب "ناصر شہزاد بحیثیت شاعر " ہے جس کے تین حصے

ہیں۔ پہلا حصہ " نظم نگاری " ہے جس میں ان کی نظمیہ شاعری بالخصوص سلام کے فکری و فنی جائزے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ " غزل گو " اور تیسرا حصہ " گیت نگار " میں اُن کی غزل " اور گیت کا فکری جائزہ لیا گیا ہے۔ ناصر شہزاد کی غزل کے بارے میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"ناصر شہزاد کی غزل کی جڑیں بڑی مضبوطی کے ساتھ دھرتی میں پیوست ہیں۔ اُن کی تہذیب کا دائرہ کار صرف اپنے ملک تک محدود نہی بلکہ اس کی اساس برصغیر کی صدیوں پرانی تہذیب ہے"۔(12)

ناصر محمود کے مربوط و مبسوط کیے گئے اس مقالے کا پانچواں باب "ناصر شہزاد بحیثیت نثر نگار" کے زیر عنوان ہے جس کے چار حصے بالترتیب " یاد نگار، مکتوب نگار، دیباچہ نگار اور " مضمون نگار "ہیں۔ اس باب میں ناصر شہزاد کو مجموعی طور پر بطور نثر نگار جانچنے کی سعی کی گئی ہے۔ چھٹا باب " ناصر شہزاد کی شاعری کے فکری و فنی اسالیب" کے نام سے ہے جس کے چھ حصے بالترتیب "ناصر شہزاد کی شاعری میں علامات کا نظام، ناصر شہزاد کی شاعری میں پیکر تراشی، ناصر شہزاد کی شاعری میں لفظیات کا نظام، ناصر شہزاد کی شاعری میں تراکیب کا نظام، ناصر شہزاد کی شاعری میں ہیئت کے تجربات اور " ناصر شہزاد کی شاعری میں بحور کے تجربات " شامل ہیں۔ ناصر شہزاد کی غزل اور گیت کے بیان میں ان کے فنی اسالیب نے کیسے رنگ بھرے ہیں۔ اس باب میں اس کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتوں اور آخری باب " حاصل مطالعہ " ہے جس میں مقالہ نگار نے ناصر شہزاد کو فکری و فنی حوالے سے ایک کلیت میں دیکھنے کے بعد اُردو ادب میں اُن کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔

موضوع مقالہ: " اُردو-پشتو اور پشتو-اُردو لغات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ "

مقالہ نگار: علی شیر، 2021ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر ولی محمد، جامعہ پشاور، پشاور

خالق کائنات نے انسانوں کو قوت گویائی عطا کی اور انہیں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کا وسیلہ زبان کی صورت میں عطا کیا۔ ابتدا میں انسان کو اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ذریعوں سے کام لینا پڑا اور وہ ہاتھوں کے اشاروں یا زمین پر کوئی نقش بنا کر دلی کیفیات، مشاہدات اور تجربات کی ترسیل کا کام لیتا۔ لیکن وہ اشارے ناکافی اور وہ نقوش مبہم تھے جس کے ذریعے سے کلی حقیقت تک رسائی مشکل تھی۔ گویا انسان کو

ابتدا سے ہی لفظ کی تلاش رہی اور جب لفظ ایجاد ہوا تو دنیا کے تمام حقائق سے آگاہی میں مدد ملی۔ اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ لفظ اپنے ارتقائی صورت میں اپنے آپ کو نکھارتا گیا جس سے زبان کی ستھرائی عمل میں آئی۔ زبان کی ستھرائی اور کانٹ چھانٹ کے سلسلے میں ترک و قبول کے مرحلے سے دنیا کی ہر زبان کو گزرنا پڑا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان متروک الفاظ کی ساخت کو پرکھنے اور الفاظ کے مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی ضرورت نے "لغت نگاری" کو رواج دیا جس میں الفاظ کی پوری ارتقائی صورت موجود ہوتی ہے اور وہ الفاظ کو سمجھنے میں مدد و معاون بھی ثابت ہوتی ہے۔

لغت نگاری جس قدر دلچسپ ہے اس قدر ایک مشکل کام بھی ہے جس کی تعمیل فرد واحد کو بہت سی مشکلات سے دوچار کر دیتی ہے۔ لیکن صاحب ذوق افراد نے نہ صرف یک لسانی بلکہ ذولسانی لغات کی تدوین میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ زیر مطالعہ مقالہ بھی اُردو۔ پشتو اور پشتو۔ اُردو کے ذولسانی لغات کا تحقیقی مطالعہ ہے جس میں ذولسانی لغات کی تاریخ، ضرورت اور اہمیت پر بات کی گئی ہے۔

مقالہ نگار علی شیر کا تحریر کردہ یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں لغت کا تعارف، لغت اور انسائیکلوپیڈیا میں فرق اور لغت نویسی کی صورتوں پر بحث کی گئی ہے، اس کے علاوہ ذولسانی لغات کی اہمیت اور اُردو کے حوالے سے پاکستان میں ذولسانی لغت نگاری کی ابتدا اور اس کے ارتقائی سفر پر بات کی گئی ہے، جن میں پشتو اردو، اُردو پشتو، اُردو کشمیری، پنجابی اُردو، بلوچی اُردو، اُردو بلوچی، سرائیکی اُردو، اُردو سرائیکی، ہندکو اُردو، اُردو براہوی، اُردو بلتی، کھوار اُردو لغت، بروشکی اُردو لغت اور توروالائی اُردو لغت شامل ہیں۔ مقالے کے باب دوم میں مقالہ نگار کی طرف سے ذولسانی لغات کے فنی اُصولوں کو زیر غور لایا گیا ہے، جن میں بنیادی اُصول، نصب العین اور دائرہ کار کا تعین، مخففاتی اور صفحاتی فہرستیں، دونوں زبانوں کے حروف تہجی سے واقفیت، متشابہ الفاظ و اعراب اور تلفظ کے مسائل پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لسانیات اور لغت کے باہمی تعلق، لغت نگاری میں لسانیات کے علم سے شناسائی، تعین الفاظ، ترتیب الفاظ، لسانی ماخذ کا تعین، درست تلفظ، رسم الخط، لفظ کی املائی صورت، قواعدی حیثیت کا تعین، وضاحت معنی، شواہد معنی، مرکبات کا تعین واندراج، حروف شمسی و قمری، عوامی تصرفات اور رموزِ او قاف کی لغت میں ترتیب اور استعمال پر بحث اس باب کے مباحث میں شامل ہیں۔

باب سوم میں "اُردو۔ پشتو لغات" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، اسی طرح ذولسانی لغت نگاری کے فنی تقاضوں کے تناظر میں بہادر شاہ ظفر کاکاخیل کی " ظفر اللغات، قلندر مومند کی "دریاب" اس کے

ساتھ ساتھ "تاج اللغات"، انوار الحق کی "اردو پشتو لغت" اور خاطر مانیر وال کی "اردو پشتو لغات" پر فنی اصولوں کے تناظر میں بات کی گئی ہے۔ باب چہارم میں پشتو۔ اُردو لغت نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ فنی اُصولوں کے تناظر میں لیا گیا ہے جس میں دونوں زبانوں کے اولین لغت نگار قاضی خیر اللہ پادری کی "خیر اللغات"، سید راحت اللہ زاخیلی کی "لغات افغانی"، امتیاز علی عرشی کی تصنیف "اُردو میں پشتو کا حصہ"، انوار الحق کی کاوش "دیوان کاظم علی خان"، بہادر شاہ ظفر کاکاخیل کی "ظفر اللغات" اور حاجی پر دل خان خٹک کی "پشتو اردو لغت" کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح ان تمام لغات کا اُصولِ لغت کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی تحقیقی مطالعہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار علی شیر معیاری لغت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایک اچھی اور معیاری لغت کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے لفظ کا اندراج کر کے پھر اس کے لسانی ماخذ، اس لفظ کی قواعدی نوعیت کی مکمل تفصیل، معنی کے طور پر پھر اس لفظ کے مترادفات ترتیب سے یعنی آسان مترادف پہلے اور مشکل بعد میں۔ اس کے بعد اس لفظ کا مفہوم اور اگر ہو سکے تو اس لفظ کی مزید وضاحت کے لیے مستند شعرا کے کلام سے سند کے طور پر اشعار یا نثر سے مثالیں درج کرنا۔"(13)

باب پنجم میں مقالہ نگار نے آغاز سے لے کر مقالے کی تسوید تک کے مدون شدہ ذو لسانی لغات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے جن میں اُردو۔ پشتو اور پشتو۔ اُردو کے دستیاب ذو لسانی لغات پر تفصیلی بحث کی گئی اور ان کا باہمی موازنہ کر کے لغت کے معیارات، اصول اور قواعد سامنے لائے گئے ہیں۔ اُردو۔ پشتو اور پشتو۔ اُردو تمام لغات کا مقام و مرتبہ متعین کرنا بھی اس باب کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ باب ششم اُن کے مقالے کا آخری باب ہے جس میں دونوں زبانوں کے لغات کے تفصیلی جائزے کی روشنی میں نتائج کا استنباط کیا گیا ہے۔

موضوعِ مقالہ: " ترقی پسند تحریک کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "

مقالہ نگار: حامد اقبال بٹ، 2011ء

نگرانِ مقالہ: محمد خان اشرف، جی سی یونیورسٹی، لاہور

علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس کے زیر اثر اُردو ادب کو بعض بڑی اہم تبدیلیوں سے دو چار ہونا پڑا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے شاعری اور افسانے کی طرح تنقید

کے سرمائے میں بھی نمایاں اضافہ کیا۔ ترقی پسند ناقدین نے ادبی تنقید کو اس طلسم سے باہر نکالنے کی کوشش کی جو تاثراتی، رومانی اور ماورائی نقطہ نظر کے پردے میں پنہاں تھی۔ اس نے ادب کو تاریخی، سماجی اور عمرانی پس منظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور ادب کو سماجی مقاصد کا تابع بنا کر ایسے تنقیدی شعور کو پروان چڑھایا جو اپنے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ ترقی پسند تنقید کے نظریاتی ارتقا اور عہد بعہد تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان اعتراضات کا تجزیہ ضروری تھا جو سیاسی، سماجی لسانی اور روایت پرستی کے حوالے سے کیے گئے تھے، کیونکہ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ اعتراضات تقسیم ہندوستان کے بعد حقیقی آزادی اور آزادی موہوم کی بحث کے ساتھ ساتھ شیر و شکر ہوتے چلے گئے جو ہر قسم کے نظریہ اور نظریہ سازی کے خلاف تھے اور انسانوں کی آزادی کے لیے نظریات کی عمل داری کو غیر مذہب اور انسان کش رویہ سمجھتے تھے۔ اس سوچ پر عمل کرتے ہوئے مقالہ نگار حامد اقبابٹ نے " ترقی پسند تحریک کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ " کے زیر عنوان تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے۔

اُن کا تحریر کردہ یہ مقالہ پانچ ابواب اور اختتامیہ پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انہوں نے اردو میں تنقیدی تصورات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ جس میں تذکروں کی تنقید سے لے کر حالی، شبلی اور آزاد کی تنقید پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس باب میں حالی، شبلی اور آزاد کی تنقیدی نگارشات میں سے ترقی پسند انتقادی تصورات کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ سچا ترقی پسند وہ ہے جو حالات کی تبدیلی کو محسوس کرے اور ان قوتوں کی ماہیت کو سمجھے جو جماعت اور فرد پر اثر انداز ہو رہی ہیں اور یہ خصوصیات حالی، شبلی اور آزاد میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ دوسرا باب "برصغیر میں ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا" کے حوالے سے ہے۔ جس میں ترقی پسند تحریک کو ہندوستان کے سماجی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں دیکھا گیا ہے اور اس تحریک کے زیر اثر ادبی اصناف میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

" ترقی پسند تحریک کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ "کا تیسرا باب ترقی پسند تنقید کی فکری اساس سے متعلق ہے۔ چونکہ ترقی پسند تحریک ۱۹۴۹ء کے منشور میں تبدیلی کی وجہ سے اشتراکیت کی طرف مڑ چکی تھی اس لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ اُن فکری رجحانات کا پتہ لگایا جائے جس نے اشتراکیت کو جنم دیا اور ترقی پسند تحریک کو متاثر کیا، اس لیے اس باب میں "مارکسی فکر" کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور روسی ادب کا ایک اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ "نمائندہ ترقی پسند ناقدین" کا خصوصی مطالعہ اس مقالے کا سب سے اہم اور ضخامت پر مبنی باب ہے جس میں سولہ مقالہ نگار حامد اقبال بٹ نے نمائندہ ترقی پسند ناقدین کا نہ صرف تنقیدی و تحقیقی

تجزیہ کیا ہے بلکہ ہر نقاد کے فکری رجحانات تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ان ناقدین میں "اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، علی سردار جعفری، سجاد ظہیر، ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین، احمد علی، آل احمد سرور عزیز احمد ظہیر کاشمیری محمد صفدر میر، اصغر علی انجنیئر، قمر رئیس، خلیل الرحمان اعظمی اور محمد علی صدیقی کے نام شامل ہیں۔احتشام حسین کی تنقید نگاری پر بات کرتے ہوئے مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

"احتشام حسین اپنے مباحث اور نظریات کو حرفِ آخر کی شکل میں پیش نہیں کرتے بلکہ ان کی دیدہ دری اور ژرف بینی نئے آنے والوں کے لیے ادب کے مطالعہ کا راستہ کھولتی ہے"(14)

"ترقی پسند ادب پر اعتراضات اور اُن کا تجزیہ "زیر مطالعہ مقالے کا پانچواں باب ہے جس میں مقالہ نگار نے اُن اعتراضات کو شامل کیا ہے جو ترقی پسند ادب پر مختلف اوقات میں ہوتے رہے ہیں، نہ کہ اُن کو موضوع بحث بنایا ہے جو ترقی پسندوں نے ادب کے حوالے سے کیے ۔ "اختتامیہ" میں مختصراً ان حقائق کو بیان کیا گیا ہے جو تحقیق سے مقالہ نگار کے سامنے آئے ہیں۔

موضوع مقالہ: " جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار "

مقالہ نگار: شہناز اختر، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شائستہ حمید، جی سی یونیورسٹی، لاہور

شبیر حسن خان جن کا ادبی نام جوش ملیح آبادی ہے اپنے دور کا ایک معتبر نام ہے۔جوش بیسویں صدی کے اردو شعرا میں ایک قد آور شاعر کے طور پر ابھرے۔ ان کی شعری بلند قامتی نے ان کی نثر نگاری کو سامنے نہ آنے دیا۔ لیکن جہاں ان کی شاعری میں بے شمار خوبیاں موجود ہیں وہیں ان کی نثر بھی ان تمام نثری خصوصیات سے آراستہ ہے جو عمدہ نثر کا خاصہ ہوتی ہیں۔ ان کی نثر کی جادوگری قاری کو کسی اور سمت متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ ان کی شاعری اگر ایک گلدستے کی مانند ہے تو ان کی نثر سبدِ گل فروش ہے جہاں ان کی شاعری پر سینکڑوں مضامین تحریر کیے گئے ہیں وہیں ان کی نثر پر لکھے جانے والے مضامین کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جوش کی نثر نگاری کی مختلف جہتوں کو اس مقالے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ بحیثیت نثر نگار جوش کا مقام و مرتبہ متعین کیا جا سکے۔

" جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار " میں مقالہ نگار شہناز اختر نے جوش ملیح آبادی کی "خطوط نویسی، مقالہ نگاری، تنقید نگاری، ترجمہ نگاری، کالم نگاری، لغت نویسی، مصاحبے، تقریظیں، تنقید نگاری، پیش

لفظ اور سب سے بڑھ کر "آپ بیتی نگاری" میں جوش کی نثر کی رنگین بیانی، شوخ گفتاری، فطرت نگاری، فصاحت و بلاغت، روز مرہ و محاورہ، مترادف و متضاد کا استعمال، عربی و فارسی تراکیب کا بر محل استعمال اور جرات و بے باکی کو بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں جوش کی شاعری کے مختلف پہلوؤں یعنی مرثیہ نگاری، رباعی و قطعہ نگاری، انقلابی، سیاسی و رومانی شاعری پر بھی اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول "جوش کے آباؤاجداد، حالات زندگی، وفات،، جوش کے شخصیت و کردار، جوش کا ادبی سرمایہ، جوش اور اس کے عہد" کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ باب دوم "آپ بیتی کا فن" کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مقالہ نگار نے اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے خود نوشت سوانح کی مختلف اقسام کو بھی بیان کیا ہے جن میں "مذہبی خود نوشت سوانح، تاریخی خود نوشت سوانح، سیاسی و سماجی خود نوشت سوانح، افسانوی خود نوشت سوانح اور ادبی و فکری خود نوشت سوانح" شامل ہیں۔ باب سوم کا عنوان "مقالہ نگاری" ہے۔ اس باب میں اردو ادب میں مقالہ نگاری کی روایت جا اجمالی جائزہ لینے کے بعد جوش ملیح آبادی کی مقالہ نگاری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس ضمن میں مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

> "طلوع سحر ایک ایسا مضمون ہے جس میں جوش نے منظر نگاری کے ذریعے قاری کو اس تجربے میں اپنے ساتھ شامل کیا ہے جو انہیں ہر روز صبح صادق کے وقت حاصل ہوتا ہے۔ ان کے ہاں جلال و جمال کی دلکش کیفیات ملتی ہیں۔ ٹیگور سے اثر پزیری اس مجموعے میں جگہ جگہ جھانکتی نظر آتی ہے"۔(15)

مقالہ نگار نے اپنے مقالے کے باب چہارم میں "خطوط نویسی" کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں وہ بتاتا ہیں کہ خطوں میں انسان کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ جنہیں ہم متکبر سمجھتے ہیں خطوں میں ان کے چہرے کی سادگی اور معصومیت دکھائی دیتی ہے۔ اس باب میں انہوں نے اردو خطوط نویسی کی ابتدا کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں۔ ہندوستان میں خطوط نویسی کے آغاز کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ ہندستان میں خطوط نویسی مغلیہ دور میں شروع ہوئی۔ مغلوں نے پیغام رسانی کے لیے "دیوان البرید" کے نام سے ایک محکمہ بھی قائم کیا تھا جہاں سے ڈاک گاڑیوں کے ذریے سے پیغام رسانی کی جاتی تھی۔ اس باب کا خاص اہم نمایاں موضوع "جوش ملیح آبادی کی خطوط نویسی" ہے۔ جوش کی خطوط نویسی کے بارے میں مقالہ نگار تحریر کرتے ہیں ہ جوش کثیر الاحباب شخص تھے۔ انہین خط لکھنا پسند تھا۔ اُن کے ددستوں

کی ایک طویل فہرست ہے جن کے نام جوش کے خطوط موجود ہیں۔جوش کے خطوط کو محققین و مدونین نے مرتب بھی کیا ہے۔ڈ کٹر سید صفدر حسین ملک نے "نقد اخلاص" کے نام سے جوش کے خطوط مرتب کیے۔ خلیق انجم نے "جوش بنام ساغر" اور "جوش کے خطوط" مرتب کیے۔ باب پنجم " متفرقات " پر مشتمل ہے۔اس باب میں شہنا زختر نے جوش کی خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری، تنقید نگاری، کالم نویسی، لغت نویسی، محاورات جوش، جوش کی اصلاحات، جوش کی رباعی نگاری اور قطعہ نگاری کو زیر بحث لایا گیا ہے۔" محاکمہ " بھی اس مقالے کا حصہ ہے جس میں سابقہ ابواب میں کی گئی تحقیقی کاوش کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: " ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی کی علمی و ادبی خدمات "

مقالہ نگار: نائلہ عبدالکریم، 2018ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر محمد وسیم انجم، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی ایک ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے علمی و ادبی اعتبار سے ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا، وہ نہ صرف ایک اقبال شناس شخصیت ہیں بلکہ شارح اقبال بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی کاوشیں ادبی اعتبار سے ہر زاویے پر محیط ہیں۔ تراجم اور شرح ان کے اہم کارنامے ہیں، طنزیہ و مزاحیہ نثر و شاعری کا ایک قابل قدر ذخیرہ ان کے قلم سے نکلا۔ انہوں نے بطور مورخ اور سوانح نگار بھی اپنا کردار خوب نبھایا۔ ان کی علمی کاوشوں میں سعدی کی "گلستان " اور " بوستان" کے اردو تراجم بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ان کی علمی سنجیدگی ان کی ہر تحریر سے عیاں ہے۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی نامور ادیب، بلند پایہ اور اچھے مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شارح کلام غالب (فارسی) بھی ہیں۔ اس کے علاوہ متنوع موضوعات پر ان کے مضامین کمیت میں بھی کم نہیں اور کیفیت میں بھی بڑے جاندار، جاذب اور جادو اثر ہیں ۔ انہوں نے فارسی اور اردو ادب کا فکری مطالعہ جن خطوط پر کیا ہے وہ دوسروں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ منفرد بھی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی انفرادیت ان کی شرح کلام غالب (فارسی)، فارسی افسانوں اور مضامین کے اردو تراجم کی ترجمان ہے۔ ان کا الگ نوعیت کا اسلوب، اظہار کی جدت اور سلاست کا ضامن بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین فارسی ادب کا اچھا منظر نامہ تخلیق کرتے ہیں۔ انہوں نے طویل مضامین بھی لکھے اور مختصر بھی۔ مگر ہر مضمون میں ان کی انفرادیت قاری کو ان کے علمی و ادبی سحر میں مبتلا کر دیتی ہے جس سے ان کا قاری علم و دانش کی وادیوں

کا مکیں بن جاتا ہے۔ ان کی علمی جامعیت اور فکری پہلو داری طلسمات خیال کو گنجینہ معنی کے پس منظر میں اجاگر کرتی ہے۔

مقالہ نگار نائلہ عبد الکریم کے مطابق ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی نے اردو اور فارسی کے اردو تراجم کے حوالے سے جو خدمات انجام دیں۔ مذکورہ مقالے میں ان کا محاسبہ تحقیق و تنقید سے کیا گیا ہے تاکہ مقالے کی اہمیت میں اضافہ ہو۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی ادب کی قد آور شخصیت ہیں، اُن کی مطبوعات کافی متنوع ہیں۔ ان کی ادبی شناخت اقبال شناسی و مترجم کی حیثیت سے مستند ہے۔ کلاسیکی ادب میں بھی آپ کی شخصیت اور ادبی کارنامے کثیر الجہات ہیں۔ مقالہ نگار اس مقالے کی تسوید کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی پر مقالہ لکھنے کا خیال مجھے ان کی "اردو شرح غالب و اقبال" دیکھ کر آیا۔ غالب و اقبال کے حوالے سے ان کا کام اردو ادب کی بڑی خدمت ہے اور یہی خدمت ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی متنوع شخصیت پر کام کرنے کے لیے مہمیز ثابت ہوئی"۔(16)

مقالہ نگار نائلہ عبد الکریم کا مربوط و مبسوط کردہ مقالہ بعنوان" ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی علمی و ادبی خدمات "چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول "ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی سوانح" میں خاندانی پس منظر، پیدائش، بچپن، تعلیم ، ملازمت، ازدواجی زندگی، ادبی زندگی اور اعزازات پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی زندگی کے اتار چڑھاؤ، قربانیوں، علمی و ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لیا جاسکے کہ انہیں زندگی کا اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے کس دوراہے سے گزرنا پڑا۔ کیا انہوں نے اپنی علمی و ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ زندگی کی باقی ذمہ داریاں بھی باحسن نبھائیں یا ان سے کنارہ کشی اختیار کی۔ ان کے خاندانی پس منظر میں اس علاقے کا تعارف بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس علاقے کو جنت نظر کہا جاتا ہے۔ تقسیم ہندوستان کے پس منظر میں آج یہ خوبصورت خطہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ پاکستانی کشمیر (آزاد کشمیر) ہو یا مقبوضہ کشمیر دونوں طرف خوبصورت جھیلیں آئینوں کی طرح چمکتی ہیں۔ اس طرح اس کے خوبصورت شہروں اور قصبوں کو دنیا کے کسی بھی خوبصورت شہر اور قصبے کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر کے گھنے جنگلوں، پیڑوں، پھلوں ، سرسبز پہاڑوں، پانی سے چھلکتے دریاؤں اور خوبصورت وادیوں نے مل کر اسے ایسا حسن بخشا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ جیسے بہشت آسمان سے زمین پر اتر آئی ہو۔

کشمیر کی جغرافیائی خوبصورتی بیان کرنے کا مقصد مقالہ نگار نے یہ بتایا ہے کہ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ پھر یہ خاندان ہجرت کر کے ہندوستان کے شہر امر تسر میں آباد ہوا۔ امر تسر کا مختصر تعارف اور اس سے منسوب اہم واقعات بھی اس باب کا حصہ ہیں۔ نیز ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی موسیقی سے دلچسپی کے باعث موسیقی کے گھرانے، خاص موسیقاروں کا ذکر، امر تسر کے خاص ادیبوں، بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں کے خاص قلم کاروں کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کے مشاغل کا ذکر، اس وقت کے معاشرتی رجحان کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ تعلیم اور ملازمت میں ان کے اساتذہ کرام کا کردار، مسلم لیگ کے جلسوں میں شرکت کے حوالے سے ان کا آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ازدواجی زندگی کے حوالے سے ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی زوجہ محترمہ کے تاثرات اور ان کے بچوں کے نام معہ تعلیمی کارکردگی و پیشہ وارانہ سرگرمیوں کا ذکر بھی اس مقالے کے اہم موضوعات میں شامل ہے۔

ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی وہ ادبی شخصیت ہیں جن سے ایک صحت مند گھرانہ پروان چڑھا۔ اسی طرح وہ ازدواجی زندگی کے بعد ادبی زندگی میں کامیاب و کامران رہے، انہوں نے علمی و ادبی میدان میں اپنے باصلاحیت و باکمال ہونے کے باعث اعزازات و انعامات بھی حاصل کیے۔ ان کی شخصیت کے حوالے سے بیوی، اولاد، اساتذہ، شاگردوں، ہم عصر اور رفقا کی رائے شامل کرنے سے ان کے غیر معروف و پنہاں پہلوؤں سے بھی آشنائی حاصل ہوئی ہے۔ مطبوعات کے تعارف سے ان کی علمی و ادبی خدمات کا علم ہوا ہے۔

باب دوم میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کو "بطور نقاد" زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس میں اُن کی تنقیدی تصنیف "ذکر رسول....... مثنوی رومی میں" کا جائزہ پیش کیا گیا ہے تاکہ اردو ادب میں ان کی تنقیدی خدمت کو سمجھا جاسکے۔ باب کے آخر میں تجزیہ ہے جس میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی تنقیدی خدمت کا نچوڑ شامل ہے۔ باب سوم ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی تحقیقی خدمات سے متعلق ہے۔ اس باب کے آغاز میں تحقیق کی روایت، تحقیق کے معانی، تحقیق کی تعریف قرآن و حدیث کی روشنی میں اور ادبی حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ نیز اردو ادبیات میں تحقیق کے تحت ان شخصیات کا ذکر بھی شامل کیا گیا ہے جن کے بغیر تحقیق کی روایت کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ ان معتبر شخصیات میں " سر سید احمد خان، چراغ علی، مولانا شبلی نعمانی، نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ کا ذکر ہے۔ اسی طرح دبستان تحقیق کے تحت دبستان دکن اور دبستان لاہور کی تحقیقی کاوشوں کا تعین کیا گیا ہے تاکہ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی بطور محقق اور تحقیقی نگارشات کا جائزہ لیا جاسکے۔ ان کی تحقیقی کاوشوں میں "خواجہ میر درد کی فارسی شاعری، فارسی

شاعری میں طنز و مزاح (از آغاز تا حافظ)" اور "کشمیر کی فروخت" قابل قدر تحقیقی نگارشات ہیں۔ جن کے عنوانات اور ذیلی عنوانات پر بحث کے بعد ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی تحقیق کے نتائج دلیل سے اخذ کیے گئے ہیں۔

زیر مطالعہ مقالے کے باب چہارم کا عنوان "اقبال شناسی کی روایت اور ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی بطور اقبال شناس اور شارح اقبال" ہے۔ یہ باب اقبال شناسی کی روایت کے تحت شرح کا مفہوم، شرح کی ضرورت و اہمیت، عربی ادبیات میں شرح، فارسی ادبیات میں شرح اردو ادبیات میں شرح، اردو ادبیات میں شارح، اقبالیات میں شارح پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ باب چہارم میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی بطور شارح اقبال اور ان کی شروحات کلام اقبال اردو و فارسی) کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ شروحات کلام اقبال میں مطالب ارمغان حجاز (اردو)، شرح ارمغان حجاز (فارسی)، شرح ضرب کلیم، شرح اسرار و رموز، شرح زبور عجم، شرح بانگ درا، شرح پیام مشرق، شرح مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر، شرح جاوید نامہ، شرح بال جبریل شامل ہے۔ باب کے آخر میں مقالہ نگار کی طرف سے تجزیہ بھی لکھا گیا ہے جس میں پورے باب کا جائزہ شامل ہے۔

باب پنجم میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کا بطور سوانح نگار، مؤرخ اور طنز و مزاح نگار جائزہ لیا گیا ہے۔ آغاز میں سوانح اور خود نوشت سوانح نگاری میں فرق، خود نوشت سوانح عمری کی روایت، آپ بیتیوں کے تراجم "میں ہوں تیمور" آپ بیتی اور ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی سوانح نگاری کا جائزہ لینے کے بعد پورے عنوان کے چیدہ چیدہ محاسن کا محاکمہ بھی دائرہ تحریر میں لایا گیا ہے، اس میں سوانح نگاری کے آغاز سے لے کر ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی سوانح نگاری تک سب ہی کچھ شامل ہے۔ اسی باب کا دوسرا عنوان تاریخ نگاری ہے جس میں تاریخ کے معنی و مطالب اور تاریخ کی مختصر روایت کے بعد تاریخی کتب کے تراجم جیسے کتاب الہند، تاریخ ادب اردو، تاریخ مغرب اور مختصر تاریخ کشمیر شامل ہے۔ مذکورہ باب میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کو بطور مؤرخ زیر بحث لاکر تاریخ کے حوالے سے ان کی ترجمہ شدہ کتاب "واقعات کشمیر" کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد طنز و مزاح کے حوالے سے بھی ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی طبع آزمائی پر مبنی کچھ خدمات کو اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں انہوں نے نظم کی مختلف ہیئتوں میں کام کیا، جیسے قطعہ، غزل اور نظم وغیرہ پھر ان ہیئتوں کے تحت ان کی مختلف موضوعات پر طنزیہ و مزاحیہ شاعری ملتی ہے۔ ان طنزیہ اشعار میں عام موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ جن میں میاں بیوی کے تعلقات، حکیم ستیاناس کی

کرامات، شاعری اور شاعری کی خصوصیات و تخلص وغیرہ کا ذکر ایسے انداز میں کیا گیا ہے کہ معاشرے کے کمزور پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں اور طنزیہ و مزاحیہ نثر نگاری کی روایت میں بھی اہم اضافہ ہوتا ہے۔

باب ششم میں ترجمہ کے معنی و مفہوم، ضرورت و اہمیت، آغاز اور مختلف اداروں کے تحت تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔ تراجم کے مختلف ادارے جیسے فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے بعد ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کے بطور مترجم اردو ادب میں کارہائے نمایاں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے اردو تراجم میں مرقع دہلی، دربار ملی، مقامات داؤدی، گلستان سعدی اور بوستان سعدی جیسی بلند پایہ تصانیف شامل ہیں۔ باب ششم تین حصوں ترجمہ نگاری، دیباچہ نگاری اور تبصرہ نگاری پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی اردو ادب میں ان تینوں حیثیتوں سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ مقالہ نگار نے انتہائی محنت لگن اور دلجمعی سے اپنی سی کوشش کر کے اس وسیع ادبی سرمایے اور ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی کثیر الجہات کو اس مقالے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ "محاکمہ" کے عنوان سے مباحث کو سمیٹتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کے ادبی سرمایے کی حیثیت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی نے اردو ادب کو اُس قیمتی سرمایے سے مالا مال کیا جس کی حیثیت ہر دور میں نمایاں رہے گی۔ زیر مطالعہ مقالے میں نائلہ عبد الکریم نے ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی شخصیت اور فن کو مکمل طور پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی۔ انہوں نے مقالے کے اختتام پر اشاریہ، فہرست آیات، فہرست احادیث، فہرست شخصیات، فہرست اماکن، کتب و رسائل بھی شامل کیے ہیں۔ ضمیمہ الف (۱) تا (۷) اور ضمیمہ ب میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی کی خوبصورت تحریر میں مسودے کے صفحات کا عکس اور کتابیات بھی شامل مقالہ ہیں۔ انہوں نے تحقیق کی جامعیت اور افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنیادی ماخذات کو زیر استعمال لایا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید یزدانی، ان کے افراد خانہ، دوست احباب اور شاگردوں سے جامع انٹرویو کا اہتمام بھی کیا اور ان کی مطبوعہ کتب، مسودات اور ضمائم کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

موضوع مقالہ: افسر صدیقی امروہی کی علمی و ادبی خدمات"

مقالہ نگار: فوزیہ پروین، 2013ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی

افسر صدیقی امروہوی کی شخصیت قلندر منش, وضع دار, نام ونمود اور شہرت سے بے پروا تھی۔ وہ اردو کے خدمت گزار کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے تھے چنانچہ جب پاکستان قائم ہوا اور مولوی عبدالحق نے کراچی انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی تو افسر صدیقی امروہوی بھی اس انجمن سے وابستہ ہوگئے۔ انہون نے بڑی محنت اور لگن سے انجمن ترقی اردو کے مخطوطات کو آٹھ جلدوں میں مرتب کیا۔ اس کے بعد "تذکرۂ عروس الاذکار، تذکرہ مدائع شعرا اور قدیم ترین مراثی کا ایک مجموعہ "بیاضِ مراثی" کے عنوان سے مرتب و مدون کیا۔ خاندان انیس کے شعرا کے حالات، فیضان انیس اور تلامذہ دبیر کے حالات "گلستان ضمیر" کے عنوان سے لکھے شعرائے برہان پور کا ایک تذکرہ بھی مرتب کیا۔ ان کے مضامین "نگار، ادب لطیف، نیرنگ خیال میں شائع ہوتے رہے۔ "معارف" اعظم گڑھ میں بھی علمی، ادبی و تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ سب سے زیادہ مضامین ماہنامہ "قومی زبان" کراچی اور سہ ماہی" اردو" میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے تاحیات وابستہ رہے۔ اس دوران ساری توجہ ادبی تحقیق پر مرکوز رہی اور اس دوران انہوں نے شعر وشاعری کو تقریباً خیر باد کہہ دیا تھا۔

تحقیقی کام کی ضروریات کے پیش نظر "فہرست سازی" کا بھی خاصا کام ہوا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے حیدر آباد کے ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی، دوسری جلد ۱۹۵۱ء، تیسری ۱۹۵۷ء، چوتھی جلد ۱۹۵۸ء اور پانچویں ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ چھٹی جلد محمد اکبر الدین صدیقی اور ڈاکٹر علی اثر نے مرتب کی۔ نصیر الدین ہاشمی نے اسٹیٹ سینٹرل لائبریری حیدر آباد کے اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست ۱۹۶۱ء میں دو جلدوں میں شائع کی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے رام پور رضا لائبریری کے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں شائع کیں۔ ڈاکٹر صلاح الدین نے دلی کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی جسے انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔

پاکستان میں افسر صدیقی امروہوی نے انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود مخطوطات کی فہرست سازی کی جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد اول ۱۹۶۵ء، مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد دوم ۱۹۶۵ء، مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد سوم ۱۹۷۵ء، مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد چہارم ۱۹۷۶ء، مخطوطات انجمن ترقی اردو، (اردو) جلد پنجم ۱۹۷۸ء، مخطوطات انجمن ترقی اردو (اردو) جلد ششم ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔ مقالہ نگار کے مطابق مقالے کی تسوید تک جلد ہفتم اور ہشتم

غیر مطبوعہ تھیں جس وجہ سے آخری دو جلدوں کی معلومات افسر صدیقی امروہی کی علمی و ادبی خدمات" میں درج نہ ہو سکیں۔ افسر صدیقی امروہی کے بارے میں مقالہ نگار فوزیہ پروین لکھتی ہیں:

"افسر صدیقی امروہوی کلاسیکی ادب کے دلدادہ اور جدید ادب کے شیدائی تھے، وہ نوجوان اہل تحقیق کی بڑی خلوص و شفقت سے رہنمائی فرماتے، وہ میدان تحقیق میں قدیم و جدید دونوں رجحانات کو ملحوظ رکھتے، موضوع کے ہر پہلو پر عمیق نظر ڈالتے، اپنے نقطہ نظر کو نہایت واضح الفاظ میں پیش کرتے، ان کا اسلوب تحقیق منفرد تھا اور وہ اس میدان میں یکتا تھے"۔(17)

افسر صدیقی امروہی کی علمی و ادبی خدمات" میں مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ افسر صدیقی امروہوی نے "تلامذہ مصحفی" کے عنوان سے نہ صرف مصحفی کے شاگردوں کے بارے میں لکھ کر مصحفی کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے بلکہ ان کے شاگردوں کے معیار کو وہ بلندی عطا کی ہے جو ایک بہترین استاد کے توسط سے ہی ایک شاگرد کو حاصل ہوتی ہے۔ جو کام افسر صدیقی امروہوی نے عرق ریزی کے ساتھ کیا وہی کام مصحفی کے شاگردوں میں سے کسی شاگرد کے لیے کرنا ضروری تھا، جن کا تعلق اس حلقہ سے رہا۔ لیکن افسر صدیقی امروہوی نے اُس عہد میں نہ ہوتے ہوئے بھی مصحفی کے شاگردوں کی نشاندہی کی اور اس کام کے لیے افسر صدیقی امروہوی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ افسر صدیقی امروہوی کے بعد بھی کچھ لوگوں نے مصنفی کے تلامذہ پر قلم اٹھایا، لیکن استفادہ کے لیے ان ہی کی کتاب کو نمایاں طور پر سامنے رکھا۔ ان لوگوں میں معروف نقاد تبسم کاشمیری بھی شامل ہیں

افسر صدیقی امروہوی علم و ادب اور شعر و سخن کے میدان میں باقاعدگی سے آگے بڑھے جس کی وجہ سے اُن کے شعری اور نثری سرمائے کی درجہ بندی اور صف بندی کا کام بھی آگے بڑھتا گیا۔ تذکرہ نگاری اُردو ادب میں عہدِ قدیم کی یادگار ہے نئی ترتیب کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے بعد جس طرح سامنے آئی اس سے اس وقت کی اور آج کی تذکرہ نگاری کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ ابتدائی یا قدیم تذکرے تو فارسی زبان میں لکھے گئے لیکن بعد میں جب اردو شعرا کے تذکرے اردو زبان میں لکھے جانے لگے تو بھی ان کا وہی پرانا انداز رہا۔ بہت سے تذکروں میں غیر مقصدی اور سنی سنائی باتیں لکھ دی جاتی تھیں۔ تذکرہ نگار اپنے ذہن پر اعتماد رکھتا تھا۔ مغربی ادب سے اردو ادب نے جہاں بہت کچھ حاصل کیا وہاں تحقیق کے میدان میں بھی زبردست علمی آگہی حاصل کی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے تذکروں میں مغربی انداز تحقیق کے باضابطہ اور وسعت کے نقوش پائے

جاتے ہیں۔ نئے تحقیقی شعور کی وجہ سے جدید تحقیق نے روایتی تذکروں کی خامیاں بیان کیں جس سے شعرا اور فنکاروں کے ذاتی حالات اور ان کے عملی کارناموں میں توازن کی فضا پیدا ہوئی۔ افسر صدیقی امروہی نے تذکرہ نویسی کے اس جدید رجحان کو اپنایا جس سے اُن کے تذکروں میں انفرادیت کا پہلو نمایاں ہوتا گیا۔

اصناف سخن میں غزل کو آج بھی وہی اہمیت و فوقیت حاصل ہے جو میر اور غالب کے زمانے میں تھی ۔ یہ اور بات ہے کہ ہر دور میں حالات کے ساتھ ساتھ فکری اساس کا منبع بدلتا گیا، غزل کے مزاج میں تبدیلی آگئی، زبان و بیان کے اسلوب پر رنگ رنگ کی چادریں چڑھتی گئیں، غزل کا رنگ اور روپ نکھرتا گیا، ایک دور ایسا بھی آیا کہ جدیدیت کے نام پر نت نئے تجربات کے شوق میں تہذیبی و ثقافتی شعور نہ ہونے کی وجہ سے اکثر شعرا نے غزل کا حلیہ بگاڑنے اور اسے کم تر صنف ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن جس طرح ہزارہا مخالفتوں کے باوجود اردو زبان نہ صرف زندہ ہے بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں روز افزوں ہے، اسی طرح غزل کا مستقبل بھی بہتر ہوتا گیا، آج غزل کا تنوع، وسعت، آفاقیت اور شگفتگی و لطافت کے آگے کوئی بھی دوسری صنف اس سے آنکھیں چار نہیں کر سکتی، غزل کو یہ حسن یہ توانائی اور یہ رعنائی بخشنے میں جن اساتذہ متغزلین کا خونِ جگر شامل ہے، ان میں افر صدیقی امروہوی کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

افسر صدیقی امروہوی ایک بلند پایہ محقق کی حیثیت سے بھی جانے پہنچانے جاتے تھے لیکن ایک استاد فن و شعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۴ء میں شعر گوئی سے ہوا۔ عنفوانِ شباب ہی سے ان کو شاعری کا شوق دامن گیر ہوا، غزل میں افسر اور نظم میں صدیقی تخلص استعمال کیا۔ ۱۹۱۴ء میں افسر صدیقی امروہوی کی پہلی غزل رسالہ "طالب دیدار" میرٹھ میں شائع ہوئی تھی۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں افسر صدیقی امروہوی کراچی تشریف لائے۔ اسی ماہ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے پہلا مشاعرہ آرام باغ میں منعقد ہوا جس کی صدارت جام میر ایوب خاں بیرسٹر نے کی تھی۔

مقالہ نگار شہناز پروین کا زیر مطالعہ تحقیقی مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب "امروہہ - مختصر تاریخی پس منظر" ہے۔ اس باب میں امروہہ کی مختصر تاریخ، ادبی و ثقافتی پس منظر اور امروہہ کی خاص خاص شخصیات کا ذکر کیا گیا۔ دوسرا باب "افسر امروہوی کی سوانح" کے نام سے ہے۔ اس باب میں افسر امروہوی کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ مقالے کے تیسرے باب کا عنوان " افسر امروہوی بحیثیت فہرست نگار" ہے۔ اس باب میں مخطوطہ شناسی کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے افسر امروہوی کی مرتبہ فہرستِ مخطوطات انجمن ترقی اردو کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا باب " افسر

امروہوی بحیثیت محقق" کے زیر عنوان ترتیب دیا گیا ہے۔اس باب میں افسر امروہوی کی تحقیقی کتابیں " مصحفی: حیات و کلام" اور" تلامذہ مصحفی "کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز تلامذہ مصحفی (افسر صدیقی امروہوی) اور شاگردان مصحفی، تبسم کاشمیری)کا تقابلی جائزہ بھی اس باب کے ذیلی عنوانات میں شامل ہے۔

موضوع مقالہ: اردو کے فروغ میں ریڈیو کے عالمی اداروں کا کردار "

مقالہ نگار: سمیرا اکبر،2017ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

اُردو زبان کی جائے پیدائش بر صغیر پاک و ہند ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو کی سرزمین میں وسعت آتی جارہی ہے۔ اپنے مختصر سفر کے باوجود اردو زبان کو موجودہ دور میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج یہ زبان دنیا کی بڑی زبانوں کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور صرف اس براعظم میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں یونیسکو جیسے مقتدر عالمی ادارے نے دنیا بھر کی زبانوں کے اعداد و شمار شائع کیے۔ اس میں اس ادارے نے دنیا کی سب سے زیادہ بولی جانے والی تیرہ زبانوں میں اُردو کو بھی شمار کیا اور ان زبانوں میں چینی زبان پہلے، انگریزی دوسرے جبکہ اردو زبان تیسرے نمبر پر تھی۔

ابتدا میں ریڈیو کی نشریات "شارٹ ویو یا میڈیم ویو" کے ذریعے پیش کی جاتی تھی۔ جس کی سماعت کے لیے ریڈیو سیٹ کی ضرورت ہوتی تھی اور مقررہ وقت پر مخصوص فریکوئنسی کے ذریعے ان نشریات کو سماعت کیا جا سکتا تھا۔ موجودہ دور میں جدید ٹیکنالوجی کے آجانے سے ان نشریات کو دنیا بھر میں سماعت کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں ریڈیو کے تقریباً تمام عالمی اداروں کی نشریات ان کی ویب سائٹ پر بھی براہ راست نشر کی جاتی ہے۔ ریڈیو سیٹ کے بغیر اس نشریات کو انٹرنیٹ کے ذریعے ویب سائٹ سے سماعت کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان ویب سائٹ پر سابقہ نشریات اور پروگراموں کی گذشتہ اقساط بھی محفوظ ہوتی ہیں جنھیں کسی بھی وقت سنا جا سکتا ہے اور اپنے کمپیوٹر یا موبائل میں محفوظ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ان عالمی اداروں کی اردو نشریات سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔

موجودہ دور میں سوشل میڈیا کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ فیس بک، ٹویٹر، یوٹیوب اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی اکثریت سوشل میڈیا ایپ یا ویب سائٹوں پر اپنے اکاؤنٹ کے ذریعے دنیا بھر سے رابطے میں رہتے ہیں۔ ریڈیو کے کئی عالمی ادارے "بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو تہران "وغیرہ بھی ان

سوشل میڈیا اکاؤنٹس پر اپنی نشریات براہ راست پیش کرتے ہیں۔ مثلاً بی بی سی، وائس آف امریکہ اور ریڈیو تہران وغیرہ "فیس بک لائیو" کے ذریعے بھی اپنی نشریات پیش کر رہے ہیں۔ جنہیں فیس بک یوزر نہ صرف سماعت کر سکتے ہیں بلکہ ان پر" کمنٹس "کر کے پروگرام میں براہ راست شرکت بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ان عالمی اداروں کے اردو پروگرام سننے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کا اندازہ ان اداروں کے فیس بک پیجز سے لگایا جا سکتا ہے بعض اداروں کے پیجز لائیک کرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ مقالہ نگار ریڈیو کے ان عالمی اداروں کی اُردو خدمات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "ریڈیو کے یہ عالمی ادارے دنیا بھر کی سماعتوں کو اردو زبان سے آشنا کر رہے ہیں۔ ان اداروں کی اردو سروسز سے ان ممالک میں مقیم اردو زبان کے کئی شاعر اور ادیب وابستہ ہیں اور تقریباً ہر نشریاتی ادارے سے ادبی پروگرام بھی نشر کیے جا رہے ہیں۔ ان پروگراموں میں اردو ادب کی مختلف اصناف پر مشتمل سیگمنٹ پیش کیے جاتے ہیں اور اردو کے مقامی شاعروں اور ادیبوں کے انٹرویو بھی نشر کیے جاتے ہیں۔ جس سے ان ادیبوں کی تخلیقات سامعین تک پہنچتی ہیں اور ان کو شناسائی ملتی ہے۔ اس طرح کے ادبی پروگراموں کے ذریعے یہ عالمی ادارے دنیا بھر میں اردو ادب کو فروغ دینے کا باعث بن رہے ہیں"۔(18)

مقالہ نگار سمیرا اکبر نے ریڈیو کے ان عالمی اداروں کی اردو خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں پاکستان کے سرکاری ریڈیائی ادارے "ریڈیو پاکستان" کی تاریخ بیان کی گئی اور اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے شعبہ جات "شعبہ خبر، شعبہ پروگرام، شعبہ انجینئرنگ "کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس نشریاتی ادارے کی بیرون ملک نشریات کا تعارف، تاریخ اور اس نشریات سے پیش کیے جانے اردو پروگراموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ریڈیو پاکستان کے اردو ریڈیائی میگزین " آہنگ "کا تعارف اور اردو زبان و ادب کے حوالے سے اس میگزین کی خدمات بھی اس باب میں تحریر کی گئیں ہیں۔ باب دوم میں عالمی سطح پر اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرنے والے ایشیا کے ریڈیائی اداروں کی خدمات جائزہ لیا گیا ہے۔ براعظم ایشیا میں ریڈیو پاکستان کے علاوہ صدائے روس (روس)، ریڈیو جاپان (جاپان)، آل انڈیا ریڈیو (بھارت)، صدائے ترکی (ترکی)، ریڈیو تہران (ایران)، بنگلہ دیش بیتر (بنگلہ دیش)، چائنہ ریڈیو انٹرنیشنل (چین)، ریڈیو نیپال اور ریڈیو ویرتاس ایشیا سے اردو زبان میں نشریات پیش

کی جاتی ہے۔اس باب میں ان نشریاتی اداروں کا تعارف، تاریخ اور اردو پروگراموں، نیوز لیٹر ور سائل کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب سوم میں یورپ اور امریکہ کے اُن ریڈیائی نشریاتی اداروں کا جائزہ لیا گیا ہے جو اردو زبان میں نشریات پیش کر رہے ہیں۔ ان نشریاتی اداروں میں بی بی سی (انگلینڈ)، وائس آف امریکہ (امریکہ)، ڈوئچے ویلے (جرمنی) فیملی ریڈیو (امریکہ)، فیبا ریڈیو اور ایڈونٹسٹ ورلڈ ریڈیو کے شعبہ اردو کا تعارف، ان کے اردو پروگراموں اور رسائل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں خلیجی ممالک کے ان ریڈیائی نشریاتی اداروں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جو اردو زبان کی شارٹ ویو نشریات پیش کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں سعودی عالمی اردو نشریات، ریڈیو کویت، ریڈیو قاہرہ اور ریڈیو قطر شامل ہیں۔ باب پنجم میں اردو کے فروغ کے حوالے سے ایف ایم / آن لائن ریڈیائی نشریاتی اداروں کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں دنیا بھر کے وہ ایف ایم اور آن لائن ریڈیو چینلز شامل کیے گئے ہیں جو اردو زبان میں پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ ان چینلز میں اقوام متحدہ ریڈیو، صدائے پاکستان، نیو جرسی، ایس بی ایس ریڈیو، آسٹریلیا، ریڈیو نیو ساؤنڈ، یوکے، ایشین ساؤنڈ ریڈیو، آواز ایف ایم، اسکاٹ لینڈ، ریڈیو ایکس ایل، ریڈیو ہمسفر کینیڈا، ریڈیو پاکستان، ٹورنٹو، ریڈیو ٹیلی ویژن، ہانگ کانگ، ریڈیو پاکسلونا، چین، امبر ریڈیو، یوکے ایشین سٹار ایف ایم فیور (Fever) ایف ایم، وائس آف اوسلو، ناروے، سینا (CINA) ریڈیو، کینیڈا، آواز ایف ایم، ساؤتھامٹن، پنج ریڈیو، امریکہ، ریڈیو ایشین ورلڈ، دیسی دھوم ریڈیو، جرمنی ریڈ فورڈ ایشین ریڈیو، ریڈیو رمضان، انگلینڈ، اردو مرکز ریڈیو واشنگٹن گلشن ریڈیو، یوکے، آپ کی آواز، ڈنمارک اور "ریڈیو زندگی" امریکہ شامل ہیں۔

موضوع مقالہ: "بانگِ درا: طبع اول اور دو معاصر اشاعتوں کے متن کا تقابلی مطالعہ"

مقالہ نگار: محمد رمضان، 2014ء

نگران مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، بہاولپور

۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر وحید قریشی اور زاہد منیر عامر کی مرتب کردہ کتاب "علامہ اقبال کی تاریخ ولادت" ایک مطالعہ" منظر عام پر آئی تھی جس میں مختلف علمی شخصیات کے مضامین کو شامل کیا گیا تھا۔ اگرچہ سرکاری سطح پر اقبال کی تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء قرار دے دی گئی لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اس سے مطمئن نہیں تھے۔ اُن کے مطابق اقبال کی پیدائش کے حوالے سے دو حوالے بڑے مستند ہیں۔ ایک منشی احمد دین کی کتاب "اقبال" اور دوسری مولوی عبد الرزاق کی مرتب کردہ کتاب "کلیات اقبال" جو حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی

تھیں۔ یہ دونوں کتابیں اقبال کی زندگی میں شائع ہوئیں اور ان میں سال پیدائش ۱۸۷۵ء درج ہے۔ یہ کتابیں چونکہ اقبال کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں اور اقبال کی نظر سے بھی گزری تھیں اور امر واقعہ میں اقبال نے اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منشی احمد دین اور اقبال کے قریبی روابط تھے۔ ان کتابوں اور "بانگ درا" میں صحت متن کے اختلافات موجود تھے۔۔ مقالہ نگار محمد رمضان نے ان دو کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا مقالہ بعنوان "بانگِ درا: طبع اول اور دو معاصر اشاعتوں کے متن کا تقابلی مطالعہ "تحریر کیا۔

مقالہ نگار نے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں اقبال کی تین معاصر اشاعتوں کا تعارف، پس منظر اور اس ضمن میں تنازعے کی صورت میں ہونے والی خط و کتابت کو شامل کیا گیا ہے۔ اقبال نے دو معاصر اشاعتوں پر جو ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اس کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرا باب "اقبال، انجمن حمایت اسلام اور چند احباب" ہیں۔ اسی باب کا دوسرا حصہ "اقبال اور حیدر آباد دکن" ہے۔ پہلے حصے میں اس بات کا احاطہ کیا گیا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کن مقاصد کے تحت وجود میں آئی۔ اس کے وسائل کہاں سے آتے تھے؟ یہاں اقبال کا ورود کیسے ہوا اور اس پلیٹ فارم پر انہوں نے کون کون سی نظمیں پڑھیں؟ کیوں کہ اسی انجمن کی رودادوں سے احمد دین نے "اقبال" کی اشاعت کے سلسلے میں کافی مواد حاصل کیا تھا۔ دوسرے حصے میں اس بات کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ اقبال کا تعلق حیدر آباد دکن سے کب قائم ہوا؟ کن شخصیات سے مراسم اور مراسلت رہی اور ساتھ ہی "کلیات اقبال' مرتبہ: عبدالرزاق " کی اشاعت کیسے ممکن ہوئی؟۔

تیسرا باب مقالے کا اہم ترین باب ہے۔ اس باب میں "بانگ درا: طبع اوّل، اقبال از: احمد دین اور کلیات اقبال مرتبہ: عبد الرزاق " میں شامل کلام کے متون میں پائے جانے والے اشتراک و اختلاف کو واضح کیا گیا ہے۔ ہر مصرعے، ہر شعر اور ہر بند کو باریک بینی سے جانچ کر اس کے حوالے اور حواشی لکھے گئے ہیں۔ جہاں کہیں تعلیقات کی ضرورت محسوس ہوئی مقالہ نگار نے وہ بھی درج کر دی ہیں۔ چوتھے باب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اقبال نے جو اشعار متروک کیے ہیں اُن کے ترک کرنے کی وجہ کیا تھی۔ ان متروکات کی روشنی میں اقبال کے فکری و فنی ارتقا کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کی شاعری کے آغاز کے بارے میں مقالہ نگار رقمطراز ہیں:

"اقبال کے بارے میں یہ خیال کر لینا کہ انہوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی یا تفریحِ طبع کے طور پر شاعری شروع کی یا وہ باقاعدہ ایک پیشہ ور شاعر بننا چاہتے تھے یا وہ اپنے گرد شاگردوں کا ہجوم دیکھنا چاہتے تھے، یہ اُن کی فکری عظمت کے خلاف ہو گا"۔(19)

مقالے کے پانچویں باب میں مقالہ نگار کی طرف سے اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ اقبال شناسی کے باب میں "اقبال" از احمد دین اور "کلیات اقبال" مرتبہ:عبد الرزاق کی قدر و منزلت کیا ہے اور اقبال فہمی کے ضمن میں ان کتب کا مطالعہ کس قدر ناگزیر ہے۔ اقبالیات کے ضمن میں "کلیات اقبال مرتبہ: عبد الرزاق اور "اقبال" از: احمد دین نہایت معتبر حوالے ہیں۔ ان سے نہ صرف اقبال کے فکری و فنی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان سے اقبال کے فکر و فن کے ارتقا پذیر رجحانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کتب کی مدد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنے کلام پر جو اصلاحات کی ہیں وہ کتنی ضروری تھیں؟ ان کتابوں کی مدد سے اقبال کے فنی ارتقا کے علاوہ اُن کے ایک اچھا نقاد ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق بانگ درا اور دو معاصر اشاعتوں کے متون کے تقابلی مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو اپنے شعری سفر میں کن کن نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ ورنہ یہ اندازہ نہ ہوتا کہ "بالِ جبریل" کی بلند خیالی "جاوید نامہ" کی ڈرامائی عظمت اور "زبور عجم' کی مترنم لَے تک پہنچنے کے لیے انہیں کن کن مراحل سے گزرنا پڑا۔

مقالہ نگار کے مطابق "بانگ درا" کی ترتیب کے وقت اقبال نے ہر لحاظ سے یہ خیال رکھا کہ اس میں کسی قسم کا جھول نظر نہ آئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے "بانگ درا" کو جن تین ادوار میں تقسیم کیا ہے، ہر دور کی پہلی نظم نہ صرف اُس دور کی ترجمانی کرتی ہے بلکہ اُس دور کی خصوصیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ پہلے دور کی پہلی نظم "ہمالہ" ہے۔ اس دور میں ہمالہ کی سربلندی اقبال کے رفعت تخیل اور ان کے ذوق استفسار کی گواہ ہے۔ اس دور میں اقبال کو یہی ذوق آگہی آسمان کی بلندیوں پر لیے پھرتا ہے اور وہ اسی جستجو اور تگ و دو میں پریشان دکھائی دیتے ہیں کہ کس طرح اپنی شاعری سے نوع انسانیت کو بہرہ ور کر سکیں؟

دوسرے دور کی پہلی نظم "محبت" ہے۔ اس دور میں اقبال قانونِ قدرت اور محبت کے تماشائی اور طلب گار دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں شروع سے لے کر آخر تک محبت کے عنوان سے آفرینش عالم کے راز دکھائے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور کی نظموں میں قانونِ فطرت کے اثرات اور محبت بھرے راز کے موضوعات ملتے ہیں۔ تیسرے دور کی پہلی نظم "بلاد اسلامیہ" ہے۔ یہ نظم اپنے نفسِ مضمون سے اُس دور کی

شاعری کا رُخ بتا رہی ہے کہ اُس دور کا موضوع ملت اسلامیہ ہے۔ اس حصے میں ملی جذبات کے ہنگاموں کے ساتھ ساتھ قوم کی شان، جلال و جمال کی خوب صورت جھلکیاں ملتی ہیں۔ محمد رمضان کا تحریر کردہ یہ مقالہ مجموعی طور پر اقبال شناسی کی روایت میں اہم اضافہ ہے۔

موضوع مقالہ: "اُردو میں نثری اَسالیب کے تنقیدی مطالعے کی روایات "

مقالہ نگار: منور مقبول عثمانی، 2014ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر شبیر احمد قادری، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

کسی مصنف پر گفتگو کرتے ہوئے کوئی شخص اسلوب کی بات پہلے کر بیٹھے تو سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں کہ لو جی! الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ یہ سرگوشیاں بڑے کام کی ہوتی ہیں، ان سے کسی بھی ادبی معاشرے کا تصورِ اسلوب ظاہر ہو رہا ہوتا ہے۔ اس عمومی اور اجتماعی تصور اسلوب میں جو خاصی حد تک سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے یہ بات پنہاں ہے کہ مصنف کا موضوع و مواد اور فکر احساس بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور یہی عناصر مصنف کا اصل تخلیقی اثاثہ اور حقیقی ادبی شناخت ہیں۔ تحقیق کار کو پہلے انہی پر بات کرنی چاہیے بعد ازاں اپنی تنقیدی گفتگو کے آخری حصوں یا مضمون کی آخری سطروں میں اُس "کار کن، پیش کار یا ذریعہ اظہار" پر بھی بات کر لینی چاہیے جسے انداز بیان طرز تحریر یا اسلوب وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اردو ادب میں تنقیدی گفتگو اور تنقیدی مضامین و مقالات کا طور طریق عموماً یہی رہا ہے لیکن اس صورت حال میں کچھ چراغ ایسے بھی جلتے رہتے ہیں جنھوں نے ناموافق حالات میں بھی روشنی کا تسلسل برقرار رکھا ہے اور ادب میں اسلوب کی اہمیت اور حیثیت کو آشکار کرنے کا فریضہ بڑی دل جمعی سے ادا کیا ہے۔

زیر تجزیہ مقالہ کو منور مقبول عثمانی نے انہی چراغوں کے ذکر سے روشن کیا ہے۔ یہ مقالہ اُردو میں نثری اسالیب کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعات اور اسلوبی و اسلوبیاتی مباحث کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق اس مقالے میں اُردو کے نثری اسالیب پر ہونے والی تنقید پر تنقید کرنے سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اصل میں اسلوب ہے کیا؟ اور مطالعہ اسلوب اور تجزیہ نثر کے حقیقی اور جدید تقاضے کیا ہیں!۔ اس مقالے میں مقالہ نگار نے بنیادی مؤقف یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلوب محض لکھنے کا ڈھنگ نہیں ہے اور ہر لکھی ہوئی چیز سے اسلوب بر آمد نہیں ہو سکتا۔ اسلوب کا سروکار فقط تخلیقی تحریروں سے ہے۔ اسلوب فن کار کے ارادہ تخلیق میں موضوع و مواد کے ساتھ ہی جنم لیتا ہے۔ اسلوب مصنف کی شخصیت انفرادیت تخلیقیت اور قوت اظہار کے تال میل سے پروان چڑھتا ہے۔ مصنف کی ذہنی قوت، تحریری ریاضت، مطالعاتی

وسعت لسانی و معاشرتی ضروریات اور علم و ادب کا گہرا شعور، اسلوب کی تراش خراش میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ موضوع و مواد اور انداز و اسلوب اصل میں دونوں ایک ہیں، جو قاری اور ناقد مواد و اسلوب کی وحدت کو پا لیتے ہیں، اُن کا اسلوب صحیح سمت کی جانب پیش رفت کرتا ہے، بصورت دیگر مطالعہ اسلوب ادھورا، نزاعی یا بے سمت ہو کر رہ جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر تخلیقی مواد اور اسلوب و ہیئت کے وقوع میں زمانی و مکانی طور پر کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔

مقبول عثمانی اپنے مقالے میں اسلوب کی سطحوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اسلوب یک سطحی نہیں ہوتا؟ اس کی دو سطحیں ہوتی ہیں "ظاہری اور باطنی"۔ ظاہری سطح لفظیات و نحویات، صنائع و بدائع، روز مرہ و محاورہ، لفظی تراکیب لسانی اختراعات معاشرتی رجحانات اور دیگر زبانوں اور مقامی و عالمی ادب پاروں کے اثرات سے عبارت ہوتی ہے۔ اسلوب کی معنوی سطح مصنف کے تخلیقی تحرک، اُس کے فکر و احساس کی گہرائی مطالعاتی وسعت، حظ آفرینی اور نکتہ آفرینی کی قوت سے بشاشت اور وجاہت حاصل کرتی ہے۔ اس لیے مطالعہ اسلوب یا تنقید اسلوب میں اسلوب کی دونوں سطحوں (ظاہری و باطنی) کا تجزیہ ضروری ہے۔ اسلوب کسی ایک تخلیقی شخصیت کی عطا ہے لیکن اسلوب کی وسیع المشربی دیکھیے کہ یہ فقہ کسی ایک شخصیت کا عکاس یا پرچارک بن کر نہیں رہ جاتا بلکہ پوری ادبی روایت عصریت اور اپنے ارد گرد پھیلی تہذیب و ثقافت کی رُوح کا ترجمان بن جاتا ہے۔

اسلوب کسی تخلیقی شخصیت کا تشخص ہے اور تشخص کی خصوصیت اور خاصیت، تاثر اور تاثیر نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی ہوتی ہے۔ ہر مصنف کا اصلی، مرکزی اور ذاتی اسلوب ایک ہی ہوتا ہے، گویا کوئی جانا پہچانا صاحب اسلوب مصنف صاحب افکار تو ہو سکتا ہے لیکن صاحب اسالیب نہیں ہو سکتا۔ بعض ناقد رواروی میں کسی مصنف کے یہاں زبان و بیان کی رنگارنگی یا کسی نوعیت کے اسلوبی تغیر کو دیکھ کر اُسے صاحب اسالیب قرار دے دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر اچھے مصنف کے زبان و بیان میں تغیر سے اس کے تخلیقی باطن میں تموج اور احساسات میں تنوع کی بہاریں قائم رہتی ہیں. یہ بہاریں کسی ایک ہی رنگ کا اثبات کرتی ہیں۔ تغیر، تنوع اور تموج کی ان لہروں سے اسلوب میں در آنے والی رنگارنگی کو اسلوب کے دو دھارے دو رجحان یا دو رنگ کہنا مناسب ہے نہ کہ اُنھیں دو اسلوب (یا دو سے زائد اسلوب) قرار دے دیا جائے۔ نثری اسالیب کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بھی ضروری ہے کہ علمی اور تخلیقی نثر کے مابہ الامتیاز کو نگاہ میں رکھا جائے اور علمی نثر کے اسلوبی ضابطے، تخلیقی نثر اور تخلیقی نثر کے اسلوبی قرینے، علمی نثر پر لاگو نہ کیے جائیں۔ گو علمی نثر اور تخلیقی نثر

کے مدار اور منطقے ایک دوسرے متصل ہیں، اور ذرا گہرائی سے دیکھیں تو ایک ہی نظر آتے ہیں، لیکن دونوں کی جانب مصنف کی فکری، احساساتی اور تخلیقی پیش رفت مختلف ہوتی ہے۔ اردو میں انداز بیان یا سلوب کی تقلید قدیم تذکروں، کلاسیکی نثر نگاروں اور دیباچوں سے اپنے سفر کا آغاز کر کے مختلف سرد وگرم دیاروں سے ہوتی ہم تک پہنچی ہے اور اپنے مزید امکانات کی دریافت اور خزائن کی بازیافت کے لیے آج کی وسیع الجہت تنقید کی جانب دیکھ رہی ہے۔ جدید عہد میں تنقید اسلوب ایک نئے لفظ "اصطلاح، رویے یا شعبے سے آگاہ ہوئی اور وہ ہے "اسلوبیات"۔ یہ شعبہ اصل میں اپنے اُصول "لسانیات" سے اخذ کرتا ہے اور فن پارے کا لسانیاتی تجزیہ سامنے لاتا ہے جس کی نوعیت اور کیفیت معروضی اور سائنسی ہوتی ہے۔ ادبی تنقید کا مطالعہ اسلوب او رچیز ہے جبکہ اسلوبیات کا مطالعہ اسلوب قطعاً علیحدہ چیز۔ لہٰذا اسلوب او ر اسلوبیات، اسلوبی مطالعہ اور اسلوبیاتی مطالعہ، اسلوبی تنقید اور اسلوبیاتی تنقید، کے الفاظ مترادف کے طور پر استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔

درج بالا مؤقف کو سامنے رکھتے ہوئے زیر تجزیہ مقالے میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اُردو کی تنقیدی روایت میں نثری اسالیب کے تنقیدی و تجزیاتی مطالعات کی نوعیت کیا رہی ہے، ناقدین نے نثری اسلوب کو کن زاویوں سے دیکھنے اور پرکھنے کی کاوش کی ہے اور صائب نتائج تک پہنچنے میں انھیں کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مقالہ نگار مقبول عثمانی نے اُردو میں نثری اسالیب کے تنقیدی مطالعات کی روایت کو پرکھنے کے لیے اسے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ مقالے کا پہلا باب اسلوب اور مطالعہ اسلوب کے تقاضوں کے حوالے سے ہے۔ باقی چاروں ابواب چار ادوار کے تجزیوں مشتمل ہیں۔ اس ادوار بندی اور ابواب بندی کا جواز مقالہ نگار کے نزدیک یہ ہے کہ اُردو میں نثر کی ابتدائی کتب کے دیباچوں سے اندازِ بیان اور اسلوب کے حوالے سے کچھ اشارے دستیاب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ عمل خاصا باضابطہ ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر تنقیدی روایت میں ایک اہم کتاب "اُردو کے اسالیب بیان" از ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس اضافے کے ساتھ ہی تنقیدِ اسلوب کی پہلی مسافت مکمل ہو جاتی ہے۔

اگلا دور اپنے مزاج کے اعتبار سے مختلف ہے، یہ اُردو ادب میں تحقیق و تحریک کا دور ہے۔ اس دور میں تحقیق کے دیگر ثمرات کے ساتھ ساتھ کئی نثری کتب اور اُن کے اسالیب کا تجزیہ و مطالعہ بھی سامنے آتا ہے اور یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۰ء تک برقرار رہتا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق اسے اسالیب کی تنقید کا دُوسرا یا عبوری دور کہنا مناسب ہے۔ مقالے کا تیسرا باب اسی عبوری دور کے خد و خال کو اُبھارنے کی کاوش ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد نثری اسالیب کی تنقید کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ چوتھے باب میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۰ء کے

دور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ پانچواں دور ۱۹۸۰ء سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھ۔ اسلوب کے ہر دور کی جڑیں اپنے سابق دور میں اُتری ہوتی ہیں اس لیے کئی ناقدین ۱۹۸۰ء سے پہلے ہی تحقیق و تنقید کی دُنیا میں اہمیت حاصل کر چکے تھے لیکن مقالہ نگار نے زیر تجزیہ مقالے میں اُن کا تذکرہ تیسرے دور (۱۹۵۰ء تا ۱۹۸۰ء) میں کرنے کے بجائے چوتھے دور (یعنی پانچویں باب) میں کیا ہے۔ اس "اجتہاد" کا باعث یہ ہے کہ مذکورہ ناقدین میں کچھ ۱۹۸۰ء کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک فعال رہے اور کچھ مذکورہ مقالے کی تحریر تک بھی فعال اور سرگرم تنقید ہیں۔ علاوہ ازیں نثری اسالیب کے حوالے سے ان نقادوں کی تنقید ستر اور اَسی کی دہائی کے بعد سامنے آئی۔ اس لیے ان کے تصورِ اسلوب نے بھی اَسی کی دہائی کے بعد ہی ایک واضح صورت اختیار کی۔ اس تناظر کے باعث ان تمام ناقدین کو (خواہ ان کی تنقید کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں ہو چکا تھا) نثری اسالیب کے تنقیدی مطالعے کے چوتھے دور (۱۹۸۰ء سے تا حال) یعنی زیر تجزیہ مقالے کے پانچویں باب میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ مقالے کا "ما حصل" قدر مفصل ہے۔ اس کی وضاحت میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "مقصد یہ ہے کہ نثری اسالیب کی وسیع تنقیدی روایت اور مختلف ناقدین کے مختلف النوع تصورات و تجزیات کی کسی حد تک مربوط اور مکمل تصویر سامنے آسکے"۔(20)

اُردو میں نثری اسالیب کے تنقیدی مطالعے کی ثروت مندی سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا البتہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اِس روایت کو افقی اور عمودی دونوں جہتوں میں پیش رفت کے لیے مزید میدان میسر آئیں اور علمی تناظرات اور تنقیدی تعقلات کے پھیلتے آفاق میں یہ اپنی اہمیت، ناگزیریت، اکثر پزیریت اور اکثر انگیزیت کو پوری قوت سے ظاہر و ثابت کر سکے۔ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ نثری اسالیب کی تنقیدی روایت کو مختلف حوالوں سے مزید تحقیقی و تنقیدی عمل سے گزارا جائے تا کہ اس کے حاصلات اور امکانات کے حوالے سے مزید تجزیات اور خیالات سامنے آسکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسالیب نثر کی تدریس اور نصاب کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے تا کہ اسالیب نثر کا مطالعہ فصاحت و بلاغت کے قدیم دائروں سے نکل کر باہر کی طویل و عریض دُنیا کو بھی مَس کر سکے۔ علاوہ ازیں عمومی ادبی ثقافت کو اس جانب متوجہ کرنے کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے کہ اسلوب اس بات کا سزاوار نہیں کہ اسے تنقیدی مضمون کی آخری سطروں اور رسمی لفظوں سے نمٹانے کی کوشش کی جائے۔ اسلوب ادب کا حصہ ہے، ادب کا حاشیہ نہیں۔ مطالعہ اسلوب مطالعہ ادب ہے؟ متن کی پیشکش پر مامور کسی فنکار کا فقط مربیانہ تذکرہ نہیں ہے۔

موضوعِ مقالہ: " پاکستانی اُردو شاعری میں ملی نغمہ نگاری کی روایت "

مقالہ نگار: انصر عباس، 2019ء

نگرانِ مقالہ:

پروفیسر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری ،وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو شعر و ادب کی تمام مقامی و بدیسی اصناف اور شعری ہئیتوں پر کئی پہلوؤں سے قابل قدر تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا ہے۔ ملی نغمہ جو پاکستان میں اردو زبان کی قومی صنف ہے، اس کے حوالے سے زیر تجزیہ مقالے سے پہلے کوئی خاطر خواہ کام سامنے نہیں آیا۔ مقالہ نگار انصر عباس کے مطابق اُردو کے محققین و نقاد ملی نغمہ کو گیت ہی کا ایک ذیلی عنوان سمجھتے آرہے ہیں اور ملی نغمہ کی جداگانہ صنفی حیثیت سے انکاری ہیں۔ تجزیے کے شروع میں "بدیسی" کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ اصناف دوسری زبانوں سے اردو میں وارد ہوئیں اور تہذیبی اور عصری تقاضوں پر پورا اترنے کی بدولت باقاعدہ رواج پا گئیں جبکہ ملی نغمہ واحد صنف سخن ہے جو اردو اور پاکستان کی تخلیقی صنف ہے لیکن اہل دانش کی نظروں سے اوجھل ہے۔ البتہ شعرانے اکثر جگہوں پر ملی نغمہ کا لفظ بطور صنف کے استعمال کیا ہے۔ اس کے باوجود ملی نغمہ کو محققین و نقاد کی توجہ کی ضرورت رہی ہے۔

مقالہ نگار کے مطابق ملی نغمہ کو گیت کا ذیلی عنوان سمجھنا سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ گیت ایک نسوانی صنف سخن ہے۔ جس میں عورت کی طرف سے مرد سے اظہار محبت کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں موضوع کے لحاظ سے گیت غزل کے برعکس ہے لیکن گیت کی کوئی مخصوص ہیئتی صورت متعین نہیں ہے اور نقاد اس کو چار و ناچار موضوعی صنف سخن تسلیم کرتے ہیں جس کا موضوع عورت کی آواز ہے لیکن ملی نغمہ اس سے قطعاً مختلف صنف ہے۔ بلاشبہ گیت کی طرح اس کی بھی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے اور دیگر موضوعاتی اصناف سخن کی طرح اس میں ہیئتی تنوع پایا جاتا ہے لیکن اس کی جداگانہ شناخت کے ساتھ جس اظہاریہ پر منحصر ہے وہ اس کا موضوع ہے، انصر عباس کے مطابق:

> "ملی نغمہ ملت اسلامیہ سے منسوب وہ شعری صنف ہے جس میں عالم اسلام اور اس سے ملحقہ علاقوں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کے مسائل و وسائل، عروج و زوال، خوشی و رنج، ماضی و حال کے واقعات اور مستقبل کے لائحہ عمل سمیت تمام پہلوؤں کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ملی نغمہ اردو کی صنف سخن ہے اور

اردو صرف پاکستان کی قومی زبان تسلیم کی جاتی ہے اس لیے اس کو پاکستان سے خصوصی تعلق حاصل ہے"۔(21)

پاکستان ایک اسلامی نظریاتی ملک ہے جس کی ملت اسلامیہ کے ساتھ مکمل ہم آہنگی ہے اور پاکستان کے وسائل و مسائل ملت اسلامیہ کے وسائل و مسائل میں شمار ہوتے ہیں یعنی ملت اسلامیہ ایک جسم ہے تو پاکستان اس جسم کا حصہ ہے ،لہذا پاکستان میں ہونے والی تمام قومی و ملی شاعری کو ملی نغمہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اہل نقاد قومی و ملی شاعری کو ایک الگ موضوع تسلیم کر چکے ہیں اور قومی و ملی شاعری کے حوالے سے با قاعدہ تحقیقی و تجزیاتی کام بھی ہو چکا ہے لیکن قومی و ملی شاعری کو با قاعدہ صنف کا نام دینے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق قومی و ملی موضوعات پر مبنی شعری سرمائے کو ملی نغمہ کہنا بہر صورت مناسب اقدام تسلیم کیا جائے گا

مقالہ نگار انصر عباس کے تحریر کردہ اس مقالے کا بنیادی موضوع "پاکستانی اردو شاعری میں ملی نغمہ نگاری کی روایت" ہے لیکن اُن کے نزدیک ملی نغمہ کو اردو کی دیگر اصناف سخن کے برابر کھڑا کرنا سب سے اہم مرحلہ تھا جس کو انہوں نے بھرپور طریقے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ملی نغمہ نگاری کے بنیادی مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں قوم اور ملت کے بنیادی تصور، قومی و ملی شاعری، ملی نغمہ بطور صنف سخن اور ملی نغمہ اور پاکستان کے خصوصی تعلق پر بحث کی گئی ہے ،کیونکہ ان بنیادی مباحث پر روشنی ڈالے بغیر ملی نغمہ نگاری کی روایت بیان کرنا قدرے ادھورا ہوتا۔ دوسرے باب "اردو میں قومی و ملی شاعری آغاز تا قیام پاکستان" میں قومی و ملی شاعری کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصے میں عالمی ادب میں قومی شاعری کی مختصر روایت بیان کی گئی ہے۔ جس کے بعد اردو ادب میں قومی و ملی شاعری کے ابتدائی نقوش سے لے کر قیام پاکستان تک کا مختصر تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"پاکستانی اُردو شاعری میں ملی نغمہ نگاری کی روایت "کے تیسرے باب میں قیام پاکستان کے بعد کی ملی نغمہ نگاری کے بنیادی موضوعات و افکار کی تحقیق و تجزیہ پیش کیا گیا ہے جبکہ مقالے کے چوتھے باب میں ملی نغمہ نگاری کے اہم اور وسیع موضوع یعنی عسکری پس منظر میں ہونے والی ملی نغمہ نگاری کو مختلف ادوار کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پانچویں اور آخری باب میں قومی و ملی نغموں کا فنی و اسلوبی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ہیئتی تنوع اور اسالیب کے تنوع کا الگ الگ مطالعہ شامل ہے۔ آخر میں اس

مقالے میں پیش کیے گئے تمام مباحث کو سمیٹتے ہوئے ما حصل پیش کیا گیا ہے۔ ابواب اور ما حصل کے بعد کتابیات کو موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ منقسم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں تحقیق و تنقید کے موضوعات کی کتب، دواوین، کلیات، شعری مجموعے، لغات، اخبارات، اور رسائل وغیرہ شامل ہیں۔

موضوع مقالہ: " مرزا مظہر جان جاناں، اصغر گونڈوی اور واصف علی واصف کی غزل میں تصوف کا تحقیقی و تقابلی جائزہ"

مقالہ نگار: مسلم شاہ، 2019ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر بادشاہ منیر بخاری، جامعہ پشاور، پشاور

مرزا مظہر جان جاناں ، اصغر گونڈوی اور واصف علی واصف کی غزل میں تصوف کے موضوعات کثرت سے ملتے ہیں لیکن ان شخصیات پر تصوف کے تناظر میں کوئی تحقیق کام تاحال سامنے نہیں آسکا تھا۔ ان تینوں شعرا کی غزل کا جائزہ تصوف کے پس منظر میں لینے کی کوشش کی غرض سے مقالہ نگار مسلم شاہ نے اس تحقیقی مقالے مذکورہ شعرا کے ہاں مماثل اور غیر مماثل موضوعات کو ان کے ذاتی تجربات اور کلاسیکی روایات کے تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے مقالے کو چھے ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں تصوف کی مختلف تعریفات کی روشنی میں اس کے بنیادی خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عربی اور عجمی تصوف پر مباحث بھی باب اول کا حصہ ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود جو تصوف کے بنیادی نظریات میں شامل ہیں، ان پر بھی بات کی گئی ہے۔ فارسی ادب میں تصوف کی روایت کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اردو ادب میں خواجہ میر درد، میر تقی میر اور اسد اللہ خان غالب کے ہاں متصوفانہ مضامین کا تجزیہ ان کے اشعار کی روشنی میں کیا گیا ہے۔

باب دوم مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری پر متصوفانہ خیالات کے اثرات کے مطالعے کے لیے مخصوص ہے۔ مظہر جان جاناں نہ صرف اردو کی شعری روایت میں ایک اہم مقام و مرتبے کے حامل ہیں بلکہ ہندوستان میں تصوف کی جو روایت موجود رہی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے خاطر خواہ حصہ ڈالا ہے۔ مذکورہ باب میں مقالہ نگار نے مظہر جان جاناں کی ولادت، تصانیف، شخصیت اور تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس دور کے ادبی ماحول پر بھی بات کی ہے۔ مرزا مظہر کے ہم عصر شعرا کے ہاں متصوفانہ مضامین کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور مظہر کی غزل میں متصوفانہ مضامین پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ان کے اسلوب پر تصوف نے جس جس انداز سے جتنا اثر ڈالا ہے اس کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"مظہر جان جاناں کے کلام میں سب سے نمایاں جو چیز نظر آتی ہے وہ داخلیت ہے۔انہوں نے وہی کہا ہے جو محسوس کیا ہے۔شاعری اُن کے خیالات وافکار کی ترجمانی ہے۔وہ ایک ایسے درویش صوفی تھے جن کی نگاہ میں زندگی ایک بے حقیقت چیز تھی"۔(22)

اصغر گونڈوی کا دور جدید ادوار میں شمار ہوتا ہے جو بر صغیر پاک وہند کی غلامی کا دور تھا۔غلامی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا یقین بیٹھ گیا تھا اور شعرا کی ایک اچھی خاصی تعداد متصوفانہ شاعری کرنے لگی تھی۔مقالے کے باب سوم میں مقالہ نگار مسلم شاہ نے اصغر گونڈوی کی شخصیت، شاعری کے موضوعات، تصانیف اور تعلیم و تربیت کے ذکر کے ساتھ ان کے ہمعصر شعرا میں تصوف کے رجحان پر بات کی ہے۔ اصغر کی غزل میں صوفیانہ افکاروخیالات پر بات کرنے کے بعد اُن کے اسلوب بیان کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

واصف علی واصف کا شمار جدید دور کے ان شعرا میں ہوتا ہے جن کا دور آزادی کے بعد شروع ہوا۔ باب چہارم میں واصف کی شخصیت اور ان کے متصوفانہ افکار پر بات کی گئی ہے۔اس کے علاوہ واصف کی غزل میں صوفیانہ افکار اور تصورات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔باب پنجم میں مظہر جان جاناں، اصغر گونڈوی اور واصف علی واصف کی غزل کے متصوفانہ اشعار کے تقابلی مطالعہ کے علاوہ ان کے خیالات، موضوعات کا بھی تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں ان کے افکار، خیالات اور موضوعات میں مماثلتیں اور عدم مماثلتیں بھی تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔باب ششم اس مقالے کا آخری باب ہے۔ جس میں پچھلے ابواب کے مباحث کی روشنی میں نتائج مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان تینوں شعرا کے متصوفانہ اور شاعرانہ قدو قامت کا تعین کیا گیا ہے اور ان کی شاعری پر تصوف کے اثرات کا ماحاصل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

موضوعِ مقالہ: "میرزا ادیب کی تخلیقی نثر:انتقادی مطالعہ "

مقالہ نگار: نسیم عباس، 2018ء

نگران مقالہ: ڈاکٹر غلام عباس گوندل، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

میرزا ادیب ہمہ جہت ادیب ہیں، انہوں نے تخلیق کے تمام اسالیب اور قرینوں کو برتا۔ ابتدا شاعری

سے کی قلم طولانی پر مائل ہوا تو رومانی تخیل نے صحر انورد کا رُوپ دھارا۔ افسانے لکھے، ڈرامے پیش کیے۔ ناول لکھا، سفر نامہ، خاکے اور بچوں کے ادب کا بسیط سرمایہ، ادب کی جھولی میں ڈال دیا۔ ذات کو اخفا سے افشا میں لانے کے لیے خود نوشت لکھ کر کھلی کتاب بن گئے۔ بیسویں صدی میں جنم لیا، وقت و حالات کا سرد گرم محسوس کیا، اس صدی کی دو نمایاں تحریکوں "رومانیت اور ترقی پسند تحریک" سے وابستگی قائم کی۔ ہر دو تحریکوں سے تعلق آخر کار، عام آدمی کا کہانی کار بننے پر منتج ہوا۔ قلم سے ہم رشتگی تاحیات قائم رہی۔ ایسے ہمہ جہت ادیب کے بسیط کام کا بلیغ مطالعہ، پی ایچ۔ڈی کی سطح کے مقالے کا متقاضی تھا۔ اس کمی کو نسیم عباس نے پورا کرنے کی سعی کامل کی۔

نسیم عباس کا تحریر کردہ مقالہ بعنوان "میرزا ادیب کی تخلیقی نثر: انتقادی مطالعہ "سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں تخلیقی نثر کے بنیادی خصائص پر بحث کے بعد میرزا ادیب کے تخلیقی نثری سرمایے کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں اُن کے ایسے افسانوی مجموعے بھی دریافت کیے گئے ہیں، جو وقت کی گرد میں دب چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی غیر مدون نثری تخلیقات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔ باب دوم میں میرزا ادیب کی افسانہ نگاری کا انتقادی مطالعہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق میرزا ادیب نے اُنیس افسانوی مجموعوں میں ایک سو سینتالیس افسانے تخلیق کیے۔ ان افسانوں میں انھوں نے وطن پرستی، محبت، تنہائی، آزادی اور غلامی کا فرق، سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ استحصال، برطانوی استعمار، طبقاتی تضاد، تہذیبی اقدار کی شکست، اخلاقی اقدار کی ترویج، انسانی نفسیات کی عکاسی، اجتماعی خاندان کی محبتیں اور مسائل، جیسے موضوعات کے ساتھ داستانوی فضا، رومانی تخیل، پُر اسراریت، سادہ بیانیہ، رمزیت و ایمائیت اور کردار نگاری جیسے فنی خصائص کا مفصل تجزیہ کیا ہے۔ باب سوم میں، میرزا ادیب کی ڈرامانگاری پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اُنھوں نے دس ڈراموں کے مجموعوں میں اٹھاسی (۸۸) ڈرامے تخلیق کیے۔ اس باب میں اُن کے ڈراموں میں پیش کردہ ناکام محبت، محبت، طبقاتی کش مکش، سرمایہ دارانہ استحصال، فسادات، معاشرتی منافقتیں، فن کاروں کی ناقدری زمانہ، انسانی نفسیات کی گرہ کشائی اور ماضی پرستی کے المیوں جیسے موضوعات اہم ہیں۔ مقالہ نگار میرزا ادیب کی ڈرامہ نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "اُنھوں نے تاریخی ڈرامے بھی تخلیق کیے۔ جن میں سامراجی ذہنیت، غلامی سے نفرت، محلاتی سازشیں، مسلم سپہ سالاروں کی بہادری، محبت اور فرض کی کش مکش نمایاں ہے۔ یک بابی ڈراموں کے ساتھ کثیر بابی ڈرامے بھی لکھے۔ اسٹیج

ڈراموں اور ریڈیائی ڈراموں کے حربوں کو استعمال کیا۔ ڈرامے کی فنی ضروریات "اتحاد ثلاثہ، لفظی و واقعاتی ایہام، ڈرامائی مفاہمتیں، خارجی علامات اور مزاح کی رنگا رنگی سے بھی کام لیا"۔(23)

"میرزا ادیب کی تخلیقی نثر: انتقادی مطالعہ " کے باب چہارم میں نسیم عباس نے اُن کی خود نوشت سوانح حیات کی بنیادی خصوصیات کا تجزیہ کیا ہے۔ اُن کی آپ بیتی، عجز و انکساری، ماں کی تصویر کشی، مشرقی تعلیمی نظام، اجتماعی خاندان کے تصور اور سادہ بیانیے کے سبب اپنی انفرادیت منوا چکی ہے۔ باب پنجم، ناول نگاری، سفر نامے، خاکوں اور متفرق نثری تخلیقات میں ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ باب ششم میں اُن کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں، ناول، ڈراموں اور سوانحی کتب کا بچوں کے ادب کے انتقادی معیارات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ باب ہفتم میرزا ادیب کی تخلیقی نثر کی نمایاں خصوصیات کے مجموعی جائزے کا مرقع ہے، آخری حصہ ضمائم پر مبنی ہے جس میں میرزا ادیب کے سوانحی آثار مرتب کیے گئے ہیں، اور اُن کی غیر تخلیقی نثر اور شعری نگارشات کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔

موضوع مقالہ: "فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار کا تقابلی مطالعہ"

مقالہ نگار: عارف حسین، 2019ء

نگران مقالہ:

ڈاکٹر عابد حسین سیال، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

فیض احمد فیض کا شمار پاکستان کے اہم اور نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں غم جاناں کا تذکرہ ملتا ہے وہاں کلاسیکی لفظیات میں غم روزگار کا برملا اظہار بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری میں عشق و محبت 'حب الوطنی، وجودی اور مزاحمتی عناصر کے ساتھ ساتھ انقلابی اور اشتراکی طرز فکر بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ فلسطینی نژاد اور فلسطین کے قومی شاعر محمود درویش کو عصر حاضر کے عربی ادب کا نمائندہ شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری بھی عشق و محبت، مہاجرت، جلاوطنی، حب الوطنی، مزاحمت، بیگانگیت اور انقلاب کے تصورات سے مملو ہے۔ عربی زبان میں ان کے تیس کے قریب شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ محمود درویش اور فیض احمد فیض کی شاعری میں خاص طور پر مزاحمت، جلاوطنی

اور بیگانگیت کے افکار مشترک ہیں۔ زیر تجزیہ تحقیقی کام میں اسی تناظر میں مذکورہ شعرا کے شعری افکار کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

جدید عہد میں دنیا ایک گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس پس منظر میں ایک زبان کا ادب دوسری زبان کے ادب سے بھی استفادہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہر زبان کا ادب عالمی سطح پر اثر انداز ہونے والے نظریات کا بھی خیر مقدم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عصر کے عالمی ادیبوں میں کئی جہات سے اشتراکات دیکھے جاسکتے ہیں۔ انہی میں سے عالمی سطح پر شہرت پانے والے شعرا میں محمود درویش اور فیض احمد فیض کے نام بھی آتے ہیں۔ زیر تجزیہ مقالے میں مقالہ نگار نے یہ تحقیق بھی کی کہ دونوں شعرا کے ہاں مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کی پیش کش کی صورتیں کیا ہیں اور ان میں اشتراکات و اختلافات کس نوعیت کے ہیں۔ مزاحمتی ادب کے بارے میں مقالہ نگار عارف حسین لکھتے ہیں:

> " جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی جلاوطنی بھی ایک ایسا امر ہے جو ہمیں ہر خطے اور ہر دور میں ملتا ہے"۔(24)

مقالہ نگار کے مطابق بیگانگیت کی اصطلاح نسبتاً نئی ہے اور اس سے مراد فرد کی تنہائی ہے جو ماحول سے اس کی اور اس کے افکار کی عدم مطابقت کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ فیض اور محمود درویش کے ہاں ان تینوں حوالوں سے نمایاں افکار ملتے ہیں جن کی نوعیتیں بعض جگہ یکساں اور بعض جگہ مختلف ہیں۔ مذکورہ مقالے میں اسی تناظر میں دونوں کے افکار کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں شاعروں کے شعری افکار کا تقابلی مطالعے سے نہ صرف فیض کی شاعری کی بین الاقوامی اہمیت کو اجاگر کرنے میں مدد ملے گی بلکہ اردو ادب اور ادبیات عالم میں اشتراکات کے نکات بھی سامنے لانے میں اہم پیش رفت کا امکان ہے۔

حوالہ جات

1۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو میں اصول تحقیق: منتخب مقالات، اُردو اکیڈمی، لاہور، 2012، ص:7

2۔ عطش درانی، ڈاکٹر، جدید رسمیات تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۶۳

3۔ ایضاً، ص:٦٦

4۔ خرم علیم، اختر حسین جعفری کی شاعری: مزاحمتی تناظر میں، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2016ء، ص:67

5۔ منیبہ صائمہ، تہذیبی آویزش کی روایت اور فکرِ اقبال، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص:136

6۔ فہد جمال، جمشید نواز نایابؔ کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، ۲۰۱۸ء، ص:166

7۔ محمد خالد لطیف، شمس العلما تاجور نجیب آبادی کی علمی و ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور ۲۰۱۹ء، ص:141

8۔ عامر اقبال، منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کا ارتقا: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2019ء، ص:16

9۔ وجیہہ شاہین، اختر ہوشیار پوری: احوال و آثار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2017ء، ص:77

10۔ محمد افضل صفی، احمد فراز کی شاعری کا فنی اور اسلوبیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2016ء، ص:53

11۔ ایضاً، ص:126

12۔ ناصر محمود، جدید ادبی تناظر میں ناصر شہزاد کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، 2017ء، ص:149

13۔ علی شیر، اُردو-پشتو اور پشتو-اُردو لغات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2021ء، ص:107

14۔ حامد اقبال بٹ، ترقی پسند تحریک کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2011ء، ص:154

15۔ شہناز اختر، جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2011ء، ص:108

16۔ نائلہ عبدالکریم، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی کی علمی و ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2018ء، ص:16

17۔ فوزیہ پروین، افسر صدیقی امروہی کی علمی و ادبی خدمات"، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی، 2013ء، ص:5

18۔ سمیرا اکبر، اردو کے فروغ میں ریڈیو کے عالمی اداروں کا کردار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، 2017ء، ص:15

19۔ محمد رمضان، بانگِ درا: طبع اول اور دو معاصر اشاعتوں کے متن کا تقابلی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، بہاولپور، 2014ء، ص:230

20۔ منور مقبول عثمانی، اُردو میں نثری اَسالیب کے تنقیدی مطالعے کی روایات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، 2014ء، ص:15

21۔ انصر عباس، پاکستانی اُردو شاعری میں ملی نغمہ نگاری کی روایت، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2019ء، ص:14

22۔ مسلم شاہ، مرزا مظہر جان جاناں، اصغر گونڈوی اور واصف علی واصف کی غزل میں تصوف کا تحقیقی و تقابلی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2019ء، ص:137

23۔ نسیم عباس، میرزا ادیب کی تخلیقی نثر: انتقادی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، 2018ء، ص:3

24۔ عارف حسین، فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار کا تقابلی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، 2019ء، ص:2

ماحصل

مجموعی جائزہ

انسان فطری طور پر بڑا حساس واقع ہوا ہے، غور و فکر کرنا اس کی عادت کا خاصہ ہے۔ وہ اپنی زندگی میں بے شمار مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ ہر ہر مسئلے پر غور کرنا، اس کے انجام کار کے جاننے کی کوشش کرنا اور اپنی گتھیاں آپ سلجھانے کی فکر میں مصروف رہنا اس کی عادت میں داخل ہے۔ جن مسائل سے اسے دل چسپی ہے وہ فطری طور پر چاہتا ہے کہ ان پر گہری نظر ڈالے اور انھیں بہتر سے بہتر بنائے۔ اس طرح زندگی میں کامیابیاں اس کی اسی تگ و دو اور کدوکاش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اور جس وقت سے اس کا شعور بیدار ہوتا ہے وہ اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ زندگی کے متعدد مسائل اور معاملات میں وہ پہلے سے بہتری اور مزید استحکام پیدا کر سکے۔ بسا اوقات اسے اس کوشش میں ذہنی و فکری طور پر بہت سی الجھنوں اور جدید مسائل کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ پیچیدہ مسئلوں کا حل اور انہیں جملہ شکوک و شبہات سے پاک کر کے ایک سیدھی راہ متعین کرنے والے مقصد کے حصول میں اس کی مسلسل جدوجہد جاری رہتی ہے اور جب تک وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ جاتا اس کی یہ کوشش جاری رہتی ہیں۔ اس طرح حقیقت کی بازیافت اس کے جذبہ تحقیق کو بتدریج پروان چڑھاتی رہتی ہے اور وہ مبہم اور غیر متعین واقعے کو مشاہدات اور دلائل و براہین کی روشنی میں پرکھنے کا عادی بن جاتا ہے۔

آج کی دنیا جس برق رفتاری سے سائنسی میدان کی طرف گامزن ہے اور نئے نئے تجربات و مشاہدات جس طرح مختلف سمتوں میں انسان کو آگے کی طرف بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کل تک تاریخی اوراق میں جو واقعات خواب و خیال تھے آج ہم انھیں حقیقت کے پردے پر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ہماری آنکھیں انھیں دیکھ کر خیرہ ہیں کہ یہ کیا تماشا ہے؟ اس ترقیاتی ماحول میں ایک حساس انسان فطری طور پر ہر مسئلے اور ہر بات کی نشاندہی کو مشاہدات و عملیات کی کسوٹی پر پرکھ کر ثبوت کا خواہاں ہے۔ ان ہی مشاہدات و عملیات کے ذریعہ صداقت تک کی رسائی اور کسی امر نامعلوم کو حقیقت کے آئینے میں دیکھنے کا نام یا بالفاظ دیگر اس کی طلب میں تگ و دو اور جستجو کا نام دراصل "تحقیق" ہے۔ اگر حقیقت کی تلاش ایک امر موہومہ ہوتی تو دنیا میں آج علمی و عملی سرگرمیاں ناپید ہوتیں اور انسان اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان ترقیوں سے محروم بھی ہوتا جو یکسر اس کی فطرت کے منافی تھا۔ اسی حقیقت کی بازیافت اور نت نئے حقائق کی

جستجو نے اس کے جذبہ تحقیق کو ہمہ سو فروغ دیا اور وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں انکشافات و انکشافات کی سمت بڑھتا اور دلائل و براہین اور شواہد یکجا کرتا گیا اور بالآخر تحقیق و تنقید کے ہر زاویے سے اسے جانچ پرکھ کر ایک خاص نتیجے پر پہنچا۔

عہد حاضر میں جو نت نئی ترقیاں اور آئے دن حیرت انگیز اختراعات و ایجادات ہو رہی ہیں یہ دراصل انسان کی اسی فکری گہرائی اور بالیدہ ذہنی کا کرشمہ ہیں جس کا مرکز و محور اور سرچشمہ تحقیق ہے۔ اب توریل اور ہوائی جہازوں کی باتیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں کیونکہ ہم آئے دن اس میں سفر کرتے ہیں لہذا ان کی برق رفتاری اور سرعت رفتار پر ہمیں قطعاً کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن ٹیلی ویژن، سمارٹ فون، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ ،انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور لمحہ بہ لمحہ نت نئی ایجادات و اختراعات ایسی تحقیقات ہیں جن پر ہمیں حیرت و استعجاب ہوتا ہے۔ اگر انسان کی تحقیق و جستجو راہِ سفر اختیار نہ کرتی اور منزل بہ منزل کائنات کے رازہائے سربستہ پر غور و خوض کر کے حقائق کے یہ آبدار موتی نہ نکالتی تو ہم ان ساری ایجادات واختراعات سے یکسر محروم رہتے اور ان سارے علوم و فنون سے ہمارا ذہن یکسر خالی رہتا۔ علوم و فنون کی ترقیوں اور تعلیم و تربیت کی سہولتوں کے سبب ہی ہماری تحقیقی سرگرمیاں تیز تر ہوئیں

تحقیق کا لفظ اتنے تنوع اور وسعت کا حامل ہے جتنی کہ خود زندگی۔ تحقیق کا لفظ یوں تو لغوی اعتبار سے بھی زیادہ با معنی اور زرخیز ہے اور اپنے اندر تحقیق کے اصطلاحی مفہوم کو سمیٹتا نظر آتا ہے لیکن اصطلاحی طور پر یہ لفظ کہیں زیادہ وسعت اور مفہوم کا حامل ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک لفظ ہے لیکن اپنے اندر بے پناہ روشنی اور قوت و توانائی رکھتا ہے۔ تحقیق کی تمام علوم میں یکساں اہمیت ہے اور اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ بحیثیت مجموعی تحقیق کو ہم علم میں اضافے کی خاطر موجود لیکن پوشیدہ حقائق کی فنکارانہ تلاش کا نام دے سکتے ہے۔

تحقیق ادبی ہو یا سماجی علوم سے متعلق، اس کے بنیادی اصول تقریباً یکساں ہیں۔ کیونکہ کسی بھی واقعے کو پرکھنے کے لیے داخلی اور خارجی شہادتوں کی ضرورت ہوتی ہے، نیز ان شہادتوں کی معروضی انداز میں تصدیق اور چھان پھٹک کے بعد ہی اس واقعے یا مفروضے کی قطعیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ ادبی تحقیق بھی کم و بیش وہی پیمانے استعمال کرتی ہے جو دوسری تحقیقات میں مروج ہیں۔ نئی ادبی تحقیق اب عام اور روایتی اصولوں سے جدید سائنٹفک اصولوں کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ اُردو میں بھی ادبی تحقیق اگرچہ گزشتہ صدی سے جاری ہے تاہم دورِ حاضر میں تحقیق کے مختلف مراحل کو سائنسی خطوط پر استوار

کرنے پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ اور یہ بتانا ضرور ہے کہ ادبی تحقیق اگرچہ منہج کے اعتبار سے روایتی تحقیقی طریقوں کی پاسدار ہے لیکن ادب کے اصناف و موضوعات کی طرح اپنا الگ مقام و مزاج رکھتی ہے۔ لہذا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے آیئے ذیل میں اس کے مباحث کو آگے بڑھاتے ہیں۔

تحقیق نظریات اور ماخذ تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ تحقیق سے مزید علوم کا حصول آسان اور ممکن ہو جاتا ہے۔ یہ علم کے حصول کا منتظم ذریعہ ہے جس سے کارگردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت سے آگاہی، تو ہمات سے چھٹکارا، تعصبات سے بچاؤ اور اشیا کی اصل تک رسائی تحقیق کے اولین مقاصد ہیں۔ ترقی کا عمل تحقیق ہی کی بدولت اس معراج پر ہے اور اسی کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے۔ تحقیق کے وسیع مقاصد حقائق تک رسائی، انسانیت کی خدمت، نئے نظریات کی تشکیل وغیرہ ہیں۔ لیکن محدود پیمانے پر تحقیق کے اپنے متعلقہ مقاصد بھی ہوتے ہیں جو ان سوالات یا مفروضوں سے تشکیل پاتے ہیں جن کے لیے متعلقہ شعبے میں وہ تحقیق انجام دی جاتی ہے۔

زیر تحقیق مقالہ بعنوان "پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات:2010ء کے بعد" میں پاکستانی جامعات میں ہونے والی اُردو تحقیق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جامعات میں کی جانے والی تحقیق کو مقالہ نگار تحقیقی مقالہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ تحقیقی مقالہ میں کوئی علمی مسئلہ حل کیا جاتا ہے یا کوئی نئی بات کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات کہی جائے وہ بنیادی طور پر نئی ہو۔ ایک بات پہلے کہی جا چکی ہے اس میں جدید معلومات کا اضافہ بھی تحقیق ہے۔ جو بات پہلے کہی گئی ہے اگر اس میں غلطی یا تسامحات ہیں تو ان کی تصحیح بھی تحقیق ہے۔ مسئلہ کے کسی نئے پہلو پر بحث کرنا یا روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ کسی طے شدہ مسئلہ پر دوبارہ روشنی ڈالنا بھی تحقیق ہے۔ تحقیق میں جذبات یا قیاس آرائی کو دخل نہیں ہونا چاہئے اور نہ اسے حمایت یا مخالفت سے واسطہ رکھنا چاہئے۔ محقق کا نقطہ نگاہ اور طریقہ کار سائنسی ہونا چاہئے۔ سائنسی طریقہ کار کے ذریعہ آدمی شک کو واضح تلاش کے عمل میں تبدیل کر کے بار آور فائدہ اٹھاتا ہے۔ مقالہ نگار نے اس مقالے میں جہاں تحقیق اور اس کے مباحث سے بحث کی ہے وہیں محقق کی ذمہ داریوں کو بھی بیان کی ہے۔ جامعات میں پی ایچ ڈی کے وہ طلبا جو ریسرچ کا تحقیق کا کام کر رہے ہوتے ہیں انہیں اسکالر یا ریسرچر کہا جاتا ہے، اُردو ادب میں اس کے لیے محقق کی اصطلاح رائج ہے۔

محقق کے لیے ضروری ہے کہ اُس کا مطالعہ بہت وسیع ہونا چاہئے۔ اپنے مخصوص مضمون کے علاوہ اسے متعلق مضامین کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔ مثلاً اردو کے محقق کے لیے فارسی اور عربی جاننا بھی مفید ثابت ہو

گا۔ ادب کے محقق کے لیے عہد متعلقہ کے تاریخی، معاشی و معاشرتی حالات کا علم بھی ضروری ہے۔ اسے عروض، مبادیات فلسفہ و تصوف وغیرہ سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ اسی طرح تاریخ کے محقق کو جغرافیائی علوم ، معاشیات اور سماجی علوم کا مطالعہ لازماً کرنا ہو گا۔ وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ گہری نظر، تنقیدی شعور اور دیانت کی بھی ضرورت ہے۔ واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا یا حقائق پر پردہ ڈالنا تحقیقی دیانت کے خلاف ہے۔ شبلی نعمانی کا شوق تحقیق انہیں مصر و شام و ترکی تک لے گیا۔ سید سلیمان ندوی نے کالج کی آرام دہ اور معقول تنخواہ کی ملازمت ترک کر کے ساری عمر دارالمصنفین کی علمی خانقاہ میں ایک معمولی مشاہرہ پر گزار دی۔
"پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات: 2010ء کے بعد" کو مربوط و مبسوط کرتے وقت یہ بات بھی سامنے آئی کہ نوجوان محققین کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مقالہ جلد سے جلد مکمل ہو جائے۔ لیکن تحقیق کا تقاضا اس کے برعکس ہے۔ تحقیق کے لیے طویل وقت کی ضرورت ہے۔

پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحان میں نمایاں اضافہ ہوا ہے ۔ جامعات کے شعبہ اُردو کی کارکردگی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف جامعات اپنی استطاعت اور قابلیت کے مطابق تحقیق کے رجحان کو فروغ دے رہی ہیں لیکن مختلف جامعات کے اُردو شعبہ جات میں رابطے کا فقدان نظر آتا ہے۔ کن موضوعات پر تحقیق ہو چکی ہے؟ کون سے عنوانات یا موضوعات زیر تحقیق ہیں؟ اور کون کون سے موضوعات تحقیق کے قابل ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے حوالے سے جوابات مطلوب ہیں ۔ جامعات کے باہمی رابطے کے فقدان کی وجہ سے موضوعات اور تحقیق و تدوین میں تکرار نظر آتی ہے۔ بعض اوقات لا علمی اور کبھی مصلحت کے سبب ایک ہی موضوع پر مختلف محققین تحقیق کر رہے ہوتے ہیں ۔ یہ صورتحال اُردو زبان ، وقت، وسائل اور صلاحیتوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہے ۔ اس صورت حال کے پیش نظر تحقیق کے رجحانات کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں تحقیق میں نئی جہتوں کی تلاش کی طرف سفر مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے جو کسی بھی طرح اُردو زبان وادب کے لیے نیک شگون نہیں۔

"پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات: 2010ء کے بعد" میں اُردو تحقیق کے ابتدائی دور کا بھی اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ میر تقی میر کے تذکرہ "نکات الشعرا" کو قدیم ترین تذکرہ مانا جاتا ہے۔ اسی طرح سراج الدین علی خان آرزو کی "نوادر الالفاظ" کو اُردو کی ابتدائی لغت کہا جاسکتا ہے جو کہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سامنے آئی۔ خان آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی "غرائب اللغات" کی درستی کی۔ سودا اور غالب کے

یہاں بھی تحقیق اپنی ابتدائی اور مبہم صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔غالب کے خطوط، تقریضوں اور دیباچوں میں زبان وفن کے جو نکات بیان کئے گئے ہیں اور محاورات کے ضمن میں جو اختلافی بحث طلب مسائل اٹھائے گئے ہیں وہ اُردو تحقیق نگاری میں ابتدائی شواہد فراہم کرتے ہیں۔

اُردو میں ادبی تحقیق کا آغاز دور سرسید سے ہوتا ہے۔حالی، شبلی، آرزو، اور سرسید کے ہاں تصیح متن اور مقالات میں تحقیقی شعور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ سرسید احمد خان مغربی آداب تحقیق سے واقف ہو چکے تھے جس کا بین ثبوت "آئین اکبری" ہے۔ آئین اکبری کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں بہت فرق ہے۔ دوسرا ایڈیشن زیادہ بہتر شکل میں تحقیق کے طریقہ کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذرائع معلومات، ماخذ اور اشاریہ کے التزام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ محسن الملک اور حالی وغیرہ نے سرسید کی نئی محققانہ "اپروچ" کو تسلیم کیا اور اسے تقویت بھی پہنچائی۔ چراغ علی کے "العلوم الحمدیہ والاسلام" مقالہ کا شمار اُردو تحقیق کے ذیل میں کیا جانا چاہیے ۔ آزاد نے اردو تحقیق کے دامن کو وسعت دی اور " دربار اکبری، سخن دان فارس اور آب حیات" لکھ کر اپنے ذوقِ تحقیق کی سیرابی کا اہتمام کیا۔ فارسی اور بعض دوسری زبانوں میں لسانیاتی سطح پر جو مشترک عناصر تھے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آب حیات میں پچاس سے زائد کتابوں کے حوالے شامل کیے گئے ہیں۔ حالی نے کئی سوانح حیات لکھی ہیں، وہ سوانح کی ترتیبِ واقعات و حقائق کی تلاش و جستجو اور صحت بیان پر توجہ دیتے ہیں اور باضابطہ مآخذ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ شبلی کے یہاں استقرائی تحقیق کی بعض صورتیں نمایاں ہوتی نظر آتی ہیں۔ شبلی نے فارسی، عربی اور تاریخ کے مآخذ سے معلومات فراہم کیں۔ المامون، الفاروق، علم الکلام اور فارسی ادبیات کی کتاب شعر العجم میں انھوں نے مختلف عربی و فارسی شعرا و ادبا، تذکرہ نگاروں اور انگریزی مورخین سے استفادہ کیا ہے۔ اردو میں تحقیق کے حوالے سے برج موہن وتاتریہ کیفی، پروفیسر محمد شفیع، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر محمد باقر، قاضی فضل حق اور ڈاکٹر وحید مرزا کے ہاں حزم واحتیاط، ژرف نگاری سے متون کا مطالعہ، براہ راست مآخذ کا استعمال جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اسے "ہم دبستان لاہور" کہتے ہیں۔

اُردو تحقیق کی روایت میں انفرادی کام کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں میں اُردو میں تحقیقی کام شروع کر کے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جانے لگیں۔ اُردو کے آغاز کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں میں پیر حسام الدین راشدی، عین الحق فرید کوٹی، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر، پنڈت کیفی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ،ڈاکٹر محمد شہید اللہ، پروفیسر شبیر علی کاظمی، ڈاکٹر عنایت اللہ، ڈاکٹر محمد صابر، ڈاکٹر عباد اللہ کیانی، سہیل بخاری، سید مصطفی علی بریلوی، افسر امروہوی اور ڈاکٹر سلطانہ بخش وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں جبکہ نسیم امر

وہوی اور وارث علی سرہندی نے لغت کے حوالے سے کام کیا۔ مسلم ضیائی نے غالبیات کے حوالے سے کام کیا۔ ان کا ایک بڑا کام غالب کے منسوخ دیوان کی اشاعت ہے ۔ نصیر الدین ہاشمی کا نام بھی اردو تحقیق میں اہمیت کا حامل ہے ان کی کتابوں میں " دکن میں اردو، سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری، مدراس میں اُردو، دکنی قدیم اردو" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے قلمی کتابوں کی وضاحتیں وفہرستیں بھی مرتب کی ہیں ۔ مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کا طریقہ کار سائنٹفک اُصولوں پر مبنی ہے انھوں نے فائز دہلوی کا دیوان مرتب کیا، متفرقات غالب تصنیف کی ۔ اردو کا شاہی اسٹیج، اودھ کا عوامی اسٹیج جیسی تحقیقی کتب لکھیں اور انیس کے کلام کے متن کی تصحیح بھی کی ہے۔ قاضی عبد الودود کا مضمون "مثنوی مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق "کے عنوان سے، پٹنہ میں شائع ہوا جو تحقیق کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہے ۔ "شاہ کمال علی دیواروی عظیم آبادی" کے عنوان سے طویل تحقیقی لکھا۔ مضمون تذکرہ شعر امصنفہ ابن طوفان، دیوان جوش، قاطع برہان جیسی کتابیں ترتیب دیں۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے "عیارستان" اور اشتر و سوزان " بھی تحقیقی اہمیت رکھتے ہیں۔

امتیاز علی خان عرشی نے غالب کے حوالے سے تحقیق پیش کی ہے۔ پروفیسر عبد القادر سروری کا تعلق دکن سے ہے۔ اپنی تحقیقی کتاب "جدید شاعری" میں انھوں نے بیانیہ، غنائی، ڈرامائی، اخلاقی، ہجویہ اور مدحیہ وغیرہ اقسام کیشاعری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کی اور واضح نتائج اخذ کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن" کا متن ترتیب دیا۔ کلیات سراج، شاہ صدرالدین کی " مراۃالاسرار" کی تدوین واشاعت بھی کی۔ پروفیسر حامد حسن کی معروف کتاب "داستان زبان اردو" ہے انھیں اردو ادب کے مؤرخ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ شیخ محمد اکرم ماہر غالبیات کی طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان کی کتب" غالب نامہ، آب کوثر، موج کوثر اور رود کوثر" سے ان کی تحقیق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سید محمد نے "ارباب نثر اردو" کے نام سے کتاب لکھی ہے جس میں پہلی بار انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی نثری خدمات کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے ترتیب متن میں خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ "گلشن گفتار"، دیوان عبد اللہ قطب شاہ، محمد علی عاجز کی مثنوی "ملکہ مصر" اور مثنویات میر جیسے کام انجام دیے۔ نوب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی کا نام بھی تحقیق کے حوالے سے اہم ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا فن تحریر اختصار سے عبارت ہے۔ وہ تحقیق کے خار زار سے گلاب چن لاتے ہیں۔ زندگی کے عام معاملات ہوں یا تحقیق، تنقید و ادارات کے بحر بے کراں، تاریخ ادب اُردو کا وسیع میدان ہو یا

مثنوی کدم راؤ پدم راو کی تالیف کی سنگلاخ چٹانیں، مصنف ایک بہادر جرنیل کی طرح پوری استقامت سے پیش قدمی کرتے ہیں۔ عبد القادر سروری نے عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے کام کیا۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں اردو مخطوطات کی تفصیلی فہرست، اردو کی ادبی تاریخ، زبان اور علم زبان کے علاوہ مختلف کتابوں کی ترتیب و تدوین کی ہے۔ سید وقار عظیم نے امانت کی "اندر سبھا"، شرر کی "فردوس بریں" اور آغاحشر کاشمیری کے منتخب ڈرامے مرتب کر کے مبسوط مقدموں کے ساتھ شائع کیے اور دیوان مومن کا انتخاب بھی ترتیب دیا ہے۔

لسانی تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر حسین خان، ڈاکٹر محی الدین قادری زدر، سید سلمان ندوی، احتشام حسین، عبد القادر سروری، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، شوکت سبزواری، عین الحق فرید کوٹی، خلیل صدیقی، اقتدار حسین خان، الہیٰ بخش اختر اعوان، رشید ندوی، ڈاکٹر سہیل، عبد المجید سندھی، نصیر حسین خیال، فارغ بخاری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قدیم دکنی متون کی تلاش اور اس کی تدوین کے حوالے سے ڈاکٹر مولوی عبد لحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سید محمد شمس قادری، ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر مسعود حسین خان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، اکبر الدین صدیقی، سخاوت مرزا، ثمینہ شوکت، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، آمنہ خاتون اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ تحقیق حقائق کی جستجو اور بازیافت کا نام ہے یہ علم و فن کے ہر شعبے کیلئے اشد ضروری ہے۔ یہ محض آثار قدیمہ کی تلاش کا کام نہیں بلکہ اس سے تحقیقی منظر نامے پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اکرام چغتائی، خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر اسلام فرخی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی وغیرہ کا نام اہم محققین میں شامل ہے۔ سرفراز علی رضوی اور افسر امروہوی نے مخطوطات انجمن ترقی اردو کی فہرست مرتب کی۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی سائنسدان ہونے کے باوجود ادب سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال پر تحقیقی کام کیا ہے اور اقبالیات کے حوالے سے کئی قابل ذکر تحقیقات پیش کی ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں ابواللیث صدیقی نے لغات اور الفاظ کے حوالے سے کام کیا اور ایک مقالہ "چند قدیم لغات" لکھا، وہاں لغات ہی کے سلسلے میں سخاوت مرزا نے "تحقیقات الفاظ ہندی غرائب اللغات" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ غرائب اللغات مولفہ عبد الواسع ہانسوی کے الفاظ کی تحقیق پر خان آرزو نے وقیع کام کیا تھا جسے ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے مقدمے اور تصحیح کے ساتھ مرتب کیا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل مختلف جامعات کے ساتھ منسلک رہے۔ انھوں نے اردو تحقیق کو وسعت دینے اور اس کی ترقی میں اہم

کردار کیا ہے۔ وہ حوالہ جات اور مکمل ماخذات کے ساتھ تحقیقی مقالات پیش کرنے کے فن سے آگاہ ہیں۔ تحقیق کے میدان میں ان کی کتاب "اردو تحقیق: صورت حال اور تقاضے "اہمیت کی حامل ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا نام بھی اردو ادب اور تحقیق میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔

اردو تحقیق کی یہ خوش نصیبی ہے کہ بہت سے لوگوں نے نجی اور انفرادی طور پر بھی تحقیق میں قابل قدر کاوشیں انجام دی گئی ہیں۔ مولوی عبد الحق، عندلیب شادانی، سید عبداللہ، مولوی محمد شفیع، شوکت سبزواری ، اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، ابواللیث صدیقی، سخاوت مرزا، قیام پاکستانی سے قبل بھی تحقیق سے تعلق کے حامل تھے۔ انھوں نے اپنی عالمانہ اور محققانہ کاوشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بعد ازاں تحقیق میں جن افراد نے نمایاں کام کیا ان میں کلب علی خاں فائق ، اسمٰعیل پانی پتی اور خلیل الرحمٰن داؤدی ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ڈاکٹر نجم الاسلام، غلام رسول مہر، اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محمد ریاض کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ بیسوں صدی کے نصف سے لے کر آخری عشروں میں مختلف حوالوں سے تحقیق کرنے والوں میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، محمود حسین، عبدالواحد سندھی، آصف جیلنی، مسلم ضیائی، سید وقار عظیم، مختار زمن، مسعود احمد برکاتی، ریاض صدیقی، عبدالقادر سروری، سید شبیر کاظمی، عبدالماجد دریا آبادی، شفقت رضوی، پروفیسر شریف کنجاہی، فارغ بخاری، ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی، کامل القادری، ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری، سید سبط حسن، حنیف فوق، سحر انصاری اور ڈاکٹر عطش درانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے تحقیق کے حوالے سے مختلف کام کیے۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ادبی تحقیق کے بنیادی اصول کے حوالے سے لکھا اور اردو میں تنقید کے ارتقا کے حوالے سے اپنی تحقیق پیش کی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے میر حسن کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی "خانہ میر حسن" کے بارے میں بھی تحقیقی معلومات پیش کی ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالب کے ایک غیر مطبوعہ خط کے حوالے سے تحقیق کی ہے جو انھیں انگلستان کے کتب خانے سے ملا۔ نثار احمد فاروقی نے غالب اور غالبیات کے ضمن میں گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ وہ غالب کے معترف بھی ہیں اور نقادو محقق بھی۔ پروفیسر اختر انصاری، حسن خاج سید جوادی، مودود احمد صابری، شمیم حنفی، خورشید قائم خانی، احمد رئیس، امیر حسین علی امام اور محمد علی صدیقی نے بھی تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ڈاکٹر مظفر عباس کا مضمون "اردو کا پہلا سفر نامہ" ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں سید احمد شہید کی سوانح عمری اور یوسف حسین کمبل پوش کے سفر نامہ "عجائبات فرنگ" کے حوالے سے بحث

کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے "شیکسپیئر کے اردو ترجمے" کے عنوان سے شیکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔

جامعات اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے آخری ادارہ ہوتی ہیں جس کے بعد رسمی تعلیم و تدریس ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جگہ یا ادارہ جہاں اعلیٰ تعلیم کی سہولت حاصل ہو، تحقیق کی جاتی ہو اور اس تحقیق کے بعد ڈگریاں تفویض کی جاتی ہوں، جامعہ، دانش گاہ یا یونیورسٹی کہلائی جاتی ہے۔ "یونی ورسٹی" کا ایک اور مفہوم "میکسم گورکی" کی آپ بیتی میں نظر آتا ہے۔ آپ بیتی میں وہ "میری یونی ورسٹیاں" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس باب کے تحت اُس نے اپنی زندگی کے اُن دنوں کے بارے میں لکھا ہے جب وہ روٹی اور روزگار وغیرہ کے سلسلے میں سرگرداں تھا۔ اسے ایک ہوٹل میں بیرے کی نوکری ملی جس سے اس کی زندگی کا پہیہ رواں دواں ہوا۔ گورکی کے مطابق وہ دن جب وہ اور اس کے دیگر دوست روسی انقلاب کے نتیجے میں ایک آزاد مملکت کا خواب سجاتے تھے، بہت حسین تھے۔ وہ اپنے دوستوں کی باتیں سن کر ان پر غور و فکر کرتا۔ اسی غور و فکر کی وجہ سے ایک بیرے کی زندگی بدلی اور وہ انقلاب پسند تحریک کا سرگرم رکن بن گیا۔ یہی نوجوان لینن کے قریبی ساتھیوں میں شمار کیا جانے لگا اور دنیا کے بڑے اعزاز "نوبل انعام" کا حقدار ٹھہرا۔ اپنی ہوٹل میں گزری زندگی کو اُس نے "میری یونی ورسٹی" کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے یہاں سے جو علم حاصل کیا اسی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے اپنی آنے والی زندگی کا خاکہ "ڈھانچہ" تشکیل دیا اور پھر دنیا میں کامیاب بھی ٹھہرا۔

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ "یونی ورسٹی" کے اصل معنی و مقصد کو تو گورکی نے ہی سمجھا۔ مگر آج کے دور میں ہم نئے تصورات سے غافل نہیں رہ سکتے اور ڈگریوں، اسناد کی افادیت و اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ جامعات میں مختلف طرز کے امتحانات ہوتے رہتے ہیں، جن میں رسمی اور غیر رسمی وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح اداروں میں بھی مختلف نوعیت کے مقابلہ جاتی امتحانات ہوتے ہیں جو زیادہ تر یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل محققین کی معاشرے، سماج یا سوسائٹی کے لئے خدمات حاصل کرنے کوشش ہے۔ جامعات میں تحقیق کی افادیت پر نمایاں علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ عام قاری بھی اپنی ناقدانہ رائے پیش کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ موجودہ تناظرات میں اعلیٰ تعلیم خاص طور پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کی افادیت فی زمانہ کم معیار کی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ڈگری کے حصول اور معاشی فوائد کے لئے

محققین کی کثیر تعداد تحقیق پر زیادہ توجہ نہیں دیتی۔اسی لئے بعض اوقات ان محققین کی تحقیقی کاوشوں پر تنقیدی تاثرات بھی سامنے آتے ہیں اور ان کے کم معیارات پر بات کی جاتی ہے۔

درج بالا حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں ہونے والے مد و جزر یا تعمیر و تشکیل کے جدید عہد میں داخلے کے لیے جو افرادی قوت، ذہن اور سوچ ضروری ہے، ان کی فراہمی کے لیے بنیادی و اساسی کارخانہ "یونیو رسٹیاں" ہی ہیں۔جامعات سے فارغ التحصیل محققین سے ہی علم و ادب کے میدان کا نظام چل رہا ہے۔جامعات کے تحقیقی معیار کے حوالے سے جو بھی اختلافات ہوں ،یہ بھی حقیقت ہے کہ جامعات میں "تازہ لہو" باہم پہنچا کر ہی تحقیق اور معیار کے نئے منظرنامے تیار کئے جا سکتے ہیں۔وہ ناقدین یا دانش ور جو جامعات کے تحقیقی و تنقیدی کاموں سے نا امید ہیں، وہ بھی ان اداروں کو تحقیق اور معیاری تحقیق کے حوالے سے مفید مشوروں سے بہرہ مندی کریں اور انھیں نوشتہ دیوار سے ہم آہنگ ہونے کے لئے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔

برصغیر میں جنگ آزادی کے بعد انگریزی تعلیم کی ضرورت کے مطابق تعلیمی ادارے وجود میں آئے مگر ان اداروں کی توسیع کا کام سست رفتار سے ہوا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف مخصوص لوگ ہی اعلیٰ تعلیم سے فیض یاب ہو سکے۔قیام پاکستان کے بعد اس تعلیمی سلسلے کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھانے کی سعی شروع ہوئی مگر اب بھی اس ملک کی کثیر آبادی اپنا نام بھی نہیں لکھ پاتی حالانکہ حرف شناسی اور کسی لفظ کو ضبط تحریر میں لانے کے مراحل بہت بعد میں آتے ہیں۔مملکت خداداد میں متعدد پرائیویٹ یونی ورسٹیوں اور تکنیکی کالجوں کے باوجود تعلیمی ضرورتوں کے اعتبار سے اداروں کی تعداد بہت حد تک کم ہے۔ تحقیقی اداروں کی کمی سے نقصانات کے بارے میں پرنٹ،الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر خصوصی تجزیے کیے جاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں خاص طور پر جامعات کی استعداد کار بڑھانے میں مصروف عمل صوبائی اور مرکزی حکومتیں عوام کو خواندہ،" حرف شناس" اور تعلیم یافتہ بنانے کے لیے اپنی وسائل استعمال کر رہی ہیں۔ان تمام وسائل اور سہولیات کے باوجود مغربی یا ترقی یافتہ ممالک سے موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کے میدان میں پاکستانی جامعات بہت پیچھے ہیں۔

ہندوپاک کی تاریخ کے تحقیقی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس خطے کی مختلف جامعات کے شعبہ اُردو صد سالہ معیاد پوری کر چکے ہیں اور کچھ جامعات میں پچاس برس سے زائد ہو چکے ہیں۔پاکستان میں 1947ء کے بعد کئی کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اُردو کا شعبہ قائم کیا گیا۔ یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے

کہ مختلف تعلیمی اداروں میں پہلے سے قائم شعبہ اُردو کو قومی زبانی کی تنگ نظری کی وجہ سے محدود یا بند کرنے کی کوشش ہوئی۔ ان مشکل حالات کے باوجود جامعات کے شعبہ اُردو نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنی تعلیمی و تحقیقی سرگرمیوں کی بدولت تحقیقی میدان میں مصروف عمل ہیں۔ پاکستانی جامعات کے محققین اور اساتذہ کی تعداد کا اندازہ کیا جائے تو یہ لازمی طور پر سینکڑوں میں ہو گی۔ ان میں سے ایک غالب تعداد اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان محققین کی ایک کثیر تعداد تعلیم و تحقیق کے میدان میں مصروف عمل ہے۔ ان تحقیقی سرگرمیوں کی وجہ سے اُردو تحقیق کا درخت پھل پھول رہا ہے اور لسانیات کے شعبے میں اپنی دھاک بٹھا رہا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ کی تحقیقی کاوشیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو رہی ہیں۔ کئی ماہرین لسانیات اور مصنفین کی کتب بھی شائع ہو کر قارئین کے ذوق کی تسکین کر رہی ہیں۔ اُردو کی مختلف جہات کے حوالے سے جامعات میں ورکشاپیں، مذاکرے اور سیمینار منعقد ہو رہے ہیں جن سے اُردو تحقیق کی روایت پروان چڑھ رہی ہے۔

درج بالا سطور اس بات کا اشارہ ہیں کہ جامعات میں اُردو تحقیق جاری ہے۔ جامعات میں تحقیق کی روایت کے حوالے سے شعبہ اُردو کے اساتذہ اور محققین کی طویل فہرست ہے۔ اس فہرست میں رشید احمد صدیقی، ، ڈاکٹر رشید حسن خان نور الحسن ہاشمی، عندلیب شادانی، ، سید احتشام حسین، آلِ احمد سرور، اختر اورینوی، سید اعجاز حسین، سید عبد اللہ، خواجہ احمد فاروقی، وحید قریشی اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی جیسے ماہرین موجود تھے جن کی بدولت جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحان میں اضافہ ہوا۔ ان ماہرین کی تحقیقی سرگرمیوں نے برصغیر کے علاوہ مغربی ممالک کی متعدد جامعات میں بھی اُردو تحقیق کے منظرنامے کو وسعت عطا کی جس سے اُردو کی تعلیم، تدریس اور تحقیق کے نئے در وا ہوئے۔

"پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات: 2010ء کے بعد" میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اُردو کے محققین اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد معاشرے کے دیگر شعبوں میں بھی خدمات سر انجام دیتی رہی ہے۔ یہ حضرات اُردو اور دیگر زبانوں یا مضامین کے ماہرین سے ہم آہنگی بنا کر اپنے تحقیقی کاموں کو نمایاں بنانے میں سرگرم رہے۔ اس قبیل کے افراد نے شعبہ اُردو کو اُردو زبان کے ابتدائی ماہرین لسانیات، دانش وروں ، تخلیق کاروں اور اُردو ادب کی تحریکوں سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا جس وجہ سے جامعات اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ انہی کی تخلیقی و تحقیقی کاوشوں کی بدولت تقسیمِ ہند کی وجہ سے پیش آنے والے مشکل حالات میں ادبی جہات کو سمیٹے رکھا جس سے نئے ادب کے رنگ ڈھنگ میں بھی تبدیلی نظر

آئی۔ اُردو ادب کی اسی نسل نے جامعات میں مختلف ادبی تحاریک کا آغاز کیا جس سے اُردو زبان، تخلیقات، تحقیقات اور تصنیفات کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیاں اور خامیاں قارئین کے سامنے آئیں۔ تنقیدی ادب کا آغاز ہوا ، جس میں صاحبان دانش نے بھرپور حصہ لیا اور اُردو زبان و ادب کو ترقی وارتقا کی نئی منازل سے آشنائی ہوئی۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد جامعات میں اُردو تحقیق کا رجحان تبدیل ہوا جس کا ذکر ڈاکٹر معین الدین عقیل اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے بھی وضاحت سے کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ محققین میں اعلیٰ ملازمت کی خواہش تھی ۔ تخلیق اور تحقیق کی طرف رغبت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ وہ دور تھا جب حکومتی سطح پر ملازمین کے مشاہرے بڑھائے گئے۔ اس پس منظر میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح اساتذہ کے طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ یہ ہی وہ زمانہ ہے جب شعبہ اُردو میں مزید ترقی اور وسعت کے امکانات سامنے آئے۔ تقسیمِ بنگال کی وجہ سے اُردو زبان و ادب کو نئے موضوعات میسر آئے اور پاکستانی ادب ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اسی تناظر میں جامعات میں بھی تحقیق کے رجحانات میں فرق دیکھنے کو ملا۔ اس عرصے میں جامعات میں تنظیمی طور پر تبدیلیاں بھی نظر آئیں۔ ان تنظیمی تبدیلیوں میں جامعات میں اساتذہ کی تقرری کا طریقہ کار بھی شامل تھا۔ سفارشی اور کم صلاحیت کے حامل اساتذہ کی تقرری سے جامعات میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تحقیق کا شعبہ بھی بری طرح متاثر ہوا۔ جب تدریس و تحقیق سے بے بہرہ حضرات منتخب ہوں اور اُن کی ترجیحات میں تحقیق سے زیادہ معاشی فوائد کا حصول ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تحقیق کا معیار کیسا ہو گا؟۔

مذکورہ مسائل کے باوجود مختلف جامعات اُردو تحقیق کی روایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ وہ جامعات جن میں ایم اے ، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے اُردو پروگرام ہیں، اُن میں بطور خاص تحقیق کا رجحان نمایاں ہے۔ اِن جامعات کے اساتذہ کی تحقیقی کاوشیں مختلف تحقیقی رسائل و جرائد کی زینت بھی بن رہی ہیں۔ مختلف جامعات سے تعلق رکھنے والے تحقیق میں مصروف اساتذہ میں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انوار احمد ، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر نجیب جمال، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈاکٹر عقیلہ بشیر، ڈاکٹر شفیق احمد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر فخر الحق نوری، ڈاکٹر یوسف خشک، ڈاکٹر قاضی عابد، ڈاکٹر راشد حمید، ڈاکٹر عامر سہیل، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری، ڈاکٹر اشرف کمال، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر طارق ہاشمی، ڈاکٹر وسیم انجم، ڈاکٹر شیر علی، ڈاکٹر کامران کاظمی

،ڈاکٹر مجاہد عباس،ڈاکٹر منور ہاشمی،ڈاکٹر سید عون ساجد،ڈاکٹر محمد نوید،ڈاکٹر نثار ترابی،ڈاکٹر طاہر نواز،ڈاکٹر غلام فرید،ڈاکٹر محمد ایوب صابر اور ڈاکٹر ضیاء الحسن وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد نے زیادہ عرصہ اندرون اور بیرون ملک مختلف یونیورسٹیوں میں ادبی تحقیق کو پروان چڑھایا۔"اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ "ان کا خاص تحقیقی کام ہے۔ڈاکٹر ظفر اقبال جامعہ کراچی میں تحقیق اور تدریس ادب میں مصروف رہے۔ وہ وفاقی اردو یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ بھی رہے۔ڈاکٹر یوسف خشک نے "اُردو سندھی کے ادبی روابط "کے حوالے سے تحقیقی کام کیا۔سندھ یونیورسٹی جامشورو سے منسلک ڈاکٹر جاوید اقبال نے "مکتوبات امیر مینائی "کا تحقیق مطالعہ پیش کیا۔ سندھ یونیورسٹی سے مرزا سلیم بیگ نے بھی تحقیقی مضامین لکھے۔ڈاکٹر قاضی عابد نے اردو افسانے کا اساطیر کی روشنی میں تحقیقی جائزہ لیا۔ڈاکٹر راشد حمید مقتدرہ قومی زبان حالیہ ادارہ فروغ قومی زبان میں بطور ڈی جی کام کررہے ہیں۔انھوں نے اقبال کے حوالے سے تحقیقی کام کیا ہے۔پروفیسر فتح محمد ملک، تجمل شاہ اور سید سردار احمد پیرزادہ نے اُردو پنجاب میں، سندھ میں، اباسین میں، کشمیر میں، کے حوالے سے 5 جلدیں مرتب کیں۔ ڈاکٹر محمد آصف اعوان نے اقبال کے خطبات کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ڈاکٹر ارشد اویسی نے مختلف قانون ساز اسمبلیوں میں اردو کے حوالے سے تحقیق کا ڈول ڈالا۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے پاکستانی ادب کے حوالے سے کتاب شائع کی۔ خواتین محققین میں ڈاکٹر نجیبہ عارف، ڈاکٹر تنظیم الفردوس،ڈاکٹر سعدیہ طاہر،ڈاکٹر فردوس انور قاضی،ڈاکٹر صوفیہ خشک،ڈاکٹر روبینہ رفیق، ڈاکٹر عظمیٰ فرمان،ڈاکٹر فہمیدہ تبسم،ڈاکٹر زینت افشاں،ڈاکٹر عظمیٰ سلیم،ڈاکٹر طاہرہ اقبال،ڈاکٹر فرحت جبین ورک ،ڈاکٹر ناہید قمر اور ڈاکٹر صدف نقوی، جیسی خواتین نے بھی تحقیق کے خارزار میں قدم رکھا۔ بیرون ملک اردو محققین کے حوالے سے بھی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ جن میں ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر خلیل طوقار، ڈاکٹر جلال سویدن، ڈاکٹر آرزو، ڈاکٹر سلیم ملک، ڈاکٹر محمد کیومرثی، ڈاکٹر علی بیات کے علاوہ بے شمار نام شامل ہیں۔

پاکستان کی قومی زبان اُردو ہے۔اُردو زبان میں تعلیم و تدریس کے ذریعے سے معاشرے میں نہ صرف یکجہتی کو فروغ دیا جاسکتا ہے بلکہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں بھی اپنی جگہ بنائی جاسکتی ہے۔اُردو زبان کی ترقی کے لیے انفرادی و اجتماعی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔اُردو کے فروغ میں شخصیات کے ساتھ ساتھ مختلف ایسے ادارے بھی قائم ہیں جو اپنی قومی زبان کے فروغ میں ہمہ وقت مصروف عمل ہیں۔ان اداروں میں پاکستانی جامعات بھی شامل ہیں جنھوں نے اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا بھرپور کردار ادا

کیا۔ پاکستان میں اس وقت جامعات کی تعداد اب دو سو پچاس کے قریب ہے، ان میں سرکاری اور نجی جامعات دونوں شامل ہیں۔

پاکستان کی کئی جامعات میں اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے شعبے قائم کیے گئے ہیں۔ ان شعبوں میں اساتذہ، طلبا و محققین اُردو کے فروغ میں مصروف عمل ہیں۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے پروگراموں میں طلبا مختلف موضوعات پر تحقیق کر رہے ہیں جو اُردو کے ذخیرے میں اضافے کا باعث ہے۔ ساقط المعیار کاموں کے انبار میں معیادی تحقیقی کاموں کی تعداد کم ضرور ہوتی ہے لیکن قابل قدر ضرور ہے۔ پاکستانی جامعات میں تحقیق کی راہ میں بڑی مشکلات ہیں ۔ مسائل کی زیادتی اور وسائل کی کمی ہے ان بے شمار کوتاہیوں، نارسائیوں اور خامیوں کے باوجود جامعات نے ادبی تحقیق کی روایت کو پروان چڑھایا ۔ اگر جامعات کی تحقیقات میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ جامعات نے کچھ کام نہیں کیا۔ آج جامعات میں اردو زبان و ادب کے مختلف اور متنوع موضوعات پر جس رفتار سے کام ہو رہا ہے اس سے ایک بہتر روشن مستقبل کے امکانات موجود ہیں۔

نتائج

درج بالا تحقیقی مقالے سے درج ذیل نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

- پاکستانی جامعات میں افکار، طریق کار اور اقسام کے لحاظ سے خاطر خواہ کام ہوا ہے۔ معاصر فکریات مثلاً مذہب، مابعد الطبیعات، اخلاقیات کے ذیل میں قابل قدر تحقیقی مقالے سامنے آئے ہیں۔ اسی طرح معاصر تنقیدی نظریات کے ذیل میں بھی مابعد جدیدیت، مابعد نو آبادیات اور تانیثیت کے پس منظر میں بھی عمدہ تحقیقی و تنقیدی کاوشیں کی گئی ہیں۔
- جامعات کے محققین مختلف موضوعات پر مقالے مربوط و مبسوط کر رہے ہیں۔ جس سے یقینی طور پر جامعات میں اُردو تحقیق کی روایت مزید مضبوط ہو رہی ہے۔
- اعلیٰ تعلیمی کمیشن ایم فل اور پی ایچ ڈی کے محققین کو اہلیت کی بنیاد پر تعلیمی وظائف (اسکالرشپ) مہیا کر رہا ہے جس سے کتابوں کی خریداری، پروجیکٹس ، آرٹیکل، جامعات کی فیس وغیرہ جیسے بنیادی مسائل کم ہو جاتے ہیں اور اسکالر یکسوئی کے ساتھ اپنی تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھ سکتا ہے ۔

- مختلف جامعات اردو تحقیق کی روایت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔وہ جامعات جن میں ایم۔فل اور پی ایچ ڈی اُردو کے پروگرام ہیں،وہاں بطور خاص تحقیقی کارجحان نمایاں ہے۔
- جامعات کے اساتذہ اور محققین کی تحقیقی و تنقیدی کاوشیں مختلف تحقیقی و تنقیدی رسائل کی زینت بھی بن رہی ہیں۔جو اُردو ادب کے فروغ کے لیے خوش آئند ہے۔
- مقالہ نگاروں کا اندازِ تحریر یعنی اسلوب بھی لائق تحسین ہے۔اکثر مقالہ نگاروں نے تحقیق کے عمدہ معیار کو سامنے رکھا اور اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔
- مقالہ نگار مواد کی فراہمی کے لیے نہ صرف کتابوں،لائبریریوں اور رسائل جرائد سے استفادہ کر رہے ہیں بلکہ موجودہ دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے انٹرنیٹ،سوشل میڈیا اور مختلف ویب سائٹس سے بھی مدد لے رہے ہیں۔

سفارشات

گزشتہ ابواب میں کی گئی تحقیق کی روشنی میں "پاکستانی جامعات میں اُردو تحقیق کے رجحانات 2010ء کے بعد" کے حوالے سے ذیل میں چند سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔ان سفارشات کا مقصد محض اس شعبے میں پائے جانے والے خلا کو پُر کرنا ہے تاکہ آنے والے دور کے طلبا، محقق اور نئے لکھنے والے اپنی قابلیت سے اس صنف میں مزید بہتری لا سکیں۔

- مختلف جامعات کے اُردو شعبہ جات میں رابطے کا فقدان نظر آتا ہے۔ جامعات کے مابین رابطے کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔
- جامعات کے اُردو شعبہ جات میں اُن اساتذہ کو فوقیت دی جائے جو تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدوین میں بھی میں وسیع تجربہ کے حامل ہوں ۔
- اعلیٰ تعلیمی کمیشن جامعات میں تحقیق پر کروڑوں روپے خرچ کر رہا ہے۔پاکستان جغرافیائی اور آبادی کے لحاظ سے بڑا ملک ہے۔رقبے اور آبادی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ رقم ناکافی ہے مگر اُردو زبان کی ترقی،ترویج اور تحقیق کے لیے اگر مناسب طور پر استعمال میں لائی جائے تو بہتر نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

- پاکستانی جامعات کے وہ اساتذہ اور محققین جنہوں نے اُردو تحقیق کی روایت کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اُن کا الگ الگ گوشوارہ مرتب کیا جائے تا کہ اُن کی ادبی کاوشوں کو نمایاں کیا جاسکے۔
- آنے والے وقت میں اُردو زبان کے فرزندان جن مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا، جامعات کو ان کا اندازہ کرنا ہو گا اور اُس کے مطابق اپنے نصاب میں تبدیلیاں کرنی ہوں گی۔
- جامعات اور اساتذہ کو اپنے نصابِ تعلیم کو عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جس سے اُردو کے طلبا کو نئے دور کے کامیاب اور ہنر مند لوگوں میں شامل کیا سکے تا کہ وہ اپنی زبان کا آئندہ زندگی میں ماتم نہ کریں اور مظلوم کی طرح سے سکڑے سمٹے لوگوں میں رہنے کے لیے مجبور نہ ہوں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

- انصر عباس، پاکستانی اُردو شاعری میں ملی نغمہ نگاری کی روایت، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2019ء
- انوار الحق، علامہ اقبال کی اُردو نظموں کے کرداروں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جامعہ پشاور، 2017ء
- بادشاہ منیر بخاری، اُردو زبان کے غیر آریائی نظریات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2012ء
- بشریٰ شریف، خطبات اقبال کے اُردو تراجم و توضیحات کا تحقیقی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2012ء
- جویریہ انور، اُنیسویں صدی میں اُردو ناول میں متوسط طبقے کے مسائل اور کردار کا جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور،
- حامد اقبال بٹ، ترقی پسند تحریک کے انتقاد کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2011ء
- حبیب الرحمان، انیس ناگی کی تخلیقی و تنقیدی نثر کا مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2012ء
- خرم علیم، اختر حسین جعفری کی شاعری: مزاحمتی تناظر میں، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2016ء
- رابعہ عرفان، رحمان مذنب: احوال و آثار (تحقیقی و تنقیدی جائزہ)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2012ء
- راشد ارشد، اُردو غزل میں حمدیہ و نعتیہ موضوعات: منتخب شعرا کے حوالے سے، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور، 2013ء

- رضیہ نور محمد، اُردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جامعہ پنجاب، لاہور، 1967ء
- روبینہ سرور، اُردو تراجم قرآن کے اسالیب منتخب اور نمائندہ تراجم کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اُردو، جامعہ کراچی، 2014ء
- ریاض حسین، اُردو ناول میں تہذیبوں کے درمیان مکالمہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 2016ء
- زاہد حسن چغتائی، عزیز ملک: شخصیت اور علمی و ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ کراچی، کراچی، 2018ء
- زینب افشاں، اردو فکشن (ناول، افسانہ) کے سقوط ڈھاکہ پر اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، 2012ء
- ساجد صدیق نظامی، اسالیبِ اُردو نثر کے تحولات: آغاز سے وفات غالب تک، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2016ء
- سائرہ بتول، پاکستانی انشائیہ نگاروں کے اسالیب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ: 1960ء تا حال، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، نمل، اسلام آباد، 2012ء
- سفیر حیدر، پاکستانی اُردو ناول میں تصور انسان، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2013ء
- سمیرا اکبر، اردو کے فروغ میں ریڈیو کے عالمی اداروں کا کردار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، 2017ء
- شاہانہ خانم، تابش دہلوی: احوال و آثار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ کراچی، کراچی، 2018ء
- شگفتہ پروین، پاکستانی اُردو ناول میں مظلوم طبقوں کی عکاسی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2017ء
- شیبا عالم، اُردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2012ء

- شہناز اختر، جوش ملیح آبادی :ایک رجحان ساز نثر نگار ،مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی،لاہور،2011ء
- عامر اقبال، منڈی بہاؤالدین میں اردو ادب کا ارتقا: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد،2019ء
- عارف حسین، فیض احمد فیض اور محمود درویش کی شاعری میں مزاحمت، جلاوطنی اور بیگانگیت کے افکار کا تقابلی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد،2019ء
- عائشہ حمید، پاکستانی اُردو شاعرات پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں کے اثرات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، نمل، اسلام آباد،2010ء
- عبدالسعید، برطانوی ہندوستان میں اُردو کے مغربی شعرا، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی،لاہور،2016ء
- عثمان شاہ،ڈاکٹر گیان چند جین:احوال و آثار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، قرطبہ یونیورسٹی، پشاور،2011ء
- عدنان احمد، اُردو ناول پر ادبی تحریکوں کے اثرات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد،2016ء
- علامہ اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال (اُردو): امغان حجاز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،2005ء
- علی شیر، اُردو-پشتو اور پشتو-اُردو لغات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور،2021ء
- عمارہ طارق، اُردو افسانے میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جامعہ پنجاب، لاہور،2015ء
- فہد جمال، جمشید نواز نایابؔ کی علمی و ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور،۲۰۱۸ء
- فوزیہ رانی، پاکستانی اُردو افسانہ نگار خواتین کے افسانوں میں نسوانی کردار: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (1947ء تا2000)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جامعہ پنجاب،لاہور،2011ء

- فرزانہ اقبال، اُردو مضمون نویسی کے ارتقا میں خواتین کا حصہ: 1898ء تا 1930ء، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جامعہ پشاور، پشاور، 2017ء
- فوزیہ پروین، افسر صدیقی امروہی کی علمی و ادبی خدمات"، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی، 2013ء
- محمد افضل صفی، احمد فراز کی شاعری کا فنی اور اسلوبیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2016ء
- محمد ثقلین، اُردو ناول میں سیاسی مباحث، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2012ء
- محمد رمضان، بانگِ درا: طبع اول اور دو معاصر اشاعتوں کے متن کا تقابلی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، بہاولپور، 2014ء
- محمد طاہر قریشی، ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر: سقوط دلی تا سقوط ڈھاکہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جامعہ کراچی، 2013ء
- محمد نعیم، اُردو افسانے میں مغربی تہذیب کے عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2017ء
- محمد یوسف، آزاد کشمیر میں اُردو حمدیہ و نعتیہ شاعری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، 2020ء
- محمد اقبال کامران، پاکستان میں عملی تنقید کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور، 2012ء
- محمد عابد، اُردو تنقید میں جدیدیت کے مباحث: خصوصی مطالعہ (شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر شمیم حنفی)، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اُردو، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، 2017ء
- محمد کامران شہزاد، پاکستانی اُردو ناول میں مزاحمتی رجحانات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، 2019ء
- محمد یٰسین آفاقی، جدید اُردو نظم میں ہیئت کے تجربے، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2012ء

- مسلم شاہ، مرزا مظہر جان جاناں، اصغر گونڈوی اور واصف علی واصف کی غزل میں تصوف کا تحقیقی و تقابلی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جامعہ پشاور، پشاور، 2019ء
- منور مقبول عثمانی، اُردو میں نثری اَسالیب کے تنقیدی مطالعے کی روایات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد، 2014ء
- منیبہ صائمہ، تہذیبی آویزش کی روایت اور فکرِ اقبال، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
- ناصر محمود، جدید ادبی تناظر میں ناصر شہزاد کی ادبی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، 2017ء
- نائلہ عبدالکریم، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی کی علمی و ادبی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2018ء
- نسیم عباس، میرزا ادیب کی تخلیقی نثر: انتقادی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا، 2018ء
- نصرت جبین، جدید اُردو نظم میں انسان دوستی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2017ء
- وجیہہ شاہین، اختر ہوشیار پوری: احوال و آثار، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، وفاقی اُردو یونیورسٹی، اسلام آباد، 2017ء

ثانوی مآخذ:

(الف) کتابیات

- ابن کنول، تحقیق و تدوین، کتابی دنیا، دہلی، 2006ء
- احسان اللہ، ڈاکٹر، تعلیمی تحقیق اور اس کے اصول و مبادی، میاں چیمبر، لاہور 1991ء
- القرآن الکریم، تاج کمپنی لمٹڈ، لاہور، 2005ء
- آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، مبارک بک ڈپو، کراچی، 1955ء
- اے ایس بھٹی، GEM DECTIONARY، اظہر پبلشرز، لاہور، 2016ء

- ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم، صادق حسین، اقبال بک ڈپو، لاہور، 1944ء
- سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو میں اصول تحقیق: منتخب مقالات، اُردو اکیڈمی، لاہور، 2012ء
- صدیق شبلی، ڈاکٹر، اقبال یورپ میں: ایک مطالعہ، مشمولہ: افکار، کراچی، 1987ء
- عبدالحمید خان عباسی، ڈاکٹر، اصول تحقیق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2012ء
- عبدالستار، ڈاکٹر، تحقیق و تنقید، مشمولہ: ادبی ولسانی تحقیق، بمبئی یونیورسٹی، 1984ء
- عبدالستار دہلوی، ادبی لسانی تحقیق: اصول طریق کار، بمبئی یونیورسٹی، 1984ء
- عطش درانی، ڈاکٹر، اُردو اور پاکستانی زبانون میں لسانی و ادبی تحقیق، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2007ء
- عطش درانی، ڈاکٹر، جدید رسمیات تحقیق، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۵ء
- علامہ اقبال، ڈاکٹر، کلیات اقبال: بال جبریل، مکتبہ جمال، لاہور، 2005ء
- فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری انجمن ترقی اردو، کراچی، 1998ء
- فہیم عثمانی، مولانا، حفاظت و حجیت حدیث، دارالکتب، لاہور، 1979ء
- قراۃ العین حیدر، کار جہاں دراز ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2003ء
- گیان چند، جین، تحریریں، ادارہ فروغِ اُردو، لکھنؤ، 1964ء
- گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2012ء
- گیان چند، جین، ادبی اصناف، گجرات اُردو اکادمی، گجرات، 1989ء
- محمد برہان الحق، قائداعظم اور اردو زبان، کالم۔ مطبوعہ: پریس فار پیس فاؤنڈیشن، لندن، 31 دسمبر: 2022ء
- مسلم بن حجاج، امام، صحیح مسلم، خالد احسان پبلشرز، لاہور، 2012ء
- نجم الحسن، ڈاکٹر، تحقیق کے روایتی اسلوب، مرتبہ: اعجاز الٰہی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1986ء
- وزیر آغا، ڈاکٹر، انشائیہ کے خدوخال، مکتبہ جامعہ، دہلی، 2012ء

(ب) رسائل و جرائد

- انقلاب: روزنامہ، بمبئی، 24 جنوری، 1947
- انقلاب: روزنامہ، بمبئی، 17 ستمبر، 1923

- خلافت:روزنامہ،بمبئی،11نومبر:1934ء
- زمیندار:روزنامہ،لاہور،15مارچ،1922
- زمیندار:روزنامہ،لاہور،5اگست،1920ء
- عصر جدید،روزنامہ،کلکتہ،23نومبر،1941ء
- فنون،شمارہ16،لاہور،1969ء
- مخزن،ماہنامہ،لاہور،اپریل،1922ء،
- مشرق،روزنامہ:پشاور،16اپریل،2009ء
- نقوش،لاہور،1955ء

(ج)لغات:

- تصدق حسین،مولوی،سید،مرتب،لغات کشوری،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،1986ء
- جمیل جالبی،ڈاکٹر،مرتب،قومی انگریزی اردو لغت،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،1995ء

(د)ویب گاہیں:

- www.youtube.com
- www.rekhta.org